کہاں رکے ہیں محبت کے قافلے

نگہت عبداللہ

کہاں رُکے ہیں مُحبّت کے قافلے

نگہت عبداللہ

جہانگیر بُکس
• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدرآباد • کراچی

فہرست

کہاں رُکے ہیں محبت کے قافلے 1
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو 67
اِس جہدِ مُسلسل میں 133
چراغِ دل روشن ہے 189

کہاں رُکے ہیں محبّت کے قافلے

وہ تیار ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی کنگھی کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔ اور یہ مرحلہ اُسے انتہائی دشوار لگنے کے ساتھ کوفت میں بھی مبتلا کرتا تھا کیونکہ اتنے لمبے گھنے بال سلجھاتے سلجھاتے اُس کے ہاتھ اور بازو درد کرنے لگتے تھے۔ اور جب وہ جھنجھلا کر بالوں کو جھٹکتی اماں کو جانے کیسے خبر ہو جاتی۔ فوراً پیچھے سے آ کر ٹوکتیں۔

''اس بے دردی سے بال مت کھینچو۔ ٹوٹ جائیں گے۔''

''یہ تو نہیں البتہ کسی دن میرے بازو ضرور ٹوٹ جائیں گے۔''

اس وقت بھی وہ جل کر بولی اور کنگھی پھینک کر بالوں کی چوٹی باندھ رہی تھی کہ بڑی آپا بچوں سمیت آ گئیں۔ اماں فوراً اُن کی طرف لپکیں اور اُس نے بھی بھاگ کر اُن کی گود سے ننھے عرفان کو جھپٹ لیا اور اُسے گدگداتے ہوئے اُس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کرنے لگی۔

''کہیں جا رہی ہو؟'' بڑی آپا اُسے تیار دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''ابھی آ جاؤں گی۔ آپ تو رہیں گی نا؟''

''شام تک ہوں۔''

''بس شام تک۔ کبھی تو رہنے کی بات بھی کیا کریں۔''

''ہاں۔ میری ساس کو جانتی نہیں ہو۔ ابھی بھی آ رہی تھی تو بار بار کہے جا رہی تھیں کہ جلدی آنا۔''

''بے چاری کے حلق سے نوالہ نہیں اُترتا نا آپ کے بغیر۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ تو بڑی آپا بُرا سا منہ بنا کر جانے کیا بڑبڑانے لگیں۔

''غلطی آپ کی ہے۔ بڑی آپا خواہ مخواہ اتنا ڈرتی ہیں۔ کیا دولہا بھائی بھی آپ کی طرف داری میں کچھ نہیں بولتے۔''

"وہ بے چارے کیا بولیں گے۔ وہ تو خود اپنی اماں سے اتنا ڈرتے ہیں۔"

"ہاں چھوٹی آپا کو بھی یہی شکایت ہے کہ شاہد بھائی انہیں ہی صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں اپنی اماں کو نہیں سمجھاتے۔"

"ارے ہاں۔ آج تو چھوٹی نے بھی آنے کو کہا تھا۔" اماں کو اچانک یاد آیا۔ پھر اُس سے کہنے لگیں۔ "تمہیں جانا ہے تو جاؤ پھر جلدی آنے کی کرو۔ اتنے دنوں بعد بہنیں آتی ہیں۔"

"جا کہاں رہی ہو؟" بڑی آپا پوچھنے لگیں۔

"ایک جگہ انٹرویو ہے۔"

"ابھی تک تمہیں جاب نہیں ملی؟"

"کہاں آپا۔ سارے سفارشی آئے ہوتے ہیں۔ انہی میں سے کسی کو رکھ لیتے ہیں۔" وہ جل کر بولی اور عرفان کو اماں کی گود میں دے کر اپنا بیگ اٹھا لائی۔

"اچھا آپا! میں جلدی آ جاؤں گی اور لائیے اماں کرایہ دیجیے۔"

"ایک تو تمہارے کرایوں نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔" اماں دوپٹے کے پلو سے پیسے کھولتے ہوئے بولیں۔ "کرائے کے پیسے اپنے باپ سے لیا کرو۔"

"ابا سارے پیسے آپ ہی کو دے دیتے ہیں۔"

"ہاں، بہت دیتے ہیں نا۔"

"بہت یا کم۔ وہ جتنا کماتے ہیں، آپ کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔" اُسے ابا سے بڑی ہمدردی تھی اور یہ بات اماں بھی جانتی تھیں اس لیے زیادہ کچھ نہیں بولیں۔ اور وہ بھی اُن کے ہاتھ سے پیسے لے کر باہر نکل آئی۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر اُس نے بیگ سے اخبار کا تراشا نکال کر اُس پر لکھا ہوا ایڈریس دیکھ کر پہلے یقین کیا کہ وہ ٹھیک جگہ پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد آفس میں داخل ہوئی تو وہاں پہلے سے کافی لڑکیاں اور لڑکے موجود تھے۔ اور پہلے ہی مرحلے پر اُسے مایوسی نے آن گھیرا۔ اُسے اپنی صلاحیتوں پر شبہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ یقین سے کہتی تھی کہ کوئی میری صلاحیت کو آزما کر تو دیکھے کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ اور یہ بات وہ انٹرویو لینے والے لوگوں کے سامنے بھی کہہ جاتی تھی۔ لیکن اب تک کسی نے اُس کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانا تو دُور کی بات آزمانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وجہ وہی سفارش جو اُس کے پاس نہیں تھی۔ اب تک وہ کوئی دس جگہ انٹرویو دے چکی تھی اور اُس کا کہنا تھا کہ وہ انٹرویو دینے کا اچھا خاصا تجربہ حاصل کر چکی ہے۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟" اُس کے برابر بیٹھی لڑکی نے اُس سے پوچھا۔

"سمن آباد سے۔"

"اس سے پہلے کہیں جاب کی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر یہاں آپ کو جاب نہیں ملے گی۔"

لڑکی کے یقین سے کہنے پر وہ بُری طرح تپ گئی۔ پھر بھی لہجے پر قابو رکھ کر پوچھا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ یہاں دو سال کا تجربہ مانگا ہے۔ کیا آپ نے اشتہار غور سے نہیں پڑھا تھا؟"

"پڑھا ہے اور اگر مجھے دو سال پہلے جاب مل گئی ہوتی تو اتنا تجربہ ہو چکا ہوتا۔"

پھر اُس سے پوچھنے لگی۔ "آپ نے پہلے کہاں جاب کی ہے؟"

"کہیں نہیں۔" لڑکی کے اطمینان سے کہنے پر وہ اُچھل پڑی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں پہلی بار جاب کے لیے آئی ہوں۔"

"کمال ہے ابھی تو آپ مجھے یہ بتا رہی تھیں کہ یہاں دو سال کا تجربہ مانگا ہے اور یہ کہ مجھے جاب نہیں مل سکتی تو آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"مجھے تو سمجھیں جاب مل گئی۔"

"کیسے؟"

"میرے انکل فون کر دیں گے۔"

لڑکی کے اترا کر کہنے پر اُس نے سرتاپا اُسے دیکھا۔ پھر بیگ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"ظاہر ہے گھر۔"

"اور یہ انٹرویو؟"

"محض وقت کا زیاں۔"

اُس نے کہا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے دروازے سے نکل رہی تھی کہ دوسری طرف سے آتے شخص سے بُری طرح ٹکرا گئی۔ مایوس تو تھی ہی غصہ بھی آ گیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ معذرت کر گیا حالانکہ غلطی اُس کی نہیں تھی۔

''آئی ایم سوری!''

وہ اُسے کوئی سخت بات کہنے سے باز رہی۔ لیکن پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''آپ بھی یہاں انٹرویو دینے آئے ہیں؟''

اُس نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ بول پڑی۔

''بے کار ہے۔ یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے کہیں اور کوشش کر لیں۔''

''کیوں۔ یہاں کیا بُرائی ہے؟'' وہ دل چسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔ جس کا چہرہ جانے کس احساس کے تحت گلابی ہو رہا تھا۔

''یہ بُرائی کیا کم ہے کہ یہاں سفارشی لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔''

''یہ آپ سے کس نے کہا؟''

''جس کے پاس سفارش ہے اُس نے۔''

''نہیں۔ خیر ایسی بات تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے میں نے سنا ہے کہ یہاں..........''

''آپ نے جو بھی سنا ہے، غلط سنا ہے۔''

وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''خیر آپ کی مرضی۔ یقین کریں یا نہ کریں۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آپ کو جاب نہیں ملے گی۔''

''یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے انٹرویو تو دے لیں۔''

''آپ کی مرضی۔'' وہ ذرا سے کندھے اچکا کر جانے لگی کہ اُس نے روک لیا۔

''سنیں۔ آپ کا انٹرویو ہو گیا؟''

''جی نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ وقت برباد کرنے کا۔''

''میرا خیال ہے جب یہاں تک آ ہی گئی ہیں تو ایسے واپس مت جائیں۔ ہو سکتا ہے.....''

''سوری۔ میں نہ تو خوش فہم ہوں اور نہ مجھے اپنی قسمت کے اچھا ہونے کا یقین ہے۔''

''مایوسی بھی اچھی بات نہیں ہے۔''

''مایوسی کی بات نہیں ہے مسٹر۔''

''حماد حسن۔'' اُس نے فوراً اپنا نام بتایا۔ تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ شاید احساس ہو گیا تھا کہ اتنی دیر سے خواہ مخواہ ایک اجنبی سے باتیں کیے جا رہی ہے۔

''آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟'' وہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

''نہیں۔'' وہ پھر جانے لگی اور اس بار وہ سامنے آ گیا۔

''دیکھیں۔ اب ایک دو لڑکیاں ہی رہ گئی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اور پھر بعد میں یہ ملال بھی نہیں ہو گا کہ آپ نے کوشش نہیں کی۔''

وہ اب محض اُس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر دوبارہ اندر آ گئی۔ جبکہ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اور جب وہ انٹرویو دے کر واپس آئی تو وہ اسی جگہ موجود تھا۔ اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

''کیسا رہا؟''

''جب رزلٹ مجھے معلوم ہے تو پھر اچھا بُرا کیا کہنا۔'' پھر اُس سے پوچھنے لگی۔

''آپ انٹرویو دینے کے لیے نہیں گئے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مجھے اپنی قسمت پر یقین ہے۔ جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔'' وہ اتنے یقین سے بولا کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔

''او کے پھر ملاقات ہو گی۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر دل کشی سے مسکرایا۔ تو وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔

''عجیب آدمی ہے۔''

گھر آنے تک وہ کوئی دس بار اُس کے بارے میں یہ بات سوچ چکی تھی۔ اور گھر میں داخل ہوئی تو چھوٹی آپا بھی موجود تھیں۔ وہ بیگ پھینک کر اُن سے لپٹ گئی۔ بڑی آپا کی نسبت چھوٹی آپا سے اُس کی زیادہ دوستی تھی۔ اُن کی شادی کو بھی ابھی سال بھر ہی ہوا تھا۔ اس سے پہلے اُس کا سارا وقت انہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ اور اُن کے جانے کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔

''کیسا رہا انٹرویو؟'' وہ بیٹھی تو چھوٹی آپا اُس سے پوچھنے لگیں۔

''چھوڑیں چھوٹی آپا! جب جاب ملے تب پوچھیے گا کہ کیسی ہے میری جاب۔''

''آخر تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیوں ضرورت نہیں ہے۔ ساری زندگی بے چارے ابا اکیلے کماتے رہے۔ کوئی بیٹا بھی نہیں ہے جو جمع پونجی تھی وہ پہلے بڑی آپا اور پھر آپ کی شادی پر خرچ ہو گئی۔ اب دن رات میری فکر میں گھلتے رہتے ہیں جبکہ مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''بس میں اماں ابا کے ساتھ رہوں گی۔''

"اس کا مطلب ہے گھر داماد ڈھونڈنا پڑے گا۔" بڑی آپا نے مذاق میں چھیڑا۔ تو وہ بُرا مان کر بولی۔

"جی نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں بڑی آپا آپ۔" چھوٹی آپا اُن کی تائید کرتے ہوئے اماں سے بولیں۔

"گھر داماد نہ بھی ہو تب بھی اماں اب اس بات کا خیال رکھیے گا کہ اس کے ساتھ ساس نندوں کا بکھیڑا نہ ہو۔ جیسے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے ساس نندوں نے۔"

"ہاں۔ تم دونوں کی مرتبہ تو میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ جب رشتہ مانگنے آئی تھیں تو کتنی میٹھی زبان بولتی تھیں۔"

"غلطی آپ دنوں کی بھی ہے آپا جو شروع ہی میں دب گئیں۔ میں تو کہتی ہوں اب بھی ایک کی چار سنا دیں تو دماغ ٹھکانے آ جائیں گے۔"

"توبہ کرو۔ وہ تو پورے محلے کو اکٹھا کر لیں گی۔"

"کر لیں اکٹھا۔ اُن کا پول بھی تو کھلے گا۔" وہ بڑے آرام سے مشورے دے کر بولی۔ "اگر میرا ساس نندوں سے واسطہ پڑ گیا تو میں تو شروع دن سے انہیں اُن کے مقام پر رکھوں گی۔"

"ہائیں! ابھی تو کہہ رہی تھی شادی نہیں کروں گی۔"

"نہیں کروں گی لیکن اگر ہو گئی تب۔"

"اچھا بس، میں نے چاول بھگو دیئے ہیں جا کر چڑھا دو۔" اماں کو اچانک کھانے کا خیال آیا تو ٹوک کر بولیں۔

"خالی چاول۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اور سب میں نے پکا دیا ہے۔"

"پھر تو دسترخوان بچھا دیجیے۔ چاول پکنے میں دیر نہیں لگے گی۔" وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے یوں بولی جیسے کھانا نکالنے جا رہی ہو۔

وہ اس وقت پھر اخبار سامنے پھیلائے "ضرورت ہے" کے اشتہار دیکھ رہی تھی کہ اماں اُس کے سامنے ایک لفافہ پھینک کر کہنے لگیں۔

"یہ ابھی ڈاکیا ڈال گیا ہے۔ دیکھو کس کا خط ہے؟"

"ہمیں خط لکھنے والا کون پیدا ہو گیا۔" وہ لفافہ اُٹھا کر اُس پر ایڈریس دیکھنے لگی۔

"ہمارا ہی ہے۔" اپنا ایڈریس دیکھ کر جلدی سے لفافہ چاک کیا اور تہ شدہ کاغذ کھول کر پڑھنے لگی۔

"کس کا ہے؟" اماں منتظر کھڑی تھیں۔

"ارے اماں! یہ تو میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"کیا ہے؟" اماں کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"مجھے نوکری مل گئی۔" اُس نے آسان زبان میں سمجھایا۔ "کل سے جانا ہے اور عجیب بات ہے اماں جہاں سے میں بالکل مایوس ہو کر آئی تھی وہیں ملی ہے۔"

"چلو کہیں ملی تو۔"

"ہاں!" اُس نے اطمینان بھری گہری سانس لی تو اُسے یاد آیا کہ کس طرح وہ بغیر انٹرویو دیئے واپس آ رہی تھی کہ دروازے پر وہ جانے کون تھا جس نے اُسے دوبارہ اندر بھیجا تھا۔

"تمہارا شکریہ اجنبی۔" بے خیالی میں وہ اُونچی آواز میں کہہ گئی۔ لیکن پھر فوراً اماں کی طرف دیکھا۔ اچھا ہوا وہ متوجہ نہیں تھیں ورنہ ضرور پوچھتیں کہ یہ اجنبی کون ہے۔

اگلے دن وہ مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی آفس پہنچ گئی لیکن یہاں آ کر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ راہ داری میں قدرے پریشان سی کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھ کر وہ فوراً اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میرا نام عائشہ ہے۔" اُس نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ کہنے لگے۔

"ہاں عائشہ! آپ کو ہمارا لیٹر مل گیا۔"

"جی!"

"آیئے۔" وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھے تو وہ اُن کے ساتھ چل پڑی۔ اندر داخل ہو کر اُس نے دیکھا وہاں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔

"یہ آپ کی ٹیبل ہے۔" اُس کے ساتھ آنے والے نے دروازے سے بائیں طرف رکھی ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں تشریف رکھیں اور یہ سامنے شہزاد صاحب بیٹھے ہیں۔"

"السلام علیکم۔" شہزاد صاحب نے اُچٹتی نظر ڈال کر سلام کیا۔ خاصا لیا دیا انداز تھا۔ وہ صرف سر ہلا سکی۔

"اور یہاں ثاقب صاحب بیٹھتے ہیں۔" وہ تیسری ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''وہ بس آنے ہی والے ہوں گے اور وہی آپ کو آپ کا کام بھی سمجھا دیں گے۔ او کے۔''

''جی!'' وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کون ہیں۔ لیکن پھر ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور اُن کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد جو شخص اندر آیا اُسے دیکھ کر ابھی وہ قیاس ہی کر رہی تھی کہ وہ خود ہی کہنے لگا۔

''خاکسار کو ثاقب کہتے ہیں۔'' شہزاد کے برعکس وہ خاصا زندہ دل اور شوخ نظر آ رہا تھا۔

''اور آپ غالباً مس عائشہ ہیں۔''

''جی۔''

''ویری گڈ۔ اینڈ ویل کم۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو ایک جملے کا اضافہ کروں۔''

''جی؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ تو وہ ذرا سا سر کھجا کر بولا۔

''وہ کیا ہے کہ اب اپنے دفتر کا روشن ماحول دیکھ کر کام کرنے کو دل چاہے گا۔'' وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کو بمشکل روک سکی۔

''یہاں ہنسنے پر کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ ہلکا پھلکا قہقہہ بھی لگایا جاسکتا ہے ایسے۔''

اُس نے باقاعدہ قہقہہ لگانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ چوکیدار اندر جھانک کر اُس سے بولا۔

''ثاقب صاحب! آپ کو سر بلا رہے ہیں۔''

''مارے گئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ فوراً چلا گیا تو اُس نے یونہی شہزاد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُسی کی طرف متوجہ تھا لیکن نظروں میں خشونت اور کچھ ناگواری سی تھی جس سے وہ سنبھل گئی اور اُس پر سے نظریں ہٹا کر کمپیوٹر کا جائزہ لینے لگی۔ ابھی اسکرین کا بٹن دبایا ہی تھا کہ ثاقب آگیا اور ہاتھ میں پکڑی فائل اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''لیجیے خاتون! آپ کا کام شروع۔ اور اگر کہیں مشکل ہو تو میں یہیں سامنے بیٹھا ہوں۔''

''شکریہ۔''

وہ فائل کھول کر دیکھنے لگی اور پھر ڈیسک سیٹ کرنے تک ہی وہ قدرے نروس تھی۔ اس کے بعد جب کی بورڈ پر اُس کی انگلیوں کی حرکت شروع ہوئی تو آپ ہی آپ اُس کا اعتماد بحال ہوگیا۔ ویسے بھی اُسے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ بہرحال پہلے دن کے اختتام پر وہ خاصی مطمئن تھی اور خوش بھی کہ اُسے اُس کی من پسند جاب مل گئی تھی۔ آفس کا ماحول بھی اُسے پسند آیا تھا۔ پانچ بجے آفس سے نکل کر اسٹاپ تک آئی تھی کہ وہ نظر آگیا جو انٹرویو والے روز ملا تھا۔ اور اُس نے اپنا نام

بھی بتایا تھا لیکن اس وقت اُسے بالکل یاد نہیں آیا۔

''ہیلو'' وہ قریب آکر بولا۔ ''کانگریچولیشن فار جاب۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ظاہر ہے۔ یہ آفس سے نکلنے کا ٹائم ہے۔''

''ہاں۔''

''کہاں؟ اُسی فرم میں جہاں اُس روز ملاقات ہوئی تھی۔''

''جی۔ اور اس کے لیے مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔''

''میرا کیوں؟'' وہ چونکا۔

''اس لیے کہ میں تو واپس جا رہی تھی۔ آپ نے دوبارہ مجھے بھیجا تھا۔''

اُس نے یاد دلایا تو وہ ذرا سا کندھے اچکا کر بولا۔

''خیر، یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے آپ میرا شکریہ ادا کریں۔ یہ بتائیے آفس کیسا ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ کام کرنے والے لوگ۔''

''سب بہت اچھے ہیں۔''

''اور ایم ڈی۔''

''اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اور اچھا ہی ہوا جو پہلے دن اُن سے سامنا نہیں ہوا۔''

''کیوں؟''

''ثاقب صاحب بتا رہے تھے وہ بہت خوفناک آدمی ہیں اور سخت گیر بھی۔'' پھر اپنے روٹ کی بس آتے دیکھ کر معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ''سوری میری بس آ رہی ہے۔''

''او کے۔ کل ملاقات ہوگی۔''

''کل۔ کیا آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟''

''نہیں۔ لیکن روز یہاں آنا ہوتا ہے۔''

وہ پوچھنا چاہتی تھی کیوں۔ لیکن بس قریب آ چکی تھی۔ اس لیے جلدی سے اُس میں سوار ہوگئی اور جانے کیوں گھر آنے تک اُسے یہ خیال رہا کہ وہ کچھ نہ کچھ اُس کے پاس چھوڑ آئی ہے۔

گھر آئی تو چھوٹی آپا کے میاں شاہد بھائی موجود تھے اور اماں اُن کے ساتھ جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں شاہد کے ساتھ جا رہی ہوں۔ تمہارے ابا آئیں تو انہیں بتا دینا۔''

''کیا۔ کیا بتاؤں انہیں؟''

''یہی کہ چھوٹی کو لے کر ہسپتال جانا ہے۔'' اماں جلدی جلدی برقعہ اوڑھتے ہوئے بولیں۔ تو وہ کہے بغیر رہ نہیں سکی۔

''آپ کیوں جا رہی ہیں۔ چھوٹی آپا کی ساس بھی تو ہیں۔''

''آہستہ بول۔''

''کیوں آہستہ بولوں۔ سارا کام کرواتی ہیں چھوٹی آپا سے۔ اب اُن کے لیے اتنا نہیں کر سکتیں۔''

''ایسے وقت میں اپنی ماں ہی کام آتی ہے۔'' اماں کہتے ہوئے چلی گئیں اور وہ اُن کے پیچھے دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

جب ابا آئے تو اُن سے بھی شکایتاً بولی کہ اماں کو نہیں جانا چاہیے تھا۔ تب ابا اُسے سمجھانے لگے۔

''بیٹا! تم ناحق غصہ کر رہی ہو۔ یہ تو نہیں ہے کہ چھوٹی کی ساس کو اُس کا خیال نہیں ہے۔ لیکن وہ جانتی ہے کہ اپنی ماں زیادہ بہتر دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ خیر یہ بتاؤ، تم مجھے کھانا دے رہی ہو، یا نہیں؟''

''بالکل دے رہی ہوں۔ بلکہ ابھی میں نے بھی نہیں کھایا۔''

''ارے ہاں، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج تم آفس گئی تھیں۔''

''ہاں ابا! بڑا مزا آیا۔ سارا دن مزے میں گزرا۔ ذرا بوریت نہیں ہوئی۔ ٹھہریے، پہلے میں کھانا لے آؤں۔''

وہ جلدی سے کھانا نکال کر لائی اور پھر کھانے کے دوران ابا کو دن بھر کا احوال سناتی رہی۔ اور ابا اُس کی جاب کے حق میں تو نہیں تھے لیکن اُسے خوش دیکھ کر خوش ہو گئے۔

کھانے کے بعد وہ برتن دھونے میں لگ گئی۔ پھر کچن کی صفائی وغیرہ کر کے اندر آئی تو ابا عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اُس نے اُن کا بستر ٹھیک کر دیا اور پھر اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ شاہد بھائی آ گئے۔ وہ وہیں رُک کر انہیں دیکھنے لگی۔ گو کہ اُن کا چہرہ دمکتا ہوا تھا پھر بھی وہ کچھ سمجھنے سے قاصر رہی۔

''بھانجا مبارک ہو۔'' وہ قریب آ کر بولے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چھوٹی آپا کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ اور ابا کہاں ہیں؟''

''نماز پڑھ رہے ہیں۔''

''اچھا تم انہیں بتا دینا۔ مجھے ابھی گھر بھی جانا ہے۔''

''اور مٹھائی کہاں ہے؟''

''صبح لاؤں گا۔ البتہ اس وقت تمہارے لیے یہ میٹھا پان لایا ہوں۔''

انہوں نے جیب سے پان نکال کر زبردستی اُس کی ہتھیلی پر رکھا اور خاصی عجلت میں چلے گئے۔ تو وہ ہنستے ہوئے اندر آئی۔ ابا نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے۔ اُس نے اُن کے فارغ ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ کھڑے کھڑے انہیں خوش خبری سنائی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔

صبح اماں کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اُسے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ناشتا بنانا اور آفس کے لیے تیاری کرنا۔ ویسے بھی آج دوسرا دن تھا اور وہ لیٹ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جلدی جلدی ناشتا بنا کر ابا کو دیا اور پھر خود تیار ہونے لگی۔ اُس نے سوچا وہ بعد میں ناشتا کرے گی لیکن تیار ہونے کے بعد اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ ابا نکلنے لگے تو وہ بھی بیگ اُٹھا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔ پھر بھی مقررہ وقت سے کچھ دیر ہو ہی گئی اور پہلے مرحلے پر سامنا حماد حسن سے ہوا۔ اُسے حیرت ہوئی لیکن اظہار کا وقت نہیں تھا۔ بس قریب سے گزرتے ہوئے بولی۔

''آپ یہاں؟''

''کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟'' وہ اُس کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''یہ تو میں نہیں جانتی۔ کیا جاب کے سلسلے میں آئے ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔''

''او کے۔ وش یو بیسٹ آف لک۔''

''تھینک یو۔ کیا آپ میری سفارش کر سکتی ہیں؟''

''میں!'' اُس کے قدم رُک گئے۔ ''آئی ایم سوری۔ مجھے تو خود آج دوسرا دن ہے۔ میں کیسے سفارش کر سکتی ہوں۔''

''ارے، آپ تو پریشان ہو گئیں۔'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

''نہیں۔ بلکہ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔''

''دعا تو کر سکتی ہیں۔''

''وہ میں ضرور کروں گی۔'' وہ جلدی سے کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

''تشریف لے آئیں آپ!'' ثاقب اُسے دیکھتے ہی بولا۔ ''یعنی ابھی تو آج دوسرا دن ہے اور پورے دس منٹ لیٹ۔''

"وہ بس۔" اُس کی سمجھ میں نہیں آیا وضاحت کرے، یا نہ کرے۔

"جی۔ میں تو مان لوں گا کہ بس نہیں ملی ہو گی لیکن باس اس قسم کے بہانے نہیں سنتے۔"

"باس آ گئے کیا؟" اُس نے کچھ سہم کر پوچھا۔

"جی نہ صرف آ چکے ہیں بلکہ دو بار آپ کا پوچھ بھی چکے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"وہی جو منظور خدا ہو گا۔" وہ بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولا۔ "جا کر اپنی شکل دکھا آئیں انہیں۔ میرا مطلب ہے، یہ انہی کا حکم ہے کہ آپ آتے ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

"غصے میں تھے؟"

"وہ غصے میں نہ بھی ہوں تب بھی غصے میں لگتے ہیں۔ اصل میں اُن کی شکل ہی ایسی ہے۔"

ثاقب اُس کے اوسان خطا کیے دے رہا تھا۔ تب شہزاد پہلی بار اُسے مخاطب کر کے بولا۔

"بی بی! آپ کس کی باتوں میں آ رہی ہیں۔ اطمینان سے جائیے کچھ نہیں ہو گا۔"

اُس نے حیران ہو کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے ثاقب کی باتوں سے اُکتا کر بولا ہو۔ اس لیے اُس کا ڈر کم نہیں ہوا لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے باس کے کمرے تک آئی۔ تو پہلے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر خود کو حوصلہ دیا۔ اس کے بعد اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رُک گئی۔ باس کی کرسی پر حماد حسن تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔

"آئیے پلیز۔" اُس نے مسکرا کر اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اُس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"شاید مجھے یہاں دیکھ کر آپ کو مایوسی ہوئی ہے؟" وہ اُس کی طرف سے کسی قسم کا اظہار نہ ہونے پر بولا۔

"نو سر!" وہ اسی قدر کہہ سکی۔

"آپ کا انداز تو یہی بتا رہا ہے۔ ورنہ میرا خیال تھا آپ مجھے دیکھ کر خوش نہ بھی ہوئیں تب بھی حیران تو ضرور ہوں گی۔"

"حیرت مجھے ہو رہی ہے لیکن اپنے آپ پر۔"

"اپنے آپ پر کیوں؟"

"بس۔"

"چلیے۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات ہو گی۔ یہ بتائیے جاب سے مطمئن ہیں؟" اُس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

"کم آن عائشہ! آپ کیوں اتنا محسوس کر رہی ہیں۔ میں نے یونہی آپ کو اپائنٹ نہیں کیا۔ مجھے آپ کی ضرورت تھی۔ میرا مطلب ہے آپ کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ میں کام کرنے کی لگن ہے اور میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔"

وہ خاموش رہی۔

"ناؤ یو مے گو۔" وہ ایک دم لہجہ بدل گیا اور وہ بھی فوراً اُٹھ کر چلی آئی۔

اُسے واقعی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ گزشتہ دو تین ملاقاتوں میں اُس سے جو جو باتیں ہوئی تھیں انہیں سوچ کر وہ آپ ہی آپ خجل ہوئی جا رہی تھی۔

بھلا کیا ضرورت تھی ایک اجنبی سے اتنی باتیں کرنے کی۔" اُس نے سوچنا چاہا۔ لیکن وہ اجنبی کب تھا۔ ہزاروں لاکھوں میں کوئی ایک ہی تو ہوتا ہے جو پہلی نظر میں ہی اجنبیت کا احساس مٹا ڈالتا ہے اور اُس نے تو ایسا کوئی احساس ہونے بھی نہیں دیا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اُس روز کے بعد سے حماد حسن نے دوبارہ اُس سے اس انداز سے بات نہیں کی کہ جیسے پہلے سے جانتا ہو۔ بلکہ کام سے ہٹ کر کوئی دوسری بات کی ہی نہیں۔ وہ غلطی کرتی تو سختی سے ٹوکتا اور بہتر کارکردگی پر سراہتا بھی ضرور تھا۔ لیکن اُس کا انداز بالکل عام سا ہوتا تھا جیسے اور لوگوں کے ساتھ بات کرتا تھا۔ ویسے ہی۔ جس سے وہ بجائے مطمئن ہونے کے اندر ہی اندر جھنجھلانے لگی۔ شاید اُس کا قصداً اجنبی بن جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اس وقت ثاقب کی کسی بات پر اُس کی ہنسی بے ساختہ تھی کہ اچانک حماد حسن آ گیا۔ گو کہ وہ فوراً رُخ موڑ گئی لیکن وہ دیکھ چکا تھا۔ اور اس وقت تو کچھ نہیں بولا۔ بس شہزاد کو کوئی کام سونپ کر چلا گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی اُسے اپنے کمرے میں بلوا لیا اور اپنے سامنے بٹھا کر یوں بھول گیا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ وہ خاصی جزبز ہوئی اور کافی دیر بعد پوچھ ہی لیا۔

"سر! آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"ہوں۔" فائل پر سے توجہ ہٹائے بغیر اُس نے ہوں کی آواز نکالی۔ تو پھر کافی دیر تک اُسے انتظار کرنا پڑا کہ وہ مزید کچھ کہے گا لیکن وہ کچھ نہیں بولا اور نہ ہی اُس کی طرف دیکھا۔ تب وہ پوچھنے لگی۔

"میں جاؤں سر۔"

’’کیوں؟‘‘ اب وہ فائل بند کر کے اُسے دیکھنے لگا تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

’’کیوں جانا چاہتی ہیں آپ؟‘‘ اُس نے دوبارہ پُوچھا۔

’’ظاہر ہے۔ وہاں مجھے کام کرنا ہے۔‘‘

’’کیا کام؟‘‘ اُس کے لہجے کی چبھن محسوس کر کے وہ خود پر ضبط کرنے کے بعد بولی۔

’’آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’آپ کو خود سمجھ لینا چاہیے۔‘‘ اُس کے خفگی بھرے انداز پر وہ چونکی اور سوچنے لگی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

’’سوری۔ میں سمجھ نہیں سکی۔‘‘

’’تو پھر صاف سن لیں کہ میں آپ کا ہر ایک کے ساتھ فری ہونا پسند نہیں کرتا۔‘‘

’’جی۔‘‘

’’جی۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔‘‘

گویا اپنی ذات پر سے پردہ ہٹا کر بھی چاہ رہا تھا کہ وہ دیکھنے نہ پائے لیکن وہ نہ صرف دیکھ چکی تھی بلکہ جان بھی گئی تھی۔ اس لیے اُس کے کہنے کے باوجود اُٹھ کر گئی نہیں۔ اور وہ جو اپنی بات کہہ کر دراز میں کچھ تلاش کرنے لگا تھا کچھ دیر بعد اُسے دیکھ کر بولا۔

’’آپ گئیں نہیں؟‘‘

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’کیوں؟‘‘

’’پہلے آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔‘‘

’’کون سی بات کی؟‘‘

’’ایک ہی تو بات کہی ہے آپ نے اور میں اُسی کی وضاحت چاہ رہی ہوں۔‘‘

’’حالانکہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ اب وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔ تو شوخ نظریں اُس پر جما دیں۔

’’اِس طرح دیکھنا منع ہے۔‘‘ وہ نروس ہوئی اور سر جھکا کر بولی۔

’’کون منع کر سکتا ہے مجھے؟‘‘

’’میں۔‘‘

’’ہاں تم۔‘‘ وہ سرشار سا ہو کر بولا اور پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر جانے کس خیال میں گم ہو

گیا۔ اور وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بہت خاموشی سے اُٹھ کر چلی آئی۔

وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی بلکہ حقائق کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی اور انہیں تسلیم کرتی تھی۔ اس لیے اس رات جب بند پلکوں کے اندر اچانک حماد حسن کی شوخ نظروں نے جھانکا تو اُس نے گھبرا کر فوراً آنکھیں کھول دیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُس کی شخصیت متاثر کُن تھی اور وہ اُسے اچھا بھی لگتا تھا لیکن اُس کے لیے کسی نئے انداز سے سوچنا، یا اُس کی آرزو کرنا اُس کے نزدیک سراسر حماقت تھی۔ کیونکہ وہ اپنی اور اُس کی حیثیت کے فرق کو تسلیم کرتی تھی۔ اپنے گھر کا حال اُس کے سامنے تھا۔ پھر بڑی آپا اور چھوٹی آپا جس طرح بیاہی گئی تھیں اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اماں، ابا اسے بھی اُن دونوں کی طرح بیاہیں گے۔ اپنے ہی جیسے لوگوں میں۔ جبکہ حماد حسن اُس کی نظر میں بہت بڑا آدمی تھا اور اُس کے خیال میں وہ اگر اُسے پسند کر بھی لے تب بھی معاملہ صرف پسند تک ہی رہے گا اور وہ اپنی پسند کا برملا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب اپنانے کی بات آئے گی تو ظاہر ہے وہ اور اُس کے گھر والے اپنی کلاس کی لڑکی ہی دیکھیں گے۔

یہ اُس کی اپنی سوچ تھی جب ہی حماد حسن کو اپنی خلوتوں میں آنے سے سختی سے روک رہی تھی۔

لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا جس طرح اوّل روز اجنبیت کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا۔

اسی طرح اب اُس کے ہر احساس پر غالب آ کر اپنا آپ منوا رہا تھا کہ جہاں وہ پلکیں موندتی وہ آن موجود ہوتا۔ وہ فوراً پلکوں کے در کھول دیتی اور یونہی اُس کے تصور سے آنکھ مچولی کھیلتے جانے کتنی رات بیت گئی تھی۔ وہ ہارنے پر تیار نہیں تھی اور وہ ہرانے پر آمادہ۔

صبح اماں کے اُٹھانے کے باوجود وہ نہیں اُٹھ سکی کیونکہ رات کے آخری پہر میں جا کر تو آنکھ لگی تھی اور اماں نے بھی دو تین بار کوشش کرنے کے بعد اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ نو بجے اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اتنا دن چڑھ آنے پر ہڑبڑا کر اُٹھی اور گھڑی دیکھ کر اماں پاس دوڑی۔

’’اماں! مجھے آفس جانا تھا۔‘‘

’’تو میں کیا کروں۔ کتنی بار تو اُٹھایا۔ خود ہی نہیں اُٹھیں۔‘‘

’’اب کیا کروں۔ اتنی دیر ہو گئی۔‘‘ وہ بڑبڑائی اور پھر سوچا دیر سے جانے کا کوئی بہانا کر دے گی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے نکال رہی تھی کہ چھوٹی آپا آ گئیں اور انہیں دیکھ کر اُس نے آفس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی کافی دیر ہو چکی تھی اور پھر چھوٹی آپا بھی بہت دنوں کے بعد آئی تھیں اُن کی گود سے تین ماہ کے بچے کو لیتے ہوئے بولی۔

"چلو گڈو! تمہاری خاطر میں چھٹی کر لیتی ہوں۔"

"ارے واہ! خواہ مخواہ میرے بیٹے پر احسان مت جتاؤ۔" چھوٹی آپا نے فوراً ٹوکا۔

"چھٹی تم پہلے ہی کر چکی ہو۔"

"جی نہیں۔ میں ابھی جا رہی تھی۔ پوچھ لیں اماں سے۔ آپ کو دیکھ کر رُک گئی۔"

"بڑی مہربانی۔"

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" اماں کو اچانک خیال آیا تو چونک کر پوچھنے لگیں۔

"شاہد چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"اندر نہیں آیا؟"

"نہیں اماں! انہیں پہلے ہی آفس سے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اصل میں رات بھر گڈو نے جگایا۔ پتا نہیں کیا تکلیف تھی اسے مسلسل روتا رہا۔ نہ خود سویا نہ ہمیں سونے دیا۔ ساری رات کبھی میں ٹہلاتی رہی اور کبھی شاہد۔ اور میری ساس کو دیکھیں۔ بجائے اس کے کہ آ کر پوچھیں بچے کو تکلیف کیا ہے۔ اُلٹا بگڑنے لگیں کہ اس کے رونے سے اُن کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ صبح خود ہی کہنے لگیں کہ اپنی اماں کے ہاں چلی جاؤ۔ جب بچے کی طبیعت اچھی ہو جائے تب آنا۔" چھوٹی آپا نے شاہد کے نہ آنے کی وجہ پوری تفصیل سے بیان کی۔ اور اُن کی آخری بات پر وہ بول پڑی۔

"آپ کی ساس نے کہا اور آپ چلی آئیں۔"

"اور کیا کرتی؟"

"کمال ہے۔ ویسے تو آنے نہیں دیتیں۔ بچہ بیمار ہوا تو بھیج دیا اور یہ شاہد بھائی کیسے ہیں جو آپ کو لے آئے۔ اپنی اماں کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔"

"وہ سمجھائیں گے اپنی اماں کو۔ اتنا تو ڈرتے ہیں اُن سے۔ میں بولنے لگی تو مجھے بھی خاموش کرا دیا۔"

"اچھا کیا۔" اماں کہنے لگیں۔ "تمہیں کیا ضرورت ہے کچھ بولنے کی؟"

"کیوں نہیں اماں۔ اپنی حد تک تو برداشت کیا لیکن بچے کی بات برداشت نہیں ہوتی۔"

"پھر بھی صبر کرو۔ ورنہ ابھی تو میاں خیال کر لیتا ہے۔ اگر اُس کی ماں کے سامنے بولو گی تو وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"بس اماں!" وہ چڑ کر بولی۔ "آپ کا یہ سبق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنی زیادتیاں ہوتی ہیں آپ کی بیٹیوں کے ساتھ پھر بھی آپ کہتی ہیں خاموش رہو۔"

"یہی بہتر ہے۔"

"کوئی بہتر نہیں ہے۔ کم از کم میں ایسی زیادتیاں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔"

"کیوں۔ تو کیا آسمان سے اُتری ہے؟" اماں کو اُس پر غصہ آ گیا۔

"چھوڑیں اماں! جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔" چھوٹی آپا نے اماں کا دھیان ہٹایا۔

"آپ گڈو کو دیکھیں اسے تکلیف کیا ہے۔"

"ہاں لاؤ۔" اماں نے اُس کی گود سے گڈو کو لے لیا اور اُس کا پیٹ چھو کر دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ دیر تک کھڑی اماں کو باقاعدہ گڈو کا چیک اپ کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ہنس کر بولی۔

"باہر چائلڈ اسپیشلسٹ کا بورڈ لگوا دیتی ہوں۔" چھوٹی آپا کو بھی ہنسی آ گئی۔ جب کہ اماں سادگی سے پوچھنے لگیں۔

"کاہے کا بورڈ؟"

"ڈاکٹر مسز صفیہ نور الٰہی۔ چیچہ وطنی سے ایم بی بی ایس۔"

"کیا؟" اماں کی خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ جب کہ چھوٹی آپا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

"کیا بک رہی ہے۔"

"کچھ نہیں اماں! آپ گڈو کو دیکھیں اور مرض تشخیص کر کے نسخہ تجویز کر دیں۔ میں جب تک ناشتا کر لوں۔ چھوٹی آپا آپ ناشتا کریں گی۔"

"نہیں۔ البتہ چائے دے دینا۔"

"او کے۔"

وہ کچن میں آ گئی۔ ناشتے میں روٹی کے ساتھ رات کا سالن تھا۔ اُس نے پہلے وہی گرم کیا پھر چائے کا پانی رکھ کر وہیں کھڑی ہو کر کھانے لگی۔ ساتھ ساتھ مگ رکھ کر اُن میں چینی بھی ڈالی اور پانی کھولنے پر چائے بھی دم کر دی۔ جب چائے لے کر اندر آئی تو اماں چھوٹی آپا سے کہہ رہی تھیں۔

"اس کے پیٹ میں درد ہے۔ تو نے کوئی سخت چیز کھا لی ہو گی۔ کیا کھایا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ ہاں رات کے کھانے میں چنے کی دال تھی۔"

"جب ہی تو بچہ بے چارا رات بھر روتا رہا۔"

"ارے واہ اماں۔ چنے کی دال آپا نے کھائی اور پیٹ میں درد گڈو کے کیسے ہو گیا؟" وہ بولے بغیر نہیں رہ سکی۔

"دودھ جو پلاتی ہے اُسے۔"

پھر چھوٹی آپا سے کہنے لگیں۔ ''دیکھو بی بی! یا تو کھانے میں پرہیز کرو یا اس کا دودھ چھڑا دو۔''

''اب تو ساتھ ایف آر سی ایس لکھنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''غور کریں چھوٹی آپا! کیا ڈاکٹری انداز ہے اماں کا۔''

''تم باز نہیں آؤ گی۔'' چھوٹی آپا نے اُسے گھورا تو وہ ہنسی روک کر بلا ارادہ اماں سے کہنے لگی۔

''اماں! مجھے بھی رات میں نیند نہیں آتی۔''

''سر میں تیل ڈالا کرو۔'' اماں نے فوراً مشورہ دیا۔ جبکہ چھوٹی آپا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

''نیند کیوں نہیں آتی؟''

اور واقعی اماں کا مشورہ کام آ گیا جو وہ فوراً بولی۔

''سر میں خشکی کی وجہ سے۔''

پھر سارا دن اُس کا مصروفیت میں گزر گیا۔ چھوٹی آپا کیونکہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں، اس لیے اماں کے کہنے پر آرام سے سو گئیں۔ جبکہ گھر کے کاموں کے ساتھ وہ گڈو کو بھی کھلاتی رہی۔ شام میں شاہد بھائی آئے۔ پہلے گڈو کی طبیعت کے بارے میں پوچھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ دن بھر آرام سے رہا ہے تب چھوٹی آپا کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اُسے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ابھی چھوٹی آپا کو دو تین دن یہیں رہنے دیں۔ کچھ آرام ہی کر لیں گی۔''

''اور میرے آرام کا خیال کون کرے گا؟'' شاہد بھائی کو اپنی فکر تھی۔

''کیوں گھر میں آپ کی اماں اور بہنیں ہیں تو۔''

''ہاں لیکن۔'' شاہد بھائی نے ایسی نظروں سے چھوٹی آپا کو دیکھا کہ وہ بول پڑیں۔

''میں پھر کسی دن آ جاؤں گی عائشہ!''

''کب۔ جب آپ بیمار ہوں گی، یا گڈو۔ ویسے یہ خوب ہے کہ جب گھر کے دوسرے لوگ بیمار ہوں تو آپ تیمارداری کریں اور جب آپ کے ساتھ ایسی کوئی بات ہو تو یہاں بھجوا دی جائیں۔ اور ایسی صورت میں تو مجھے یہی دعا کرنی چاہیے کہ جلدی آپ کو کچھ ہو اور آپ آئیں۔''

''عجیب بہن ہو تم۔'' شاہد بھائی بُرا مان کر بولے۔

''میں نہ عجیب ہوں اور نہ کوئی عجیب بات کی ہے۔''

''خواہ مخواہ اُلٹی سیدھی باتیں کیے جا رہی ہو۔'' چھوٹی آپا اُسے ٹوک کر بولیں۔ ''جاؤ، گڈو کی

چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈال دو۔''

''اتنی جلدی کیا ہے۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔''

''نہیں بھئی، تمہاری باتوں سے پیٹ بھر چکا ہے۔'' شاہد بھائی کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تو وہ چھوٹی آپا کا خیال کر کے ہنس پڑی۔

''ارے آپ تو بُرا مان گئے شاہد بھائی! میں تو یونہی بس............''

''نہیں۔ میں نے تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مانا۔ بلکہ مجھے خود احساس ہے کہ میری اماں اور بہنیں زیادتی کر جاتی ہیں لیکن میں کیا کروں۔ قصداً خود کو ہر معاملے سے الگ رکھتا ہوں تاکہ بدمزگی بڑھنے نہ پائے۔''

''بالکل ٹھیک کرتے ہیں آپ۔ بس اب بیٹھ جائیے میں کھانا نکالنے جا رہی ہوں۔''

وہ انہیں زبردستی بٹھا کر کچن میں آئی تو سوچنے لگی کہ کبھی کبھی انسان کتنا دوغلا ہو جاتا ہے۔ خود اپنی سوچ سے اختلاف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ اور میں لاکھ اپنی بہنوں کے معاملے میں سیاست سے کام لوں، خود اپنے معاملے میں ہمیشہ فیئر رہوں گی۔ جو بات غلط ہے، وہ غلط ہے۔

''کل کیوں نہیں آئی تھیں؟'' حماد حسن کے لہجے کی بے قراری شدت سے محسوس کرنے کے باوجود وہ قدرے انجان بن گئی۔

''گھر میں کچھ کام تھا۔''

''اگر ایسی بات تھی تو فون کر دیتیں۔ میں سارا دن تمہارا انتظار کرتا رہا۔''

''سوری۔ مجھے خیال نہیں آیا۔''

''ارے!'' وہ جیسے اپنے آپ پر ہنسا۔ ''یعنی یہاں تو یہ عالم تھا کہ ہر پل تمہارا خیال رہا اور تمہیں ایک پل کو بھی خیال نہیں آیا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال آیا تھا کہ میں بغیر بتائے چھٹی کر رہی ہوں اور اس کے لیے مجھے پتا نہیں کیا جرمانہ ادا کرنا پڑے۔'' اُس نے بات کو ہلکے پھلکے انداز میں اڑانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ اُس کی بات گرفت میں لے کر کہنے لگا۔

''جرمانہ تو تمہیں ادا کرنا پڑے گا۔''

''کیا؟''

''شام میں تم میرے ساتھ گھر چلوگی۔ میں تمہیں اپنی مما سے ملواؤں گا۔''

وہ اُس کی بات سن کر فوراً کچھ نہیں بولی۔ بلکہ تمام پہلوؤں سے سوچنے میں لگ گئی۔

''تم خاموش کیوں ہوگئیں؟ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو تم اتنی سنجیدگی سے سوچنے بیٹھ گئیں۔''

''سوچنے کی بات تو ہے کہ آخر آپ مجھے اپنی مما سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں۔''

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے بتاؤ چلوگی نا؟''

''نہیں۔''

اُس کے صاف انکار کرنے پر وہ واقعی حیران ہوا۔

''کیوں؟''

''دیکھیں حماد حسن! میں یہاں ملازم ضرور ہوں۔ لیکن آفس کے بعد آپ کی بات ماننے کی پابند نہیں ہوں۔''

''عائشہ!'' وہ تاسف سے اُسے دیکھنے لگا۔ ''میں نے تمہیں آرڈر نہیں دیا۔ بلکہ اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میں تمہیں مما سے ملوانا چاہتا ہوں۔ اور پابند تو تم میری آفس ٹائم میں بھی نہیں ہو۔ سوائے آفیشل کاموں کے۔''

''سوری، میں کچھ غلط کہہ گئی۔''

وہ اپنے آپ سے اُلجھنے لگی کہ بنا سوچے سمجھے بول گئی۔ پھر اُٹھ کر جانے لگی تو اُس نے روک لیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گئی۔ تو کہنے لگا۔

''میرا خیال تھا تم نادان نہیں ہو۔ سمجھ گئی ہوگی کہ میں تمہیں اپنی مما سے کیوں ملوانا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے تو حد کردی۔ بھئی صاف ظاہر ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور..........''

''پلیز۔'' وہ ٹوٹ گئی۔ ''آپ ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟''

''بس مجھے پسند نہیں۔''

''کیا پسند نہیں۔ میں؟'' وہ ذرا سا آگے جھک کر پوچھنے لگا۔

اُس پر نظریں جمائے شدت سے اُس کے جواب کا منتظر تھا لیکن وہ خاموش رہی۔ اب پہلے ہی مقام پر اُسے کیا بتاتی کہ وہ اُسے پسند ضرور کرتی ہے لیکن اُس کے حوالے سے خواب دیکھتے ہوئے

ڈرتی ہے۔

''بھلا زمین آسمان بھی کہیں ملے ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی اور اُس کے روکنے اور پیچھے سے پکارنے کے باوجود اُس کے کمرے سے نکل آئی۔

وہی بات جو اُس نے سوچی تھی کہ وہ اپنی پسند کا برملا اظہار کرسکتا ہے اور اُس نے کر دیا تھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ بھی وہ سوچ چکی تھی اور اُسے یقین تھا کہ جب اپنانے کی بات آئے گی تو حیثیتوں کا فرق آڑے آجائے گا۔ اس لیے وہ پہلے ہی مرحلے پر بات ختم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی حیثیت جاننے کے بعد وہ پیچھے ہٹے۔ اس سے پہلے وہ خود ہی محتاط ہوگئی۔ گو کہ یہ بہت مشکل تھا خود پر ضبط کرنا، پہرے بٹھانا، لیکن وہ کوشش کر رہی تھی اور کتنے دنوں بعد اُسے پتا چلا کہ وہ اپنی ساری کوششوں میں کس بُری طرح ناکام ہو چکی ہے کہ جس کے لیے وہ پہرے بٹھا رہی تھی وہ تو جانے کن چور دروازوں سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ حالانکہ اُس روز کے بعد سے حماد حسن نے اُسے نہیں چھیڑا تھا، یا جیسے چھیڑ کر مطمئن ہو چکا تھا۔ اور شاید یہ اُس کی عادت تھی کہ بات شروع کر کے پھر بہت دنوں تک انجان بن جاتا تھا۔ گویا دوسرے کو موقع فراہم کرتا کہ جتنا دفاع کرنا ہے کرلو اور وہ کتنا دفاع کرتی خود سے لڑکر ہار چکی تھی۔ پھر بھی اُس کے سامنے خود کو لاتعلق ظاہر کرنا اُس کی مجبوری تھی۔ کیونکہ ممکن نہیں تھا کہ خود سے اُس کے سامنے جا کر اعتراف کرے کہ میں ہار چکی ہوں۔ آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ اور حماد حسن بظاہر کتنا ہی انجان سہی اُس سے انجان ہرگز نہیں تھا۔ بہت دنوں تک اُسے خود سے لڑتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ وہ تھک چکی ہے تب اُس کے سامنے آگیا۔ وہ اس وقت گھر جانے کے لیے اسٹاپ پر کھڑی تھی اور وہ گاڑی اُس کے قریب روک کر دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''آجاؤ۔'' نہ تحکم تھا نہ پیار بھرا اصرار۔ جانے کیا تھا اُس کے لہجے میں کہ وہ ایک آخری کوشش کے طور پر بھی منع نہیں کرسکی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ چاہتا تو اُس پر جتا سکتا تھا لیکن اس کے برعکس اپنی ہار تسلیم کر کے اُس کا بھرم رکھ گیا۔

''میں خود سے لڑتے لڑتے ہار گیا ہوں عائشہ! تم پلیز مجھے مزید مت آزماؤ۔ آخر تم مجھ سے گریز کیوں کر رہی ہو۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے؟'' وہ کچھ نہیں بولی تو پوچھنے لگا۔

''تم کہیں انگیج تو نہیں ہو؟''

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر کیوں مجھ سے دامن بچا رہی ہو۔ میں تمہارے معیار کے مطابق نہیں یا۔''

"پلیز حماد حسن!" اُس کے عاجزی سے ٹوکنے پر وہ خاموش ہو رہا۔ اور پھر قدرے تاخیر سے بولا۔

"بہرحال میں اس وقت تمہیں اپنی مما کے پاس لے جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو یہیں بتا دو۔"

"نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"میرا مطلب ہے، میں آپ کی مما سے مل سکتی ہوں۔"

"گڈ!" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر ایک نظر اُس پر ڈال کر بولا۔

"یوں رونی شکل بنا کر مت بیٹھو۔ ورنہ مما سمجھیں گی میں تمہیں زبردستی لے آیا ہوں۔"

"میری شکل ہی ایسی ہے۔"

"میں ضرور یقین کر لیتا اگر جو اس سے پہلے تمہیں نہ دیکھا ہوتا۔ اور میں نے مما کے سامنے بھی تمہارا وہی نقشہ کھینچا ہے۔ اگر انہوں نے اس طرح تمہیں دیکھا تو پہلی نظر میں کبھی نہیں پہچان سکیں گی بلکہ یہی سمجھیں گی کہ میں تمہارے بجائے کسی اور لڑکی کو لے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"ایک تو تم ہر بات کا مطلب پوچھنے بیٹھ جاتی ہو۔ کبھی خود سے بھی سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ خیر یہ کوشش بعد میں کرنا۔ پہلے مما سے مل لو۔"

اُس نے گیٹ کے سامنے ہارن بجایا اور گیٹ کھلنے پر گاڑی اندر لے آیا۔ تو اُس نے اُترنے سے پہلے ایک نظر یہاں سے وہاں تک دیکھ لیا۔ وسیع رقبے پر پھیلا خوب صورت بنگلا جس سے وہ مرعوب تو نہیں ہوئی لیکن اُس کے اندر سناٹے نے گھر کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ نہ تو خوش فہم تھی اور نہ ہی اُسے اپنی قسمت کے بہت اچھا ہونے کا یقین تھا۔

"کیا تم خوفزدہ ہو؟" وہ اُس کے رُک رُک کر چلنے پر پوچھنے لگا۔ پھر خود ہی بولا۔ "مما روایتی قسم کی خاتون نہیں ہیں۔ تمہیں اُن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں خوفزدہ نہیں ہوں۔" وہ یہی کہہ سکی اور اس کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو ہر قدم پر اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔

"مما" لابی عبور کرتے ہی اُس نے پکارنا شروع کر دیا جبکہ اُس نے قصداً سر جھکا لیا۔ پھر اُس کی آواز آئی۔

"مما! میں عائشہ کو لے آیا ہوں۔"

"ارے تو اُسے وہاں کیوں کھڑا رکھا ہے۔ یہاں آؤ بیٹا!" یہ خوشگوار تاثر دیتی اُس کی مما کی آواز تھی۔ وہ ذرا سی پلکیں اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس بہت گریس فل خاتون تھیں۔

"السلام علیکم!"

"جیتی رہو۔" انہوں نے قریب آ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر سٹنگ روم میں لے آئیں اور اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"حماد روز مجھ سے کہہ کر جاتا ہے کہ آج میں عائشہ کو ضرور لے کر آؤں گا۔ اور اب تو میں یہ سمجھنے لگی تھی جیسے عائشہ کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو اور یہ محض مجھے ٹالنے کی غرض سے ایسا کہتا ہے۔" پھر اُس سے کہنے لگیں۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جا کر چائے وغیرہ کا کہو۔"

"یہ کام میں کروں؟" وہ کن انکھیوں سے اُسے دیکھ کر بولا۔

"کیوں۔ تم کیوں نہیں کرو گے؟"

"مما! کم از کم عائشہ کے سامنے تو۔"

"عائشہ کے سامنے میں تمہیں مرغا بھی بنا سکتی ہوں۔"

"ہاں!" وہ فوراً چلا گیا تو مما اُسے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولیں۔

"یہ تمہیں بھی تنگ کرتا ہوگا۔"

اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں پسند بھی تو بہت کرتا ہے۔ پتا ہے جب سے تم سے ملا ہے بس سارا وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔" وہ بہت خوش ہو کر بتا رہی تھیں جبکہ وہ بے حد نروس ہو گئی اور موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

"اور کون ہوگا۔ کیا حماد نے تمہیں اپنے بارے میں نہیں بتایا۔" پھر خود ہی بتانے لگیں۔

"جب حماد سینئر کیمبرج میں پڑھ رہا تھا اُس وقت اُس کے پاپا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ حماد ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ میری خوشیوں اور زندہ رہنے کا واحد سہارا۔ میں نے اُسے پاپا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ حسن کی ڈیتھ کے بعد اُن کا بزنس میں خود دیکھتی تھی۔ ابھی دو سال پہلے حماد اس قابل ہوا ہے کہ اپنے پاپا کی جگہ بیٹھ سکے اور جس روز یہ اپنے پاپا کی جگہ بیٹھا اُسی روز سے میں نے اُس کی

شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں چاہتی تھی جلد از جلد اس کی شادی کر دوں تاکہ گھر میں کچھ رونق ہو۔ لیکن یہ آئیڈیل کی تلاش میں تھا اور یہ اچھی بات ہے کہ اُس نے مجھے بتا دیا کہ جب اُسے آئیڈیل لڑکی ملے گی وہ تب ہی شادی کرے گا۔ پھر ایک روز اُس نے مجھے تمہارے بارے میں بتا کر کہا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو چھ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں روز اُس کو کہتی ہوں کہ مجھے تمہارے گھر لے چلے۔ لیکن ٹال جاتا ہے۔'' اُس نے موضوع تبدیل کیا تھا۔ لیکن پھر وہی بات آ گئی تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔

''تم سمجھ سکتی ہو حماد مجھے کتنا پیارا ہے اور میں اُس کی کوئی بات رد نہیں کر سکتی۔ میرے اختیار میں ہو تو میں زمانے بھر کی خوشیاں اُس کے سامنے ڈھیر کر دوں۔ شاید ساری مائیں ایسا سوچتی ہیں۔ بہرحال جہاں تک دوسری خواہشات کی بات ہے تو میں نے اُس کے ذرا سے اشارے پر ہر چیز بن مول خریدی لیکن تم کوئی چیز نہیں ہو عائشہ جو وہ تمہاری طرف اشارہ کرے گا اور میں خرید کر اُس کی جھولی میں ڈال دوں گی۔ تم جیتی جاگتی انسان ہو اور تمہیں مانگنے کے لیے مجھے دامن پھیلانا ہے۔ تمہارے ماں باپ کے سامنے بعد میں ہاتھ پھیلاؤں گی پہلے تمہارے سامنے دامن پھیلا رہی ہوں۔''

''میڈم!'' انہوں نے ہاتھ پھیلائے ہی تھے کہ وہ پریشان ہو گئی۔

''نہیں بیٹا۔ مما کہو، یا آنٹی۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''میرے بیٹے کو مایوس مت کرنا۔ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ اور اُس نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ تم نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔''

''لیکن آنٹی! میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے میرے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار میرے والدین کو ہے۔'' وہ خود کو مشکل میں محسوس کرتے ہوئے یہی کہہ سکی۔

''میں تمہارے والدین کے پاس بھی جاؤں گی لیکن پہلے تم تو ہاں کرو۔ حماد کا کہنا ہے کہ تمہاری رضامندی لے کر ہی مجھے تمہارے گھر جانا چاہیے۔''

''لیکن آپ یہ بھی تو سوچیں کہ میں یہاں ہاں کہہ دوں اور پھر میرے والدین نہ مانیں تب۔'' اُس نے کہا تو وہ واقعی سوچ میں پڑ گئیں۔ اسی وقت وہ ٹرالی دھکیلتا ہوا آ گیا تو اُسے دیکھ کر بولیں۔

''یہ تم لے کر آ رہے ہو۔ ملازم کہاں ہیں؟''

''کمال ہے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ میں لے کر آؤں۔''

''میں نے کہا تھا ملازم سے کہو۔''

''میں بھی آپ کا خادم ہوں مما۔ اور اب اس بات پر بحث کرنے کے بجائے چائے پئیں ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اور آپ کی طرح عائشہ بھی ٹھنڈی چائے پسند نہیں کرتی۔'' وہ ٹرالی مما کے آگے کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اُس نے اپنی طرف کھینچ لی۔

''خاتون۔ اس وقت آپ ہماری مہمان ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ جلدی جلدی کپ سیدھے کرنے لگی۔ تو مما حماد کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے دلچسپی سے اُسے چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

''چینی۔'' اُس نے پہلے حماد اور پھر مما کو دیکھا۔

''ایک چمچ۔'' مما نے کہا۔ اور پھر ٹرالی اپنی طرف کر کے اُس میں سے پلیٹ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''تم یہ لو۔''

''شکریہ میں بس چائے لوں گی۔'' اُس نے پلیٹ اُن کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ رکھ دی۔ پھر چائے پیتے ہوئے مما اُس سے پوچھنے لگیں۔

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟''

''میرے والدین اور میں۔ دو بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور اُن دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' وہ بے اختیار کہہ گیا۔ اور مما کے گھورنے پر سر کھجانے لگا۔

''اب میں چلوں گی۔'' وہ چائے ختم کرتے ہی جانے کی بات کرنے لگی۔

''میں تمہیں روک نہیں سکتی۔ لیکن یہ بتاؤ پھر کب آؤ گی۔'' مما نے اتنے پیار سے پوچھا کہ وہ صاف منع بھی نہیں کر سکی اور دوبارہ آنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ تب وہ کہنے لگیں۔

''میرا خیال ہے اب میں آؤں گی۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اپنی والدہ سے میرا ذکر کر دینا۔''

''جی۔'' وہ کھڑی ہوئی تو مما اُس سے کہنے لگیں۔

''جاؤ حماد، عائشہ کو چھوڑ آؤ۔''

''چلیئے خاتون۔'' اُس کی حرکتیں اُس کے اندرونی جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ وہ جلدی سے مما کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ اور اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو کہنے لگی۔

''بس مجھے کسی ایسی جگہ اُتار دیں جہاں سے میرے روٹ کی بس مل جائے۔''

''گھر تک کیوں نہ چھوڑ آؤں۔''

"نہیں۔ میرا گھرانہ اتنا ایڈوانس نہیں ہے۔ مجھے جاب کی اجازت مل گئی، یہی بڑی بات ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"او کے بابا۔ یہ بتاؤ مما نے تم سے کیا باتیں کیں؟"

"یہ آپ اپنی مما سے پوچھ لیجیے گا۔"

"تمہیں بتانے میں کیا اعتراض ہے؟"

"کوئی اعتراض نہیں۔ بس گاڑی روک دیں۔ یہاں سے مجھے بس مل جائے گی۔"

وہ بے اختیار اسٹیئرنگ پر رکھے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ تو وہ ایک لطیف سے احساس میں گھر کر اُسے دیکھنے لگا۔ جبکہ اُس کا پاؤں آپ ہی آپ بریک پر چلا گیا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر اُترنے لگی تو اُس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شکریہ۔ مجھے کہنے دو عائشہ کہ تم نے میری محبت کو قبول کیا۔"

اُس کے لہجے میں محبتوں کی چاشنی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود اُس کی طرف دیکھ نہیں سکی اور بہت آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر نیچے اُتر آئی۔ پھر جب تک وہ بس میں سوار نہیں ہوگئی وہ وہیں رُکا رہا تھا۔ اور گھر میں داخل ہونے تک وہ بہت سرشار سی تھی۔ سارے ڈر، سارے خوف آپ ہی آپ کہیں رخصت ہوگئے تھے۔ بس اُس کی بات یاد تھی جو غالباً پہلی ملاقات میں اُس نے کہی تھی۔

"مجھے اپنی قسمت پر پورا یقین ہے کہ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔"

"آج اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟" اماں اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

"بس اماں کچھ کام زیادہ تھا۔" وہ جھوٹ بول کر کھڑی نہیں رہ سکی۔ جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ دل چاہا چپ چاپ لیٹ کر اُس سحر انگیز ماحول میں کھو جائے جس سے وہ ابھی ابھی آئی تھی۔ لیکن پھر اماں کا خیال آیا کہ وہ اب روٹی پکانے کی فکر کر رہی ہوں گی۔ سارا دن تو وہ بے چاری کام کرتی رہتی ہیں۔ اس وقت وہی آ کر کچن دیکھتی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اماں خود سے اُسے نہیں کہیں گی بلکہ خود ہی پکانے کھڑی ہو جائیں گی۔ اس لیے جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی۔ اماں نے توا چولہے پر رکھ دیا تھا اور برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا بھی رہی تھیں۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ اُس کے دیر سے آنے پر خفا ہو رہی ہیں لیکن غور کرنے پر پتا چلا کہ غصہ کسی اور پر ہے۔

"کیا ہوا اماں؟" اُس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ اور ماچس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو ٹرے پر نظر پڑی جس میں رکھی پلیٹوں میں سموسے، نمکو اور پیسٹری وغیرہ تھی۔ تب وہ پلٹ کر

پوچھنے لگی۔

"کون آیا تھا اماں؟"

"تمہاری بڑی آپا کے ساس، سسر آئے تھے۔" اماں کا انداز جلا بھنا سا تھا جس سے وہ سمجھ گئی کہ غصہ انہی کی کسی بات پر ہے۔ پہلے خود ہی قیاس کرتی رہی۔ جب سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھنا پڑا۔

"کیوں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے بڑی آپا اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔ اور اُن کے ٹھیک نہ ہونے پر کون بتا۔ نہ آتا ہے۔ خود اُسے ہی بھیج دیا جاتا ہے۔ اس وقت تو اپنی غرض سے آئے تھے۔ اور میں حیران ہوں کہ انہوں نے سوچا کیسے اور یہاں تک آئے کیسے؟"

"کس لیے آئے تھے؟"

"تمہارا رشتہ مانگنے، اپنے اُس لوفر اور آوارہ بیٹے کے لیے۔" اماں بتا کر پھر باقاعدہ انہیں بُرا بھلا کہنے لگیں جب کہ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جیسے اُس کے قدم آسمان پر تھے اور اب ایک دم زمین پر پہنچ گئی تھی۔ ایک پل میں حماد حسن کا خیال تو دوسرے پل آپا کا دیور جس کے بارے میں وہ جانتی تھی اور اماں بھی کہہ رہی تھیں۔

"کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ موٹے نے دس جماعتیں بھی تو پاس نہیں کیں۔ سارا دن چھت پر کبوتر اُڑاتا ہے اور جب میں نے یہ باتیں کیں تو بڑھیا بڑے آرام سے بولی کہ اپنے ہی عیب چھپاتے ہیں اور گلے لگاتے ہیں۔ لو اب ہم اپنے ہو گئے۔ پھر بڑی کا حال کون سا ہم سے چھپا ہے۔ کوئی سکھ نہیں اور ہم جانتے بوجھتے چھوٹی کو بھی جھونک دیں۔" اماں کی زبان چل پڑی تھی۔ سانس لینے کو رکی تھیں کہ اُس نے فوراً پوچھ لیا۔

"آپ نے کیا جواب دیا؟"

"صاف منع کر دیا۔ میں نے بھی اور تمہارے ابا نے بھی۔ آخر کوئی جوڑ بھی ہو۔" اماں پھر شروع ہو گئیں جب کہ وہ قدرے مطمئن ہو کر روٹی پکانے لگی۔ پھر بھی اماں کی باتوں سے بار بار ذہن بھٹک جاتا تھا۔

اُس رات اُس نے سوچا کہ اب اُسے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آپا کی ساس کو تو اماں نے منع کر دیا ہو سکتا ہے کوئی اور رشتہ اماں کو اچھا لگے اور وہ ہامی بھر لیں۔ اور اس سے پہلے ہی اُسے حماد حسن سے بات کر لینی چاہیے کہ وہ اپنی مما کو بھیج دے۔

صبح آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اُس کے ذہن میں بس یہی بات تھی کہ وہ آج ہی حماد

حسن سے بات کرے گی۔ اماں کی آواز پر کچن میں آئی اور وہیں کھڑی ہو کر ناشتا کرنے لگی۔

''آج بھی دیر سے آؤ گی کیا؟'' اماں پوچھنے لگیں۔

''نہیں اماں! کل تو کام زیادہ تھا۔ آج اپنے وقت پر ہی آؤں گی اور کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے۔ آپ پریشان مت ہوا کریں۔''

''پریشانی تو ہوتی ہے۔ تم بتا کر جو نہیں گئی تھیں۔ آئندہ کبھی دیر کی بات ہو تو پہلے سے بتا کر جایا کرو۔''

''اچھی بات ہے۔'' اُس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر مگ رکھا اور وہیں سنک پر ہاتھ دھو رہی تھی کہ بڑی آپا آ گئیں۔ اُن کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ یوں ٹھٹکی کہ بجائے ان سے ملنے کے پلٹ کر اماں سے آہستہ آواز میں بولی۔

''اماں! بڑی آپا آئی ہیں۔''

''ہائیں۔'' اماں نے گھوم کر دیکھا اور پھر فوراً چولہا چھوڑ کر باہر نکلیں۔ اور جیسے ہی بڑی آپا کو گلے لگایا وہ رونے لگیں۔

''ارے کیا ہوا؟'' اماں پریشان ہو کر بولیں تو آپا اور شدت سے رونے لگیں۔ آواز سن کر ابا بھی باہر نکل آئے اور جیسے بڑی آپا کو دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ گئے۔

''پہلے اندر تو آنے دو اسے۔'' انہوں نے کہا اور پھر خود ہی بڑی آپا کو اپنے ساتھ لگا کر اندر لے گئے۔ اماں بھی اُن کے پیچھے چلی گئیں جب کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اِدھر آفس کو دیر ہو رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اُس نے چائے گرم کر کے مگ میں ڈالی اور بڑی آپا کے لیے لے کر اندر آئی تو وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ اماں، ابا اُن کے دائیں بائیں بیٹھے انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''چائے پئیں آپا۔'' وہ اُن کے سامنے آ کر بولی۔ ''بس اب رونا بند کریں۔ اماں، ابا اتنے پریشان ہو رہے ہیں اور یہ آپ بچوں کو ساتھ نہیں لائیں؟''

''بچوں کو رکھ لیا ہے انہوں نے۔'' بڑی آپا نے پہلی بار زبان کھولی اور پھر اسی طرح روتے ہوئے اماں کو بتانے لگیں۔

''کل جس وقت سے میرے ساس، سسر یہاں سے ہو کر گئے ہیں اُسی وقت سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ رات میں سب گھر والوں کے درمیان پتا نہیں کیا باتیں ہوئیں۔ عارف بھی انہی کے ساتھ شامل تھے اور صبح اٹھتے ہی فیصلہ سنا دیا کہ اپنے گھر جاؤ۔ جب تک تمہارے ماں باپ چھوٹی

کا رشتہ نہیں دیں گے تم وہیں رہو۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ عائشہ کا رشتہ کبھی نہیں دیں گے۔ اس پر کہنے لگے تم بھی کبھی مت آنا اور اماں جب میں نے بچوں کو اُٹھایا تو انہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ چھوٹے کو بھی ساتھ نہیں لانے دیا۔''

بڑی آپا اور شدت سے رونے لگیں تو اماں نے اُن کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور تسلی دینے لگیں۔ پھر اُس پر نظر پڑی جو گم صم بیٹھی تھی تو غالباً اُسے وہاں سے اُٹھانے کی خاطر بولیں۔

''تم دفتر جاؤ۔ تمہیں دیر نہیں ہو رہی۔''

اور دیر تو ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ کھڑی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر بیگ اُٹھایا اور چپ چاپ باہر نکل آئی۔

کبھی کبھی اپنے گھر سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے۔ اُس کا دل چاہا وہ اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر کہیں بہت دُور نکل جائے، جہاں سے کبھی واپسی کا خیال آئے بھی تو بے نشان راستوں پر قدم بھٹکنے لگیں۔

''خاتون! آپ پورا ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ آئی ہیں۔'' ثاقب اُسے دیکھتے ہی بولا ''اور مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کی قسمت بڑی خراب ہے کیونکہ حماد صاحب ابھی دو منٹ پہلے آئے ہیں اور آتے ہی انہوں نے آپ کو بلوایا تھا۔ اگر آپ اُن سے دو منٹ پہلے آ جاتیں تو اچھی قسمت والوں کی فہرست میں آپ کا نام لکھا جا سکتا تھا۔''

''اب آپ میرا نام کون سی فہرست میں لکھیں گے۔'' وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ظاہر ہے بیڈ لک۔'' ثاقب کے انداز میں ہلکا پھلکا مزاح تھا۔ جب کہ وہ پوری طرح سنجیدہ تھی۔

اِسی وقت ملازم دوبارہ اُس کا پتا کرنے آ گیا اور اُسے بیٹھے دیکھ کر بولا۔

''مس! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔''

وہ اِسی وقت اُٹھ کر چلی آئی اور وہ اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔

''میں تمہارے دیر سے آنے کا سبب نہیں پوچھوں گا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہیں آپ؟'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''یہی کہ رات نیند دیر سے آئی ہو گی۔ لہٰذا صبح اُٹھنے میں بھی دیر ہو گئی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا عائشہ! بتا ہے رات تمہیں سوچتے ہوئے میں کتنی دُور نکل گیا تھا۔'' پھر اُس پر نظریں جمائیں تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر دھنک رنگوں کی برسات نہیں تھی بلکہ خود پر ضبط کرتی نظر آئی۔

تب پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

وہ کچھ نہیں بول سکی۔

"گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

اُس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر تم اتنی اداس کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔"

"کیا، نہیں تو۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔"

"کم آن عائشہ۔" وہ زچ ہو کر دبی آواز میں چیخا۔ "مت مجھے اُلجھاؤ پلیز۔"

"آپ خواہ مخواہ اُلجھ رہے ہیں جب کہ میں کہہ رہی ہوں کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اپنے گھر کی پرابلم اُسے نہیں بتانا چاہتی تھی۔

"چلو مان لیتا ہوں اور تم بھی سن لو کہ آج شام میں مما کو لے کر تمہارے گھر آ رہا ہوں۔" وہ اُس کے حتمی انداز پر سٹپٹا گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔ حماد حسن ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ابھی مجھے اپنی قسمت کے اچھا ہونے کا یقین نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔" وہ یقین سے بولا۔

"پھر بھی ابھی نہیں۔"

وہ اُس کی ضد پر حیران ہوا۔ کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے عائشہ! کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے حماد آپ ...."

"پلیز!" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے روک دیا۔ "اگر سچ نہیں بول سکتیں تو جھوٹ مت بولو۔ اور اطمینان رکھو جب تک تم کہو گی نہیں میں مما کو لے کر نہیں آؤں گا۔"

"پلیز حماد! آپ ناراض نہ ہوں۔"

"میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔"

"تھینک یو۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اُس کے پاس سے اُٹھ آئی اور گو کہ اُس کی ٹیبل پر کافی کام موجود تھا لیکن وہ ذہنی طور پر اتنی اپ سیٹ تھی کہ کسی فائل کو ہاتھ لگانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ اور محض ثاقب اور شہزاد پر خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے مسلسل کی بورڈ پر اُنگلیاں چلاتی رہی۔ جب کہ ذہنی خلفشار مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے دماغ کی نسیں پھٹنے کو ہوں۔

"کیا ہوا مس عائشہ؟" اُس نے اپنی پیشانی ٹیبل پر لگائی ہی تھی کہ ثاقب پوچھنے لگا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں، میں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی۔" وہ اُنگلیوں سے پیشانی دباتے ہوئے بولی۔

"چائے منگواؤں؟"

"نہیں۔ بس آپ حماد صاحب سے کہہ دیں، میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

ثاقب فوراً اُٹھ کر چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد آ کر بولا۔

"آپ جا سکتی ہیں اور حماد صاحب کہہ رہے ہیں اگر آپ کہیں تو ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔"

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔"

اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا اور آفس سے نکل آئی۔ پھر اُسی طرف جانا تھا جہاں سے صبح وہ وحشت زدہ ہو کر نکلی تھی۔ اور اب واپسی کا تمام راستہ وہ یہ سوچتے ہوئے آئی کہ کاش دولہا بھائی ہی کچھ خیال کر کے آ گئے ہوں اور اُس کی قسمت کا فیصلہ یوں نہ ہو۔ وہ مجبوریوں کی بھینٹ چڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ بے شک حماد حسن اُس کے نصیب میں نہ ہو لیکن آپا کے دیور کے ساتھ تو وہ کبھی سمجھوتا بھی نہیں کر سکے گی۔ گھر میں وہ بہت خاموشی سے داخل ہوئی لیکن آگے اُس سے زیادہ خاموشی تھی۔ وہ دبے پاؤں آگے آئی تو اماں کچن میں کھڑی نظر آئیں۔ وہ انہی کے پاس آ گئی۔

"جلدی آ گئیں۔" اماں نے پتا نہیں اُس سے پوچھا، یا اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں۔ بڑی آپا کہاں ہیں؟"

"اندر لیٹی ہے۔ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ صبح سے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ جاؤ اُٹھاؤ اُسے۔ کچھ کھا پی لے۔ میں کھانا لے کر آ رہی ہوں۔"

وہ بوجھل قدموں سے اندر آئی۔ بڑی آپا منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر پہلے خود کو سمجھایا۔ پھر بڑھ کر اُن کے سر سے چادر کھینچ لی۔

"اُٹھیں بڑی آپا! یہ کیا نادانوں جیسی حرکتیں کر رہی ہیں۔"

''مت چھیڑو مجھے۔'' انہوں نے دوبارہ چادر میں منہ چھپانا چاہا لیکن اُس نے ایک جھٹکے سے چادر کھینچ کر دُور پھینک دی۔

''اس طرح مسئلے حل نہیں ہوتے آپا۔ اُٹھیں منہ ہاتھ دھوئیں پھر بیٹھ کر کوئی حل سوچتے ہیں۔ دیکھیں میں آپ کی وجہ سے چھٹی لے کر آئی ہوں۔''

''مجھے بچوں کا خیال آ رہا ہے۔ پتا ہے ننھی کو رات بخار بھی تھا۔'' آپا اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''فکر مت کریں۔ بچے اکیلے نہیں ہیں۔ گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔''

''اور لوگوں کو تم جانتی ہو۔ کوئی پلٹ کر پوچھے گا بھی نہیں۔''

''ایسا صرف آپ کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ اب سب پوچھیں گے۔ بہرحال آپ منہ ہاتھ دھو کر آئیں اماں کھانا لا رہی ہیں۔''

آپا اُٹھ کر چلی گیں تو اُس نے تخت پر دسترخوان بچھا دیا اور پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ اماں کھانا لے کر آئیں تو اشارے سے آپا کے بارے میں پوچھا۔ اور اُس نے اشارے ہی سے اطمینان دلایا کہ وہ آ رہی ہیں۔ اور بڑی آپا آ کر بیٹھ تو گئیں لیکن کھانے سے انکار کر دیا۔ وہی بچوں کا خیال تھا کہ پتا نہیں انہوں نے کھانا کھایا، یا نہیں۔

''آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں آپا۔ بلکہ یہ سوچیں کہ اگر دوسرے گھر والوں نے بچوں کا خیال نہیں رکھا تو دولہا بھائی کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔'' اُس نے کہا تو اماں اُس کی تاکید کرتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے یہ اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ بچے انہی کے پاس ہیں۔ ہم بھی دیکھیں کتنے دن بچوں کو سنبھال سکیں گے۔ دو دن میں دیکھنا عارف بھاگا آئے گا۔'' آپا کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ کھانا کھانے لگیں۔ پھر کچھ خیال آیا تو کہنے لگیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا اُن لوگوں کو بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا۔ حالانکہ پچھلے دنوں میری ساس جابر کے لیے اپنی بھانجی لینے کی بات کر رہی تھیں پھر اچانک پتا نہیں انہیں عائشہ کا خیال کیسے آ گیا۔''

''عائشہ تو میں مر کر بھی نہیں دوں گی۔'' اماں فوراً بولیں۔ ''تم اگر میری بیٹی ہو تو یہ بھی میری اولاد ہے اور میں اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتی۔''

''بس کریں اماں۔'' اُس نے اُکتا کر ٹوکا۔ پھر آپا سے کہنے لگی۔ ''بس آپا آپ اطمینان سے رہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی ایسی آندھی نہیں چل رہی کہ وہ لوگ تینوں بچوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔''

''اور کیا۔ دو چار دن دیکھ لیں پھر میں خود جاؤں گی۔'' اماں نے بھی حوصلہ دیا تو بڑی آپا قدرے مطمئن نظر آنے لگیں۔

اور پھر دو چار دن تو کیا پورے دو ہفتے گزر گئے لیکن آپا کے سسرال میں سے کوئی نہیں آیا۔ اس دوران اماں نے جانا چاہا تو ابا نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور اب آپا کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ اماں، ابا کو اُن کی فکر تو تھی لیکن اُن کے سسرال والوں کے مطالبے پر سوچنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اگر جابر کسی قابل ہوتا تب تو سوچا بھی جا سکتا تھا۔ اور اُس میں صرف یہی خامی نہیں تھی کہ وہ کماتا نہیں تھا بلکہ اُس میں کوئی خوبی تھی ہی نہیں۔ اور جانتے بوجھتے اماں، ابا اپنی بیٹی پر یہ ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ اور اس سارے قصے میں وہ بظاہر کہیں نہیں تھی، پھر بھی ساری بات اِسی سے شروع ہو کر اِسی پر ختم ہوتی تھی۔ کسی کسی وقت وہ خودغرضی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے اس مسئلے سے نظریں چرا کر اپنے اور حماد حسن کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتی لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' اُس روز حماد حسن نے کہا تھا اور پھر مما کے گھورنے پر سر کھجانے لگا تھا تو اُسے ہنسی آئی تھی۔ اور اب اچانک جو رکاوٹ کھڑی ہو گئی تھی اس کے بارے میں وہ اُسے بتانے سے جانے کیوں گریز کر رہی تھی، یا تو اُسے یقین تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، یا پھر وہ بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔ اور اُسے یہ سوچنا بھی عجیب سا لگتا تھا کہ کبھی جو وہ حماد حسن کے سامنے یہ کہے کہ میں مجبور ہو گئی ہوں۔ اور حماد حسن کا وہی انداز تھا۔ اس کی عادت ہی نہیں تھی کہ کسی بات کے پیچھے پڑ جائے۔ بس ایک بار پوچھتا اس کے بعد انجان بن کر بہت خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا۔ کبھی وہ خود سے لڑتے ہوئے نظر آتی، کبھی نڈھال اور کبھی مطمئن۔ لیکن اس بار وہ اُسے بہت مختلف نظر آئی۔ نہ تو کبھی خود سے لڑتے ہوئے محسوس ہوئی اور نہ کسی ایک پل اُس کے چہرے پر اطمینان اُترا۔ اس کے برعکس کسی بڑی پریشانی سے دوچار نظر آتی اور پہلے اُس نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کیے رکھی کہ ہو سکتا ہے کوئی گھریلو پریشانی ہو اور وہ اُسے بتانا نہ چاہتی ہو، یا جب مناسب سمجھے گی بتا دے گی۔ لیکن پندرہ دن گزرنے کے بعد بھی جب وہ بتانے پر آمادہ نظر نہیں آئی اور اُس کا گریز بھی بدستور رہا تب وہ مزید انتظار نہیں کر سکا۔

''تم جان گئی ہو گی کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔'' وہ اُس کے بیٹھتے ہی بولا۔ تو جواب میں وہ سر جھکا گئی۔

''دیکھو عائشہ، اس طرح بات نہیں بنے گی نا۔ آخر تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔'' اُس کا انداز جھنجھوڑنے والا تھا۔ پھر بھی وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''پرابلم میرے ساتھ نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''پھر۔'' وہ اُس کی طرف دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ آیا اُسے بتائے، یا نہ بتائے۔

''سنو، کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے بتا کر اس پرابلم میں اضافہ ہوگا۔''

''نہیں۔''

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔''

وہی انداز تھا۔ نہ تحکم نہ اصرار۔ پھر بھی وہ منع نہیں کر سکی اور ساری بات بتا دی۔ جسے سن کر وہ فوراً کچھ نہیں بول سکا بلکہ اُس کا سوچتا ہوا انداز یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے ساری بات سننے کے بعد وہ دوبارہ سے ہر بات سوچنے لگا ہو۔ اور کافی دیر بعد اُس پر نظریں جما کر پوچھنے لگا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں۔'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''ہاں تم عائشہ۔ مجھے بتاؤ جب تمہارے والدین جابر کے پرپوزل کو سختی سے رد کر رہے ہیں پھر تم نے مجھے مما کو لانے سے کیوں منع کیا۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تم انتظار میں ہو کہ......''

''نہیں۔'' وہ اُس کی بات سمجھ کر فوراً ٹوکتے ہوئے بولی۔ ''میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ پہلے آپا اپنے گھر چلی جائیں۔''

''وہ بھی چلی جائیں گی۔''

''کیسے؟ دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور اُن کی طرف سے کوئی نہیں آیا۔ جب کہ آپا بچوں کے لیے بہت پریشان ہیں۔''

''اُن کی پریشانی بجا ہے اور تمہاری اپنی آپا کے لیے پریشانی بھی بے جا نہیں۔ لیکن عائشہ میرا خیال بھی تو کرو۔ مجھے روز مما کے سامنے ایک نیا عذر تراشنا پڑتا ہے۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ عاجزی سے بولی۔

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے جیسا کہ تم نے مما سے کہا تھا کہ تمہارے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار تمہارے والدین کو ہے تو سب انہی پر چھوڑ دو۔ میں مما کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارے والدین اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی اچھا پرپوزل ہو اور وہ جلد تمہاری شادی کر دیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اور وہ سمجھ کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اور آپا کا خیال آنے پر بولی۔

''لیکن حماد! آپا کا کیا ہوگا؟''

''میں اُن کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب میرا، تمہارے گھر سے کوئی تعلق ہو۔ ورنہ پہلا سوال یہی اُٹھے گا کہ تم کون ہو۔'' پھر ذرا سا مسکرا کر بولا۔ ''اور میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ عائشہ نورالٰہی کا چاہنے والا، یا اگر اجازت دو تو صرف چاہنے کا حق جتنا کر بات کر لوں۔''

''نہیں۔'' وہ اُس کے مسکرانے پر سر جھکا کر بولی۔

''او کے۔ پھر آج شام ہی مما تمہارے گھر آئیں گی۔ انتظار کرنا۔ بلکہ ایسا کرو تم ابھی گھر چلی جاؤ۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں بھی جا رہا ہوں اور ہاں ذرا اپنے گھر کا پورا ایڈریس لکھ دو۔'' اُس نے کاغذ قلم سامنے رکھا تو وہ اُس پر ایڈریس لکھ کر کھڑی ہو گئی اور اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

حماد حسن کا خیال صحیح تھا کہ ہو سکتا ہے اماں، ابا اس انتظار میں ہوں کہ کوئی اچھا پرپوزل ہو اور وہ جلد اُس کی شادی کر دیں۔ مما کے آنے پر اماں واقعی بہت خوش تھیں اور چاہتی تو یہی تھیں کہ اسی وقت حماد حسن کے لیے ہامی بھر لیں لیکن مصلحتاً سوچنے کو کچھ وقت مانگا۔ اور اس رات اماں، ابا کی باتیں سننے میں سراسر اُس کے ارادے کو دخل تھا۔ اس کے بعد وہ واقعی مطمئن ہو گئی کیونکہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ جلد ہی اُس کی شادی کر دینی چاہیے۔ اُن کے خیال میں اس طرح آپا کے سسرال والوں کی ضد آپ ہی آپ ٹوٹ جائے گی۔ وہ بڑی مگن سی اپنے کمرے میں آئی تو آپا کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ گھٹنوں میں ٹھوڑی ٹکائے بہت آزردہ بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا آپا؟'' وہ اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ تو جواباً اُن کی مسکراہٹ بڑی شکستہ تھی۔ پھر ایک نظر اُس پر ڈال کر بولیں۔

''آخر اماں، ابا نے فیصلہ کر لیا۔ اور یہ ٹھیک تو ہے۔ وہ کیوں میری خاطر تمہارے ارمانوں کا خون کریں۔''

''نہیں آپا۔''

''کیا نہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچ رہے کہ فوراً تمہاری شادی کر دیں۔ اس طرح میرے سسرال والے ضد چھوڑ دیں گے۔'' اُس کے خاموش رہنے پر کہنے لگیں۔

"یہ اماں، ابا کی بھول ہے عائشہ۔ میں اپنے ساس سسر کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور عارف بھی اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اگر چھڑی چھانٹ ہوتی تو اسی کو مقدر جان کر چپ چاپ یہیں بیٹھی رہتی لیکن میرے بچے۔" بڑی آپا کی آواز بھرآ گئی۔ اور روکتے روکتے بھی آنسو چھلک پڑے تو انہوں نے منہ چھپا لیا۔

"پلیز آپا۔ روئیں مت۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟"

"تم ابا سے کہو، ضد چھوڑ دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اُن سے کہو ایک بار جا کر عارف سے ملیں تو سہی۔ ہوسکتا ہے اُسے سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں، یا پھر مجھے جانے دیں۔ اس طرح بغیر بات چیت کیے تو مسئلے حل نہیں ہوتے۔ ابا، بیٹی کے باپ ہیں اس اعتبار سے اُن کے رویے میں کچھ لچک ہونی چاہیے۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ عارف اسی انتظار میں ہوں کہ ہماری طرف سے کوئی جائے۔"

"لیکن آپا! ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔"

"تو اُن کے ماں باپ کی مرضی بھی تو معلوم ہو۔ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ اب تک اپنی بات پر قائم ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں ابا سے کہوں گی چلے جائیں۔ لیکن پہلے آپ رونا بند کریں۔" اُس نے اپنے دوپٹے سے اُن کے آنسو صاف کیے اور اطمینان دلایا۔

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ صبح ہی چھوٹی آپا آ گئیں تو بڑی آپا نے اُن کی گود سے گڈو کو جھپٹ کر یوں اپنے سینے میں بھینچا کہ کچھ دیر کو سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ جانے کب کی پیاسی ممتا اپنی پیاس بجھانے کی کوشش میں گڈو کا خیال بھی نہیں کر رہی تھی جو اس اچانک افتاد پر رونے لگا تھا۔

"میری جان، میرا بچہ۔" بڑی آپا اُسے بازوؤں میں بھینچے اُس کا منہ چومے جا رہی تھیں اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بڑھ کر روتے ہوئے بچے کو اُن کی گود سے لے لے۔ تب وہی آگے آئی۔

"بس کریں آپا! دیکھیں یہ رو رہا ہے۔"

"ہاں۔" وہ سادگی سے پوچھنے لگیں۔ "کیوں رو رہا ہے یہ۔"

"آپ اسے تنگ جو کر رہی ہیں۔"

"نہیں تو۔ میں تو پیار کر رہی ہوں۔" انہوں نے پھر بچے کو بھینچا اور اُس کے چیخ کر رونے پر گھبرا گئیں۔ "میرا عرفان تو ایسے نہیں روتا۔"

"ہاں، لائیے اسے مجھے دیں۔" اُس نے گڈو کو اُن سے لے کر چھوٹی آپا کی گود میں دیا تو وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"عرفان بھی میری گود پہچانتا ہے۔ کسی کے پاس چپ نہیں ہوا۔ میری گود میں آتے ہی چپ ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں اب اُسے کون چپ کراتا ہوگا۔" اپنے آپ سے کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تب وہ ابا سے کہنے لگی۔

"ابا! آپ کو جا کر پتا کرنا چاہیے۔ اس طرح خاموشی اختیار کر کے بیٹھ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"عائشہ ٹھیک کہتی ہے۔" اماں اُس کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔ "اب مجھ سے بھی بڑی کی حالت دیکھی نہیں جاتی اور میں تو کہتی ہوں شاہد بھی آیا ہوا ہے دونوں جا کر بات کر آئیں۔ چھٹی کا دن ہے عارف بھی گھر پر ہوگا۔"

"ہاں ابا! آپ اسی وقت شاہد بھائی کے ساتھ چلے جائیں۔" اُس نے اصرار سے کہا تو ابا شاہد کی طرف دیکھنے لگے۔

"چلیں۔" شاہد بھائی فوراً تیار ہو گئے۔ تب ابا کے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ اور انہیں بھیج کر وہ مسلسل اندیشوں میں گھر گئی تھی۔ کچھ دیر تک چھوٹی آپا کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر دوپہر کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اس لیے اماں سے پکانے وغیرہ کا پوچھ کر کچن میں آ گئی۔ وہاں سے باہر کا دروازہ سامنے تھا اور ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک کر دیکھنے لگتی۔ اُسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا صورت حال ہوگی اور ابا کیا خبر لے کر آئیں گے۔ بہرحال کھانا پک کر تیار ہو گیا۔ اس کے بعد ابا اور شاہد بھائی آئے۔ اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہر بات اُن کے چہرے پر تحریر تھی۔ پھر بھی اماں پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا؟"

"وہی ضد۔" ابا نڈھال سے بیٹھ گئے۔ اور شاہد بھائی تفصیل بتانے لگے۔ جسے سننے کے لیے وہ وہاں کھڑی نہیں رہی۔ نہ ہی بڑی آپا کے سامنے جانے کی ہمت کر سکی اس لیے کچن میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد باری باری سب کی آوازیں آنے لگیں اور کوئی بھی اس بات پر راضی نہیں تھا کہ اُن کی بات مان لی جائے سب رد کر رہے تھے۔ اماں اپنی بات پر قائم تھیں۔

"ایک کی زندگی خراب ہوئی، دوسری کی خراب نہیں کر سکتی۔"

"بھلا کوئی جوڑ بھی ہو۔" چھوٹی آپا کا انداز بھی جلا بھنا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اُن کی بات ماننے کی۔" شاہد بھائی کی آواز میں غصہ تھا۔ غالباً وہاں

اُن کی توہین ہوئی تھی۔ اور وہ سب کی سن کر مطمئن ہوئے جا رہی تھی کہ دبے پاؤں بڑی آپا آ گئیں اور کچھ کہے بغیر اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

''پلیز بڑی آپا۔'' اُس نے اُن کے ہاتھ تھام لیے۔

''میرے بچے رل جائیں گے عائشہ۔ اور کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہے۔''

''آپ کے بچے ٹھیک ہیں۔ آپ صبر تو کریں آپا۔''

''کتنا صبر کروں۔ بتاؤ کتنا صبر کروں۔'' وہ رونے لگیں۔ ''اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ آخر تم کیوں نہیں مان لیتیں۔ جابر اتنا بُرا نہیں ہے۔''

''بڑی آپا۔'' وہ سناٹے میں آ گئی۔ یہی آپا جابر کے عیب گنواتے نہیں تھکتی تھیں اور اب کہہ رہی تھیں وہ اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔

''میری خاطر عائشہ! ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' وہ رو رو کر فریاد کر رہی تھیں۔ ''میرے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ انہیں میری ضرورت ہے اور عارف کا کیا ہے وہ تو دوسری کر کے لے آئیں گے۔ بچوں سے اُن کی ماں ملا دو عائشہ۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے۔''

''بس کریں آپا۔'' وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر آئی تو اماں، شاہد بھائی اور چھوٹی آپا کو حماد حسن کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

''بس آپ فوراً عائشہ کی شادی کر دیں۔'' چھوٹی آپا نے کہا تو وہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ بڑی آپا خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف جا رہی تھیں اور وہ اُس کی ماں جائی تھیں جن کے دُکھ کو سمجھنے کے باوجود سب نظریں چرا گئے تھے اور جس کی خاطر ایسا کر رہے تھے وہی نظریں نہیں چرا سکی۔ وہیں سے پکار کر بولی۔

''اماں، مجھے جابر سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔'' اور سب کو حیران چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی تو بڑی آپا اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''مجھ سے سچ بولنا عائشہ۔ بس اتنا بتا دو۔ انکار تم نے کیا، یا تمہارے والدین نے؟'' وہ اُس پر نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔ اور وہ خود کو بہت مشکل میں محسوس کرنے لگی۔ کیونکہ سچ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اور گو کہ پہلے سے تیار کیا تھا لیکن سامنا ہوتے ہی کمزور پڑ گئی۔

''تمہاری خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟''

''کچھ بھی۔ میرا مطلب ہے جو آپ کا دل چاہے سمجھ لیں۔ کیونکہ بات تو ختم ہو گئی۔'' وہ سوچ

کر بولی۔

''تمہارے خیال میں بات ختم ہو گئی۔'' وہ تاسف سے ہنسا۔ ''تم نے اتنی آسانی سے بات ختم کیوں ہونے دی۔ کیا تم میرے لیے لڑ نہیں سکتی تھیں۔''

''ضرور لڑتی۔ اگر جو مجھے اپنی قسمت کے اچھا ہونے کا یقین ہوتا۔'' یہ بات کہتے ہوئے وہ بے حد آزردہ ہو گئی۔ اور وہ جو اُسے الزام دینا چاہتا تھا اُس کی آزردگی محسوس کر کے خاموش ہو رہا تھا، یا پھر اپنی عادت سے مجبور تھا کہ ذرا سا چھیڑ کر خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس کے بعد وہ کتنی دیر بیٹھی رہی لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ تب وہ دل پر ایک اور بوجھ لیے چلی آئی۔

پھر ابا نے جابر کے رشتے کے لیے ہامی بھر لی۔ لیکن ساتھ ہی چند شرائط بھی رکھ دیں۔ جس میں سرِفہرست یہ تھی کہ جب تک جابر خود نہیں کمانے لگے گا شادی نہیں کریں گے۔ دوسری شرط عائشہ کی تجویز کردہ تھی کہ آپا اب اپنے سسرال والوں کے ساتھ نہیں رہیں گی بلکہ عارف بھائی انہیں الگ گھر کا انتظام کر کے دیں۔

اور یہ شرائط مانتے ہوئے فوراً منگنی کا مطالبہ کیا گیا جس پر ابا نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ایک سادہ سی تقریب میں اُس کی باقاعدہ منگنی ہو گئی اور اس سے اگلے روز آپا اپنے بچوں سے جا ملیں۔

وہ نہ تو خوش فہم تھی اور نہ ہی اُسے اپنی قسمت کے بہت اچھا ہونے کا یقین تھا پھر بھی وہ یہ دعویٰ ضرور کرتی تھی کہ کبھی ناانصافی برداشت نہیں کرے گی۔ اور اب یہ ستم ظریفی ہی تو تھی کہ وہ نہ صرف ناانصافی برداشت کر گئی تھی بلکہ ایک ایسے شخص کے ساتھ بھی ناانصافی کر رہی تھی جس نے اُسے اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ نہیں تو پھر کوئی نہیں اور پتا نہیں بڑی آپا کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ اُسے کیوں بھول گئی۔ یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ''وہ جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے۔'' کا یقین ٹوٹنے پر کس بُری طرح بکھرا ہو گا اور اُس کی مما جن کی خوشیوں اور زندہ رہنے کا واحد سہارا ہے اور اپنے ساتھ وہ اس واحد سہارے سے بھی ناانصافی کر رہی ہے۔ لیکن وہ یہ سب کیسے سوچتی اُس کے سامنے بڑی آپا کے بندھے ہاتھ تھے جنہوں نے اُس سے خود اپنی ذات کی نفی کروا دی تھی اور پہلے پہل اُسے واقعی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی کڑی آزمائشیں اپنے اور حماد حسن کے نام لکھ گئی ہے۔ اور بہت زیادہ وقت بھی نہیں گزرا بلکہ کچھ ہی دنوں میں اُسے اندازہ ہو گیا کہ ان آزمائشوں سے گزرنا اور کٹھن راہوں پر چلنا آسان نہیں ہے۔ گو کہ حماد حسن نے پھر اُس سے کوئی بات نہیں کی لیکن اُس کی خاموشی میں جو اصرار تھا، اُسے محسوس کرتے ہوئے وہ مسلسل ایک عذاب میں گھر گئی تھی۔ پھر محبت تو اُس کی بھی دار پر چڑھی تھی اور اس کی کسک بھی چین

نہیں لینے دیتی تھی۔ بے حد کڑھ کر دُکھ سے سوچتی کہ بس دوگام پر ہی تو منزل تھی پھر درمیان میں دیوار کیوں حائل ہوگئی اور پھر الزام اپنی قسمت کو ہی دیتی۔

اُس روز آفس جانے کے لیے نکلی تو راستے میں اچانک محسوس ہوا جیسے کوئی مسلسل اُس کے تعاقب میں ہے۔ وہ ڈری تو نہیں اور نہ ہی فوراً پلٹ کر دیکھا۔ البتہ جب اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تو اطراف کا جائزہ لینے لگی کہ اُس کے پیچھے آنے والا کون تھا۔ سارے چہرے اجنبی تھے، یا جو روز اس وقت نظر آتے تھے۔ اور اُن میں سے کوئی بھی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا جس سے اُسے شبہ ہوتا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے وہم پر محمول رہی تھی کہ عقب سے آواز آئی۔

''السلام علیکم!'' وہ فوراً پلٹی اور جابر کو دیکھ کر اُس کے پورے وجود میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

عجیب سا حلیہ تھا اُس کا۔ بدرنگ سی جینز کی پینٹ پر بلیک ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور گلے میں لال رنگ کا مفلر اُسے انتہائی لوفر ظاہر کر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر پہلے والی پوزیشن میں آ گئی۔ اب واقعی وہ ڈرنے لگی تھی کہ کہیں اُس کے پیچھے پیچھے آفس تک نہ چلا آئے۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اُس کی بس آ چکی تھی لیکن وہ محض اُس کی وجہ سے سوار نہیں ہوئی۔

''دفتر جا رہی ہو؟'' اُس کے فضول سے سوال کا اُسے جواب دینا پڑا۔

''ہاں۔''

''کیسے جاؤ گی؟''

''بس سے۔''

''لیکن بس تو نکل گئی۔''

''دوسری آ جائے گی۔''

''اچھا! تو تم میری وجہ سے رُکی ہو۔'' وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ اور وہ اُس کی وجہ سے رُکی ضرور تھی لیکن جو وہ سمجھ رہا تھا اس سے اُس کی جان جل گئی۔ کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی کہ پھر ہونٹ بھینچ لیے اور وہ اس کی خاموشی سے جو سمجھا اسی حساب سے بولا۔

''میں بھی تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ خیر اب میں روز اسی وقت آ جایا کروں گا۔'' اُس کا دماغ گھوم گیا۔

''نہیں۔''

''کیوں، کیا تم ڈرتی ہو۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں منگیتر ہوں تمہارا۔''

''لیکن یہ اچھا نہیں لگتا۔'' وہ بمشکل خود پر ضبط کر کے بولی۔ ''یوں اسٹاپ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ پتا نہیں کیا سوچیں اور پھر سب نہیں جانتے کہ تم میرے کون ہو۔ آج تمہیں دیکھیں گے تو کل کوئی اور فری ہونے کی کوشش کرے گا۔''

''کوئی ایسی جرأت کر کے تو دیکھے۔ ٹانگیں توڑ کے رکھ دوں گا۔'' اُس کے سمجھانے کا اُلٹا اثر ہوا جس سے وہ مزید پریشان ہو گئی۔

''اس سے پہلے تو نہیں کسی نے پریشان کرنے کی کوشش کی۔''

''نہیں۔''

''ہاں اگر ایسی کوئی بات ہو تو فوراً مجھے بتانا۔''

''اچھی بات ہے۔ اب تم جاؤ۔'' وہ بڑی مشکل سے اُس سے پیچھا چھڑا کر بس میں سوار ہوئی۔ پھر بھی تمام راستے یہ خوف رہا کہ کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہا اور آفس میں داخل ہونے سے پہلے احتیاطاً پیچھے مڑ کر اُس کے موجود نہ ہونے کا یقین کیا۔ اس کے بعد اندر آئی تو پہلے مرحلے پر ہی حماد حسن سے سامنا ہو گیا۔ اُس کی حالت اتنی غیر ہو رہی تھی کہ وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ رُک کر پوچھنے لگا۔

''اینی پرابلم مس عائشہ۔''

''نو سر۔''

''لیکن آپ کچھ بہتر نظر نہیں آ رہیں۔''

''آئی ایم آل رائٹ۔''

وہ جلدی سے کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور بیٹھتے ہی دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ ایسا تو اُس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ اگر ساری زندگی بھی اُس کی شخصیت کو پالش کرنے کی کوشش کرتی رہے تب بھی اُس میں ذرہ برابر فرق نہیں آنا تھا۔ اور جیسا اُس کا حلیہ تھا وہ ایک قدم بھی اُس کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی۔ کہاں ساری زندگی۔ لیکن اُس کا اپنا فیصلہ تھا اور اگر اپنا نہیں تھا تب بھی احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال سارا دن خود کو زبردستی کام میں مصروف رکھ کر اُس کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بُری طرح ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ گلے میں لٹکتا لال مفلر اور پان کی زیادتی سے ہونٹوں کا تو جو حال تھا سو تھا اندر سے پورا منہ لال سرخ ہو گیا تھا۔ جب کہ اُسے پان سے شدید نفرت، یا چڑ تھی۔

پھر روزانہ ہی ایسا ہونے لگا کہ صبح جب وہ گھر سے نکلتی تو جابر راستے ہی میں کہیں سے اُس کے ساتھ ہو جاتا اور یہ صورتِ حال اُس کے لیے قطعی ناقابلِ برداشت تھی۔ پہلے آرام سے سمجھانے کی

کوشش کی کہ وہ اس طرح نہ آیا کرے لیکن وہ باز نہیں آیا۔ تب اُس روز وہ سیدھی بڑی آپا کے گھر پہنچ گئی۔ بڑی آپا اپنے سسرال والوں سے الگ ہو چکی تھیں۔ صبح ہی صبح اُسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور پریشان بھی۔

''خیریت تو ہے عائشہ؟''

''ہاں۔'' وہ دولہا بھائی کو دیکھ کر اسی قدر کہہ سکی۔

''آج آفس نہیں گئیں؟''

''جا رہی تھی لیکن راستے میں موڈ بدل گیا اور آپ کے پاس آ گئی۔''

''اچھا کیا۔ میں کتنے دنوں سے تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ آرام سے بیٹھو۔ میں عارف کو ناشتا دے کر آ رہی ہوں۔'' پھر جاتے جاتے پوچھنے لگیں۔ ''تم ناشتا کرو گی۔''

''نہیں۔ ناشتا کر کے نکلی تھی۔''

''اچھا چائے لاتی ہوں۔'' بڑی آپا چلی گئیں۔ تو وہ ننھے عرفان کے پاس آ بیٹھی اور اُس کی زبان میں اُس سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد بڑی آپا چائے لے کر آئیں اور اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''ہاں اب سناؤ کیسی ہو، اماں ابا ٹھیک ہیں۔''

''ہاں۔ آپ اتنے دنوں سے آئیں نہیں۔''

''کیا کروں، پہلے اس گھر میں شفٹ ہونے میں اتنے دن لگ گئے پھر دونوں بیٹیوں کو اسکول داخل کرنا تھا۔ اب کہیں جا کر اطمینان نصیب ہوا ہے۔ بس جس دن ننھی اور گڑیا کی چھٹی ہو گی آؤں گی۔''

''ہاں! اب تو آپ کے ساتھ یہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ جب بچوں کی چھٹی ہو گی تب آئیں گی۔''

''ویسے بھی روز روز آنا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ قدرے حیران ہو کر دیکھنے لگی کہ جب اُن کی ساس انہیں یہ بات کہتی تھیں تو انہیں بُرا لگتا تھا اور اب خود کتنے آرام سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ خوش ہیں آپا۔ میرا مطلب ہے اس گھر میں آ کر۔'' وہ انہیں خوش دیکھ کر بھی پوچھنے لگی اور اُن کے جواب میں بے ساختگی تھی۔

''خوش۔ بہت خوش ہوں۔ جان چھوٹی میری اُن لوگوں سے۔ پابندیوں سے نجات ملی۔ اپنا گھر ہے۔ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہوں۔ نہ ساس نندوں کی چخ چخ نہ دیور کی باتیں۔'' غالباً دیور پر انہیں یاد آیا تو کہنے لگیں۔

''ابھی پرسوں جابر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا بس اب جلدی شادی کروں گا۔''

''کیوں۔ میرا مطلب ہے، کیا وہ کام سے لگ گیا ہے؟''

''نہیں اور وہ کیا کام کرے گا۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے اور نہ اُس کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہے۔'' پتا نہیں آپا بھول گئی تھیں، یا جان بوجھ کر اُس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھیں کہ جابر کے ساتھ اُس کا نام بھی آتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک ٹٹولتی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی پھر بظاہر سرسری انداز میں بولی۔

''لیکن آپا! شاید آپ بھول گئی ہیں کہ ابا نے شادی کے لیے یہی شرط رکھی ہے کہ پہلے وہ کسی کام سے لگے۔''

''مجھے پتا ہے اور میں نے جابر سے بھی یہی کہا تو کہنے لگا، کیا ضرورت ہے۔ بیوی کما تو رہی ہے۔''

''کیا۔'' اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر تاسف سے بولی۔ ''یہ اُس کے خیالات ہیں لیکن آپ اُسے بتا دیجیے گا آپا کہ جب تک وہ ابا کی شرط پوری نہیں کرے گا شادی نہیں ہو گی۔''

''شرطوں پر بھی کہیں شادی ہوتی ہے عائشہ۔'' آپا اُلٹا اُسے سمجھانے لگیں۔ ''فرض کرو وہ اگلے دس سالوں تک کسی کام سے نہ لگ سکے تو کیا اتنا عرصہ اماں ابا تمہیں بٹھائے رکھیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی کسی کام سے لگ جائے اور شادی ہوتے ہی چھوڑ کر بیٹھ جائے تب کوئی کیا کر لے گا۔''

''آپا۔'' وہ مارے صدمے کے کچھ بول ہی نہ سکی۔ یہ اُس کی ماں جائی تھیں جن کی وجہ سے اُس نے یہ طوق گلے میں ڈالا تھا۔ اور ابھی بھی وہ یہ سوچ کر اُن کے پاس آئی تھی کہ اُن سے جابر کی شکایت کرے گی لیکن وہ تو اُلٹا اُس کے حق میں بول رہی تھیں۔ خود اپنے لیے وہ بہت بُرا تھا اور اُس کے لیے کوئی بُرائی نہیں تھی۔ بڑے آرام سے کہہ رہی تھیں۔

''شادی کی یہی عمر ہے عائشہ! اماں سے کہنا خواہ مخواہ کی ضد نہ کریں اور پھر تم جاب کر تو رہی ہو۔ شادی کے بعد بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ سارا دن ساس نندوں کی چخ چخ سے بچی رہو گی اور میاں پر رُعب الگ۔''

وہ کوشش کے باوجود خود کو بولنے کے قابل نہیں کر سکی۔ ہونٹ بھی کھولے لیکن آواز نہیں نکلی۔ جب کہ ذہن میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا سارے لحاظ بھلا کر اس عورت کا منہ نوچ لے جس نے مطلب نکلتے ہی آنکھیں پھیر لی تھیں۔

''شاید باہر کوئی ہے۔'' دروازے پر دستک کی آواز سن کر آپا بھاگی گئیں تو اُس کا دل چاہا چُپ چاپ کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے لیکن اُس کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ اور برآمدے میں آپا پتا نہیں کس سے کہتے ہوئے آ رہی تھیں۔

''ہاں مان گئی۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ۔'' پھر وہ اندر آ گئیں اور اُن کے پیچھے جابر کو دیکھ کر اُس کے اعصاب پر ایک اور کاری ضرب پڑی۔

''بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔'' آپا جابر کو بیٹھنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں تو وہ یونہی اُسے دیکھنے لگی۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔'' وہ قمیص کے کالر اُونچے کرتے ہوئے بولا۔ اور پہلے اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور اب بلاخوف وخطر اُس نے اپنی پیشانی پر شکنیں ڈال لیں۔

''کچھ مزاج برہم لگتا ہے۔'' وہ کرسی اُس کے بالکل قریب کھینچ کر بیٹھنا چاہتا تھا کہ وہ پیر کی ٹھوکر سے کرسی گراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''باپ رے، اتنا غصہ۔ لیکن پتا بھی تو چلے کس بات پر ہے۔''

''شٹ اپ۔'' وہ دانت پیس کر بولی اور اپنے بیگ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔

''اتنا جاہل بھی نہیں ہوں کہ شٹ اپ کا مطلب نہ سمجھوں۔ ویسے رُعب کسی اور پر جمانا۔'' وہ بہت جلد اپنی اصلیت پر آ گیا۔ ''میں آرام سے بات کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم سر چڑھ جاؤ۔ یاد رکھو، میں اگر سر چڑھاتا ہوں تو مزاج ٹھکانے لگانا بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''کیا۔'' غصے کی شدت سے اُس کا بدن کانپنے لگا تھا۔

''ہاں، کسی بھول میں مت رہنا۔''

''تم بھی کسی بھول میں مت رہنا جابر! تمہارے جیسے بندوں کو میں جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں۔''

اُس کی بات پوری ہوئی تھی کہ زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر آ لگا۔ یہ جملہ بالکل غیر متوقع تھا جس سے وہ سنبھل نہیں سکی اور فرش پر گرنے سے پہلے اپنی ہتھیلیاں ٹکا دیں۔ جس سے کسی متوقع چوٹ سے بچ گئی لیکن اندر جو چوٹ لگی تھی وہ بڑی شدید تھی۔ جس نے اُسے بالکل ہی آپے سے باہر کر دیا تھا۔

''تم۔'' وہ باقاعدہ اُس پر جھپٹ کر اُس کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی کہ آپا آ گئیں۔ ایک تو وہ صورتِ حال سے بے خبر تھیں دوسری اتفاق سے دونوں کے درمیان آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''تم ابھی تک کھڑے ہو۔ بیٹھو چائے لو۔''

''یہ چائے اپنی بہن کو پلانا اور اُسے اچھی طرح سمجھا دو کہ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔'' وہ بدتمیزی کی حد کراس کر گیا اور آپا ہراساں ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟'' پھر پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ اپنا بیگ اُٹھاتے ہوئے بولی۔

''میں جا رہی ہوں آپا۔ آپ سے پھر بات کروں گی۔'' وہ تیزی سے جانے لگی کہ جابر نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔

''آپا منع کریں اسے۔'' وہ چیخی۔

''جو بات ہے ابھی کرو۔ بعد میں کیا بات کرو گی۔''

''تم سے مطلب اور تم ہوتے کون ہو۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

''ہاں جانتی ہوں کہ انتہائی درجے کے لوفر، آوارہ اور کمینے ہو۔'' وہ ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے بولی۔ تو آپا اُسے ٹوکنے لگیں۔

''عائشہ! یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں اور آپ پٹہ ڈال کر رکھیے اس لوفر کے گلے میں۔ آئندہ اگر میرے راستے میں آیا تو منہ توڑ کر رکھ دوں گی اس کا۔'' وہ زہرخند سے کہتے ہوئے جلدی سے باہر نکل آئی اور بجائے بس اسٹاپ تک جانے کے رکشہ روک کر اُس میں بیٹھ گئی۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کے پیچھے ضرور آئے گا اور وہ اب مزید اُس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔

گھر میں داخل ہوئی تو اماں کے پوچھنے سے پہلے ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ ابھی تک وہ غصے میں تھی اور دل ہی دل میں مسلسل جابر کو گالیاں دے کر بھڑاس نکال رہی تھی جب کسی حد تک پُرسکون ہوئی تو آپا کا خیال آ گیا اور اُن کے رویے نے جو دُکھ دیا تھا وہ نئے سرے سے اُسے اپنی گرفت میں لے گیا۔

''آپا۔ آپا۔'' اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپا اُس کا احسان مانیں۔ یا احسان کا بدلہ دیں لیکن یہ خواہش ضرور تھی کہ اُس کی قسمت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اُسے حوصلہ دیں کہ جابر کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں ہے پھر بھی تم کوشش کرنا کہ اُسے اچھا انسان بنا سکو۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے کتنے دھڑلے سے کہہ دیا تھا کہ وہ کبھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ گویا انہیں پرواہ ہی نہیں تھی۔ اُن کا اپنا گھر بچ گیا تھا۔ باقی کوئی جائے جہنم میں۔ انہیں اس سے کیا۔

''عائشہ!'' اماں اُس کے لیے چائے اور ڈسپرین لے کر آ گئیں۔'' اُٹھو چائے کے ساتھ یہ گولیاں لے لو۔ کیا سر میں درد ہے؟''

''ہاں۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھی اور اماں کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

''پانی لاؤں؟''

''نہیں اماں! چائے کے ساتھ ہی نگل لوں گی۔ آپ کوئی کام کر رہی تھیں۔''

''وہی روزمرہ کے کام ہوتے ہیں اور میں تو کہتی ہوں تم اب نوکری چھوڑ دو۔'' اماں کچھ تھکے تھکے انداز میں اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کیوں اماں؟''

''ہاں، کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی تمہاری منگنی ہوگئی ہے اور کیا پتا کب شادی کی بات چھڑ جائے۔'' اُس نے قصداً خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔ جب کہ اُس کے اندر جوار بھاٹا اُٹھنے لگا تھا۔ اماں کڑھتے ہوئے بولیں۔

''مجھے تمہاری بڑی فکر ہے۔ جتنا سوچا تھا تمہاری شادی دیکھ بھال کر کروں گی اتنا ہی بُرا ہوا اور یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔''

''میں کیا کرتی اماں۔ مجھ سے بڑی آپا کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔''

''اب تو خوش ہے نا وہ اور دیکھو پلٹ کر آئی بھی نہیں۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی یہی سوچ رہی تھی کہ میں ہی اُس کے پاس سے ہو آؤں۔'' پھر اُس سے پوچھنے لگیں۔ ''تم چلو گی۔''

''میں۔''

''ہاں۔ اب تو وہ الگ گھر میں ہے اور وہاں جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔'' اماں کے خیال میں وہ آپا کے سسرال جانے کا سمجھی تھی۔ اس لیے فوراً وضاحت کی تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''میں ابھی وہیں سے آ رہی ہوں اماں! بڑی آپا کے گھر سے۔'' اس کے ساتھ ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''ارے۔'' اماں حیران پریشان۔ ''کیا ہوا۔ بڑی نے کچھ کہا ہے۔''

''کیا نہیں کہا انہوں نے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کو کیا بتاؤں اماں کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بتاؤ تو۔''

''جس روز سے منگنی ہوئی ہے جابر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ راستہ چلنا دشوار ہوگیا ہے اور میں

آپا سے یہی کہنے گئی تھی کہ اُسے سمجھائیں۔ لیکن میری بات سننے سے پہلے ہی وہ اُس کی طرف داری میں لگ گئیں اور اماں، جابر وہاں بھی پہنچ گیا اور اُس نے میرے ساتھ اتنی بدتمیزی کی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یہ دیکھیں میرے منہ پر تھپڑ بھی مارا۔''

''کیا۔'' اماں کو جیسے کرنٹ چھو گیا۔ ''جابر نے تمہیں مارا۔ اُس کی اتنی جرأت ہوئی کیسے اور بڑی کہاں تھی۔ کیا اُس نے نہیں روکا۔''

''وہ چائے بنا رہی تھیں۔ اگر وہاں موجود ہوتیں تب بھی نہیں روک سکتی تھیں۔'' اُس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور اُسی کی طرح اماں کا بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالیں۔

''ایسا اندھیر مچا ہے۔ ابھی تو صرف منگنی ہوئی ہے شادی کے بعد پتا نہیں کیا کرے گا۔'' پھر اُس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''تو مت رو۔ تمہارے ابا آ جائیں پھر میں جا کر اُس کی خبر لیتی ہوں۔''

''لیکن اماں۔ بڑی آپا۔'' وہ اب بھی اُن کا خیال کرنے سے باز نہیں آئی۔

''بھاڑ میں جائے بڑی آپا۔ اُس کے لیے میں تمہیں کنویں میں دھکیل دوں۔ یہ تو انصاف نہ ہوا اور یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ خبردار جو تم کچھ بولیں۔'' اماں نے ساتھ ساتھ اُسے بھی ڈانٹ دیا۔ ''بس اب رونا بند کرو اور تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ جابر تمہارے پیچھے آتا ہے۔ میں اُسی وقت اُس کی ماں کے پاس جاتی۔''

''وہ۔'' اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''خیر اب بھی میں بڑھیا کو چھوڑوں گی نہیں ایسے آوارہ کے لیے.....'' اچانک بڑی آپا کو سامنے دیکھ کر اماں کی بات اُدھوری رہ گئی۔ یوں دبے پاؤں آئی تھیں بڑی آپا کہ اُسے بھی حیرت ہوئی اور فوراً اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اماں بھی حیران تھیں۔ اور جب حیرت سے نکلیں تو بغیر حال احوال پوچھے کہنے لگیں۔

''دیکھو بی بی اگر تم اپنے دیور کی طرف داری کرنے آئی ہو تو میں تمہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہوں گی۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ چلی جاؤں۔''

''بے شک چلی جاؤ۔'' اماں نے ذرا بھی مروت نہ برتی۔ تب وہ بول پڑی۔

''کیا کہہ رہی ہیں اماں آپ۔ بڑی آپا آپ بیٹھیں۔''

''تم بیٹھنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ پہلے اماں کو میرے خلاف بہکا دیا اور اب بیٹھنے کے لیے کہتی

ہو۔" آپا اُس پر بگڑنے لگیں۔ تو اماں نے ٹوک دیا۔

"تمہارے خلاف اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جابر کا کچا چٹھا کھول کر سنایا ہے۔"

"کیا کیا ہے اُس نے۔ ذرا سا اس سے بات ہی تو کی تھی کہ یہ اُس پر رُعب جمانے لگی۔ بھلا مرد بھی کہیں رُعب میں آتا ہے۔ اسے سوچنا چاہیے کہ وہ اس کا منگیتر ہے۔ کل کو اسی کے ساتھ شادی ہونی ہے۔"

"نہیں بڑی آپا۔" اماں سے پہلے ہی اُس نے فیصلہ سنا دیا۔ "جابر سے شادی کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں زہر کھا کر مر جاؤں۔"

"عائشہ۔" بڑی آپا کو اس جواب کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ گھبرا کر اماں کی طرف دیکھا تو وہ اطمینان سے بولیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے یہ۔ مجھے تو پہلے ہی یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ محض عائشہ کے کہنے پر ہامی بھری اور اسے بھی تمہارا خیال تھا۔ اور تم کیسی بہن ہو جو تمہیں اس کا خیال نہیں۔"

"کیسی بات کر رہی ہیں اماں۔ میں اس کا خیال کر کے ہی تو بھاگی آئی ہوں۔"

"نہیں۔ تم صرف اپنے لیے بھاگی آئی ہو۔ تمہیں اپنا گھر پیارا ہے اور اسے بچانے کے لیے تم عائشہ کی قربانی چاہتی ہو اور میں ماں ہوں۔ میرے لیے جیسی تم ہو ویسی یہ۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہارے گھر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے میں اس کے گلے پر چھری پھیر دوں۔ جاؤ کہہ دو اپنی ساس سے کہ یہ رشتہ ختم سمجھیں۔" اماں کے حتمی انداز پر آپا بوکھلا گئیں۔

"لیکن اماں! بغیر ابا سے بات کیے آپ کیسے یہ رشتہ ختم کر سکتی ہیں۔"

"اُن سے میں بات کر لوں گی۔ تم فکر مت کرو۔" اماں کا اطمینان بھرا انداز ہنوز برقرار تھا۔

آپا نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو اماں کی وجہ سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں لیکن یہ بھی سن لیں کہ اب مجھے گھر سے نکالا گیا تو میں یہاں نہیں آؤں گی۔" اپنی بات کہہ کر آپا فوراً چلی گئیں اور اماں کا سارا اطمینان رُخصت ہو گیا۔

اماں نے ساری بات ابا کو بتا دی اور وہ سن کر خاموش ہو رہے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اماں، ابا کو بڑی آپا کی فکر نہیں تھی۔ وہ اُن کی طرف سے خاصے پریشان اور فکرمند تھے کہ جانے اب اُن کے سسرال والے اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اور اُن کی فکر اپنی جگہ، البتہ عائشہ کی طرف سے انہیں

قدرے اطمینان ہو گیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ محض اس کے کہنے پر ہی ہامی بھری گئی تھی۔ اور اب تو اماں نے اُسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ بڑی کا معاملہ وہ خود ہی نمٹا لیں گے۔ تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُسے واقعی بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بڑی آپا کی طرف سے اُسے مسلسل دھڑکا لگا ہوا تھا اور ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ بڑی آپا نے اپنی ساس سے رشتہ توڑنے کی بات کی بھی ہے، یا نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ کو کافی دن ہو گئے تھے اور اُن کی طرف سے کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا اور اسی سے اُس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اُس تک رشتہ ٹوٹنے کی بات پہنچ چکی ہے جب ہی اُس نے پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ ادھر اماں بھی روز اُس سے جابر کی بابت ضرور پوچھتی تھیں کہ وہ آیا تو نہیں تھا اور نفی میں جواب سن کر مطمئن ہو جاتیں۔ اُس روز وہ باقاعدہ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"شکر ہے جابر سے جان چھوٹی اور اب تو مجھے بڑی کی طرف سے بھی اطمینان ہونے لگا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنے گھر میں سیٹ ہو گئی ہے۔ میں اُس کے پاس جانا تو چاہتی ہوں لیکن تمہارے ابا منع کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"اُن کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ ہو سکتا ہے میرے جانے سے پھر سے کوئی بات شروع ہو جائے۔ جب تک تمہاری کہیں بات نہ لگ جائے، ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔"

پھر بڑی رازداری سے اُس سے پوچھنے لگیں۔

"سنو! وہ جو ایک بڑی بیگم آئی تھیں اپنے لڑکے کا رشتہ لے کر، کیا نام تھا اُس کا۔ ہاں حماد۔ کیا اُس کی شادی ہو گئی۔"

"پتا نہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"ذرا پتا تو کرو۔ تمہارے ہی دفتر میں ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن میں کیوں پتا کروں۔" اُسے اب یہ ذکر بڑا عجیب سا لگا۔ "جب ایک بار منع کر دیا تو بس منع کر دیا۔"

"اچھا بھلا رشتہ گنوا دیا۔ مجھے تو وہ عورت بہت بھلی لگی تھی اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ بڑی بہن کی ہمدرد بن گئی تھی۔ دیکھا اُس نے کیا صلہ دیا۔" اماں تاسف کا اظہار کرنے کے بعد اُسے بھی بُرا بھلا کہنے لگیں۔ تو وہ اُکتا کر بولی۔

''بس کریں اماں جو ہو گیا سو ہو گیا۔''

''ہاں جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا۔ پتا نہیں یہ نامراد جابر کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا تھا۔''

اور یہ بات تو وہ بھی سوچتی تھی کہ جب منزل دو گام ہی رہ گئی تھی تو جابر کیوں کر آ گیا تھا۔ اور اماں تو شاید یونہی ایک بات کہہ رہی تھیں کہ انہیں ساری زندگی افسوس رہے گا جب کہ اپنے بارے میں اُسے یقین تھا کہ وہ اس کسک کو ہمیشہ محسوس کرتی رہے گی۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ ہمیشہ سے حقائق کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی اور دل سے تسلیم کرتی تھی جبھی خود کو یہ فریب بھی نہیں دے سکی کہ حماد حسن دوبارہ اُس سے رُجوع کرے گا۔ اُس کے خیال میں یقیناً اُس کی انا آڑے آئے گی۔ بہرحال ابھی وہ جابر سے چھٹکارا مل جانے سے خود کو مطمئن کرنے کے مرحلے میں تھی کہ اُس روز وہ پھر اُس کے راستے میں آ گیا۔ اور اب کیونکہ مروت و لحاظ والی بات نہیں تھی اس لیے اُسے دیکھتے ہی اُس نے اپنی پیشانی پر شکنیں ڈال لیں اور کچھ نخوت بھرے انداز میں منہ بھی موڑ گئی۔

''کب تک منہ موڑو گی۔'' وہ ڈھٹائی سے اُس کے برابر آ کھڑا ہوا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دل تو چاہا کھری کھری سنا دے لیکن وہ اُس کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی۔

''ارے۔'' وہ اُس کی طرف بڑھا۔ ''اتنی ناراضگی اچھی نہیں ہوتی۔ چلو معاف کر دو۔ ویسے میں نے آج تک کسی سے معافی مانگی نہیں ہے۔''

وہ اُس کی طرف سے یوں انجان بن گئی جیسے وہ اُس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو۔

''اچھا ایک خوشخبری سنو۔'' وہ اُس کے رویے سے ذرا مایوس نہیں ہوا۔ ''اب تو تمہارا میرا لمبا ساتھ رہے گا کیونکہ مجھے نوکری مل گئی ہے اور میرا دفتر تمہارے دفتر کے سامنے ہی ہے۔''

''کیا۔'' اُس نے وحشت زدہ ہو کر اُسے دیکھا۔ تو وہ ہنس کر بولا۔

''دیکھا کیسی خبر سنائی ہے۔ اچھا دیکھو، بس آ رہی ہے۔ آؤ اسی میں چلتے ہیں۔''

''تم جاؤ۔''

''اور تم؟''

''تمہیں مجھ سے مطلب۔ میں جاؤں، یا نہ جاؤں۔''

''ارے واہ! میں نے نوکری کی ہی اسی لی ہے کہ تمہارے ساتھ آ جا سکوں۔ چلو آؤ۔'' وہ باقاعدہ اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً ایک طرف ہٹی اور پھر اسی طرف چل پڑی۔ وہ بھی پیچھے

چلا آیا۔

''کیا اتنی دُور پیدل جاؤ گی؟''

''تمہیں اس سے کیا۔'' وہ آخر کہاں تک ضبط کرتی۔ چیخ پڑی۔ ''اپنا راستہ لو۔ اگر میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہو گا۔''

''کیا اچھا نہیں ہو گا۔'' وہ پھر بدتمیزی پر اُتر رہا تھا کہ وہ قریب سے گزرتے رکشہ کو روک کر جلدی سے اُس میں بیٹھ گئی۔ یہ نئی صورت حال اُسے پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ یقیناً واپسی میں اُسے اماں کو بتانا تھا لیکن ابھی تو وہ خود سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ آخر اُسے اس پریشانی سے نجات کا ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ وہ یہ جاب چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ روزانہ اس قسم کی صورت حال برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے سوچا اگر اُسے جاب کرنی ہوئی تو وہ کسی اور جگہ کوشش کر دیکھے گی۔ پھر یہاں کے قاعدہ کے مطابق جاب چھوڑنے سے ایک ماہ قبل نوٹس دینا ضروری تھا اور وہ اسی وقت نوٹس لکھنے لگی کیونکہ اُس کے خیال میں ایک ماہ بھی بہت تھا۔ اتنا عرصہ کسی نہ کسی طرح جابر کی حرکتیں برداشت کرے گی۔ اور اس دوران وہ دوسری جگہوں پر بھی اپلائی کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے جب وہ یہاں سے نکلے تو کوئی دوسری جگہ اُس کی منتظر ہو۔

اُس نے پیپر تہ کر کے ایک لفافے میں ڈالا اور اسی وقت حماد حسن کو دینے کی غرض سے اُس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھا۔ ایک نظر اُس پر ڈال کر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ مصروف ہو گیا۔ تو اُس نے بیٹھتے ہی لفافہ اس کی ٹیبل پر رکھ دیا اور اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

''جی۔'' قدرے تاخیر سے وہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ تو اُس نے لفافے کی طرف اشارہ کر دیا۔

''کیا ہے یہ۔'' اُس نے لفافہ اُٹھایا اور اس میں سے پیپر نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر اسی طرح اُس پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ کی شادی ہونے والی ہے۔'' وہ اس غیر متوقع اور فضول سے سوال پر حیران ہوئی۔

''نہیں۔''

''پھر کیوں جاب چھوڑ رہی ہیں؟'' اب اُس کے سوال کا مطلب سمجھ میں آیا تو اس سوال کا جواب نہیں سوجھا۔

''کیا کوئی اور اچھی جاب مل گئی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''میری اپنی کچھ پرابلمز ہیں۔'' وہ سر جھکاتے ہوئے بولی اور وہ اُسے دیکھے گیا۔ خاموش یوں تھا کہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اُس سے اُس کی پرابلمز پوچھنی چاہئیں، یا نہیں۔

''میں جاؤں؟'' اُس نے ایک لمحے کو سر اُٹھا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بے اختیار کہہ گیا۔ پھر جواز کے طور پر بولا۔ ''میرا مطلب ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی پرابلم بتائیں۔ ہو سکتا ہے......''

''آئی ایم سوری۔'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''بس آپ اس پر سائن کر دیجیے۔ میں جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔''

''یہ جاب۔'' اُس کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔ پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''کیا میری ذات آپ کے لیے پرابلم ہے۔''

''نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

''پلیز بیٹھ جائیں۔''

''اگر آپ کو کوئی کام ہے تو میں بیٹھ جاتی ہوں ورنہ مجھے جانے دیں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب تک یہاں بیٹھوں گی آپ میری پرابلم سمجھنے کی کوشش میں اُلجھتے رہیں گے۔''

''اور آپ بتائیں گی نہیں۔''

''ہاں۔ میں بتاؤں گی نہیں۔''

اُس کی صاف گوئی پر وہ قصداً مسکرایا۔

''او کے آپ جائیں۔''

''تھینک یو۔'' وہ اُس کے کمرے سے نکل آئی اور پتا نہیں اُس نے کیسے یہ سوچ لیا تھا کہ اُس کے سامنے سے ہٹ جائے گی تو وہ اُس کے بارے میں سوچے گا نہیں۔ اُلجھے گا نہیں۔ اور اُس کے ایسا سمجھنے پر وہ بھی حیران ہوتا رہا تھا۔ افسوس بھی ہوا کہ وہ کتنی جلدی اجنبی بن گئی تھی۔ کاش وہ جان لیتا کہ اجنبیت کا لبادہ اُس نے قصداً اوڑھا تھا۔ کیونکہ وہ خود غرض نہیں تھی بلکہ اُس کے پیش نظر اُس کی ذات تھی کہ وہ اُس کی محبت کا روگ لے کر ایک عرصہ جوگ میں نہ گزار دے بلکہ اپنی مما کی خواہش کے مطابق جلد اپنا گھر بسا لے۔ اور یہ اسی صورت ممکن تھا کہ وہ اُسے اپنی محبت سے آزاد کر

دیتی۔ گو کہ یہ آسان نہیں تھا لیکن وہ کیا کرتی۔

اُس شام آفس سے واپسی پر وہ گھر میں داخل ہوئی تو نئی صورت حال منتظر تھی۔ یعنی آپا کے ساس سسر باقاعدہ شادی کی تاریخ لینے آئے ہوئے تھے گو کہ اُسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ بس اُن کی آمد پر ہی حیران ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی اماں اُس کے پیچھے آ کر کہنے لگیں۔

''سنو، ذرا چائے بنا دینا۔''

''اماں۔'' اُس نے اماں کو عجلت میں جاتے دیکھ کر روک لیا۔ ''کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟''

''شادی کی تاریخ لینے۔'' اماں یوں بولیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جب کہ وہ ٹھٹکی گئی۔

''کیا۔ لیکن اماں آپ نے تو بڑی آپا کے ذریعے منع کروا بھیجا تھا۔''

''ہاں لیکن تمہاری بڑی آپا نے اُن تک بات نہیں پہنچائی۔ خیر اب میں خود منع کر دوں گی۔''

اماں کا اطمینان ظاہر کر رہا تھا جیسے اُن کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، یا پھر وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھیں۔ اگر اُسے آپا کا خیال نہ ہوتا تو اماں کا اطمینان دیکھ کر وہ بھی اطمینان سے ہو جاتی۔ لیکن پتا نہیں کیوں آپا کی خود غرضی دیکھنے کے باوجود وہ اُن کے لیے اپنے دل میں کدورت نہیں رکھ سکی تھی۔ اُن کے رویے سے دُکھ ضرور تھا پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی مشکل میں پڑیں۔

''آرام سے بات کیجیے گا اماں۔ ایسا نہ ہو وہ آپا کے ساتھ......'' اماں اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے چلی گئیں تو وہ کچھ سہمی ہوئی سی کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ یہاں سے اماں کا کمرہ قریب تھا اور آواز تو آ رہی تھی لیکن کوئی واضح بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ کوشش کرتی تو باتیں بھی سمجھ لیتی لیکن اُس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اُس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا کہ اتنے دنوں بعد صبح جابر کا آنا اور اس وقت اُس کے ماں باپ کی آمد اور وہ یہی سوچ رہی تھی کہ یقیناً اسی نے انہیں بھیجا ہو گا۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ چائے لے کر اندر آئی تو آپا کی ساس اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''بیٹھو عائشہ! اور ہمیں بتاؤ کہ جابر نے تمہارے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے۔''

''جی۔'' اُن کی بات پر حیران ہو کر اُس نے اماں کو دیکھا۔ تو وہ کہنے لگیں۔

''ہاں بیٹھ جاؤ۔ میری بات پر تو انہیں یقین نہیں ہے۔ تم ہی بتاؤ۔''

''میں کیا بتاؤں۔ اپنے بیٹے کے کرتوتوں کو یہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیسے کہہ

گئی اور غلط بھی نہیں کہا جب کہ آپا کی ساس کے پتنگے لگ گئے۔

''ٹھیک کہتی ہو بی بی۔ ہم صرف اپنے بیٹے کو نہیں تمہیں بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ سارا دن گھر سے باہر کیا کرتی پھرتی ہو، یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔'' وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی جب کہ وہ براہِ راست اُس کی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میرا بیٹا تو پھر مرد ہے۔ مردوں کے عیب کون دیکھتا ہے اور یہ تو ہماری شرافت ہے کہ تمہارے اتنے قصے سننے کے باوجود بھی چلے آئے۔ اور یہ سن لو کہ یہاں سے بات ختم کی تو ساری عمر کنواری بیٹھی رہ جاؤ گی۔''

''عائشہ تم جاؤ۔'' اماں نے اُسے دھکیل دیا۔ اور اپنے کمرے میں آ کر لاکھ اُس نے اپنے کان بند کیے لیکن آوازوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ اماں کے کمرے میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو چکی تھی اور دونوں سمدھنیں چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔ اُس نے گھٹنوں میں سر چھپایا تو آنسو بے اختیار چھلک پڑے تھے۔

ابھی اور پتا نہیں کتنی دیر تک لڑائی جاری رہتی کہ آپا کے سسر درمیان میں آ گئے اور اپنی بیوی کو زبردستی گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ جاتے جاتے بھی اُس نے سنا وہ اماں کو دھمکیاں دیتے ہوئے جا رہی تھیں۔ پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ تو وہ انتظار کرنے لگی کہ اماں اُس کے پاس آئیں گی لیکن وہ نہیں آئیں اور وہ خود سے اُن کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر سکی تو تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ گو کہ اُس کا قصور نہیں تھا لیکن اُسے یہ خیال تھا کہ یہ سب اُس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور آئندہ جانے کیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ آپا کا خیال بھی تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اب پتا نہیں جابر کس روپ میں سامنے آئے کیونکہ اُس جیسے بندے سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس بات کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے جانے کیا کر ڈالے۔

رات کے کھانے کے لیے اماں نے اُسے بلایا نہیں بلکہ کھانا لے کر اُس کے پاس آ گئیں۔ غالباً انہیں یقین تھا کہ بلانے پر وہ منع کر دے گی۔ اس لیے پہلے سے ہی لے آئیں۔

''اُٹھو عائشہ کھانا کھا لو۔'' اماں کا وہی لہجہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن اُن کے ہاتھ میں کھانا دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

''تم کاہے کو روتی ہو؟'' اُس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اماں نے فوراً ٹوکا۔ پھر اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''تمہیں دل پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ یہ سب ہوگا۔ بہرحال تم فکر مت کرو۔ کھانا کھاؤ۔''

''آپ نے کھا لیا؟''

''ہاں، تمہارے ابا کے لیے نکالا تو میں نے بھی کھا لیا۔'' پھر کچھ دیر رک کر بولیں۔ ''تمہارے ابا کہہ رہے ہیں، نوکری چھوڑ دو اور میرا خیال ہے ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میں نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی نوٹس دے دیا ہے۔'' اُس نے کہا اور پھر انہیں ساری بات بتائی کہ صبح جابر پھر راستے میں آیا تھا اور اُس کے پریشان کرنے پر ہی اُس نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ آخر میں کہنے لگی۔

''میرے اختیار میں ہو تو میں کل سے ہی نہ جاؤں۔ لیکن یہ ایک مہینہ مجھے کام کرنا ہے اور اماں میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے جاؤں گی، آؤں گی۔''

''کیوں؟''

''وہ جابر۔''

''کیا کرے گا وہ۔ تم یہ مت سمجھو کہ ہم اُس کی وجہ سے تمہیں نوکری چھوڑنے کو کہہ رہے ہیں۔ تم آرام سے جاؤ آؤ لیکن اب اُس کے منہ مت لگنا۔''

''آپ کو نہیں پتا اماں! وہ بہت بدتمیز ہے۔''

''مجھے پتا ہے بلکہ میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ بہرحال اب تمہارے راستے میں آئے تو بتانا۔ میں عارف کو بلا کر اُس سے کہوں گی۔''

اماں اُسے تسلی دے کر جانے لگیں تو اُس نے پوچھ لیا۔

''اماں! آپ کو بڑی آپا کی فکر نہیں ہے۔''

''فکر کیوں نہیں ہے۔ وہ بھی میری بیٹی ہے اور میں اُس کے لیے سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ مالک ہے۔'' پھر جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگیں۔ ''چائے پیؤ گی؟''

''نہیں۔ اگر خواہش ہوئی تو خود بنا لوں گی۔''

اماں چلی گئیں تو اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ اُسے بھوک بالکل نہیں تھی۔ بس اماں کی خاطر کھا رہی تھی۔

اُسے یقین تھا کہ اب جابر اسے پہلے سے زیادہ پریشان کرے گا۔ گو کہ چار پانچ روز سے وہ نظر نہیں آیا تھا پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ کسی طرح بھی یہ سوچ کر خود کو اطمینان نہیں دے سکی کہ ہو سکتا ہے اب باقاعدہ رشتہ ختم ہونے کے بعد اُس نے راستہ بدل لیا ہو۔ اس کے برعکس مسلسل دھڑکا لگا

رہتا کہ جانے کس وقت وہ اچانک سامنے آ جائے۔ صبح جاتے ہوئے وہ ابا کے ساتھ نکلنے لگی البتہ واپسی میں اکیلی ہوتی تھی۔ اور کیونکہ جابر نے بتایا تھا کہ اُس کا دفتر بھی کہیں آس پاس ہے اس لیے اندر سے خوفزدہ ہونے کے ساتھ بہت محتاط بھی رہتی۔ جب تک اسٹاپ پر کھڑی رہتی، کن اکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیتی رہتی۔ کیونکہ گھر کی نسبت یہاں اُسے اپنی پوزیشن خراب ہونے کا خطرہ زیادہ تھا۔ کہ ایسا نہ ہو کسی وقت جابر زبردستی اُس سے بات کر رہا ہو اور حماد حسن، یا آفس کا کوئی دوسرا بندہ دیکھ لے۔ ایسی صورت حال کا تصور ہی اُسے دہلا دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ گھر جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ملازم سامنے آ گیا۔

''مس! آپ کو سر بلا رہے ہیں۔'' اُس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور حماد حسن کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ اُسے دیکھ کر بولا۔

''آپ جا رہی تھیں؟''

''جی۔ کوئی کام؟''

''نہیں۔''

''پھر میں جاؤں؟''

''ہاں! لیکن یہ صاحب آپ کے لیے بیٹھے ہیں۔'' اُس نے اپنے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اُسے کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا احساس ہوا اور جابر پر نظر پڑتے ہی وہ خطرناک حد تک زرد پڑ گئی۔ اُس کے بارے میں اُس نے ہر پہلو سے سوچا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے لیکن یہ خیال چھو کر بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ آفس کے اندر تک آنے کی جرأت کر جائے گا۔ اور اُس کی اس جرأت نے اُسے اس حد تک کمزور بنا دیا تھا کہ نہ ایک قدم آگے بڑھ سکی نہ واپس پلٹ سکی۔ اور حماد حسن اُسے جابر کی طرف متوجہ کر کے خود جیسے قصداً کسی کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

''آؤ بھئی۔'' جابر نے مکاری سے اُسے دیکھا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، چلتے ہیں۔ میں اسی لیے آیا تھا کہ تمہاری بھی چھٹی ہو گئی ہو گی۔ ساتھ چلیں گے۔''

''نہیں۔'' اُس کے منہ سے آواز نہیں نکلی تو نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس وقت حماد حسن نے سر اُونچا کر کے اُسے دیکھا۔ وہ بے حد خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے مس عائشہ؟''

''سر یہ۔'' وہ اسی قدر کہہ سکی۔

''ہاں۔ کون ہیں یہ؟''

''آئی ڈونٹ نو۔ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔''

''رئیلی۔'' وہ حیران ہوا اور جابر کی طرف دیکھا۔ تو وہ ڈھٹائی سے دانت نکال کر بولا۔

''یہ مذاق کر رہی ہے۔''

''میں بالکل مذاق نہیں کر رہی۔ میں اسے نہیں جانتی۔'' اور ضبط کرتے بھی رو پڑی۔ تو حماد حسن کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں جابر کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس سے بولا۔

''آپ جا سکتے ہیں۔''

''اسے بھی لے جاؤں نا؟''

''نہیں۔'' اُس کے لہجے میں اچانک سختی آ گئی۔

''لیکن سر جی! میں اُس کا۔''

''اگر آپ اُن کے رشتے دار ہیں تو گھر جا کر بات کیجیے گا۔ یہاں میں اجازت نہیں دے سکتا۔'' اس کے ساتھ ہی اُس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو جابر جاتے جاتے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔''

''بیٹھیں عائشہ!'' اُس کے جانے کے بعد وہ اُسے مخاطب کر کے بولا۔ تو وہ بیٹھتے ہی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی لیکن اِدھر آنکھیں صاف کرتی اُدھر پھر آنسو چھلک پڑتے۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ اتنی بزدل بھی ہو سکتی ہیں۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔

''بھئی، جب اپنے لیے مشکلات کھڑی کرتی ہیں تو اُن کا مقابلہ کرنا بھی سیکھیں۔ ویسے کون تھے یہ حضرت؟''

''میں نے کہا نا میں نہیں جانتی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''لیکن عائشہ! اس طرح تو کوئی بھی دعوی دار بن کر نہیں آ جاتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟'' وہ اُس کی سرخی مائل آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور کندھے اُچکا کر بولا۔

''کچھ نہیں، چلیے آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔''

''آپ۔''

''مجبوری ہے۔ کیونکہ وہ صاحب باہر آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اگر آپ اُن کے ساتھ جانا چاہتی ہیں تو.....''

''نہ اُس کے ساتھ نہ آپ کے ساتھ۔ میں خود جا سکتی ہوں۔''

وہ تیز لہجہ میں کہہ کر جلدی سے باہر نکل آئی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حماد حسن کسی بھی طرح اُس سے جابر کے بارے میں سچ اُگلوانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کے برعکس وہ اُس پر یہی ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ جابر کو نہیں جانتی۔ اس لیے فوراً باہر نکل آئی اور باہر جابر موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر اتنی عیاری سے ہنسا کہ وہ بُری طرح سلگ گئی اور دل ہی دل میں اُسے گالیاں دیتے ہوئے سواری کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''رکشا روکوں؟'' وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ اور وہ اگر اس وقت آفس کے سامنے نہ کھڑی ہوتی تو سچ مچ اُس کا حشر خراب کر دیتی، کیونکہ غصے سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بمشکل خود کو بولنے سے باز رکھتے ہوئے دُور کھڑے رکشہ کی طرف تیز قدموں سے چل پڑی۔ پیچھے وہ بھی تھا لیکن اُس نے پروا نہیں اور جلدی سے رکشے میں بیٹھ کر اُسے چلنے کے لیے کہا۔ راستے بھر تو یہی سوچتی آئی تھی کہ جاتے ہی اماں سے کہے گی۔ لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی ارادہ ملتوی کر دیا محض اس خیال سے کہ اب کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔ پھر آگے چھوٹی آپا بھی آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے چھوٹتے ہی اُسے منگنی ختم ہو جانے کی مبارک باد دی۔ تو وہ بے ساختہ مسکرائی اور اُن کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

''منگنی کی مبارک باد تو سنی تھی لیکن منگنی ٹوٹنے کی مبارک باد پہلی بار سن رہی ہوں۔''

''سچ بتاؤ۔ خوشی کون سی مبارک باد پر ہوئی؟''

''ابھی جو آپ نے دی۔'' اُس کی مسکراہٹ ہنسی کا روپ دھار گئی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ''اماں کہاں ہیں؟''

''اماں اور ابا دونوں بڑی آپا کی طرف گئے ہیں۔''

''کیوں؟'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ ''انہوں نے بلایا ہے یا......؟''

''خود سے گئے ہیں اور اب تفصیل مت پوچھنے بیٹھ جانا۔ پہلے جا کر منہ ہاتھ دھوؤ پھر یا گڈو کو پکڑو یا چائے بناؤ۔ میں کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

''ارے تو آپ چائے پی لیتیں۔''

''بناتی کیسے۔ یہ گڈو گود سے اُتر ہی نہیں رہا۔''

''آپ نے اس کی عادت خراب کر دی ہے۔ خیر میں بناتی ہوں۔''

وہ اُٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی۔ چائے بناتے ہوئے اُس کا دھیان اماں، ابا کی

طرف چلا گیا کہ وہ بڑی آپا کے گھر کیوں گئے ہیں۔ کیا پھر کوئی بات ہو گئی ہے۔ اُس روز اماں اور بڑی آپا کی ساس کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اُسے سوچ کر اُس کے اندر تلخی بھر گئی اور اُس کے خیال میں اس کے بعد پھر کسی بات کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے چائے لے کر چھوٹی آپا کے پاس آئی تو بیٹھتے ہی بولی۔

''ہاں اب بتائیے، اماں، ابا وہاں کیوں گئے ہیں؟''

''اس رشتے کو دوبارہ جوڑنے۔'' چھوٹی آپا نے یونہی چھیڑا۔ لیکن وہ اُچھل پڑی۔

''کیا......؟''

''پاگل ہو تم۔ اگر ایسی بات ہوتی تو پہلے میں تمہیں مبارک باد کیوں دیتی؟''

''آپ بھی عجیب ہیں۔ مجھے ڈرا کے رکھ دیا۔''

''اگر ایسی ہی ڈرنے والی بات ہے تو پہلے ہامی کیوں بھری تھی؟''

''چھوڑیں اس پرانے قصے کو۔ آپ ابھی کی بات کریں۔'' وہ چھوٹی آپا کے خواہ مخواہ بات کو طول دینے پر اُلجھ کر بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس اماں کا دل چاہ رہا تھا بڑی آپا سے ملنے کو۔ اور وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں کہ منگنی توڑنے سے اُن پر تو کوئی بات نہیں آئی۔

''ہاں چھوٹی آپا! میں خود آپا کی طرف سے پریشان ہوں۔ اچھا ہوا جو اماں، ابا چلے گئے۔''

''اور میرا خیال ہے اب کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ پہلے عارف بھائی اپنے اماں، ابا کے دباؤ میں تھے جب کہ اب آزاد ہیں اور جب مرد الگ سے بیوی بچوں کی ذمہ داری سمجھنے لگتا ہے تو پھر ہر قدم سوچ کر اُٹھاتا ہے۔''

چھوٹی آپا اُسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''تمہیں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے بھی یہ تمہارا مسئلہ نہیں تھا اور اب بھی میں یہی کہوں گی کہ خواہ مخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔''

''چلیے۔ میں ہلکان نہیں ہوتی۔ یہ بتائیے اماں کھانے کے بارے میں کیا کہہ کر گئی ہیں؟'' اُس نے سہولت سے موضوع بدل دیا۔

چھوٹی آپا نے ٹھیک کہا تھا کہ اب عارف بھائی کسی کے دباؤ میں نہیں ہیں۔ اس لیے سوچ کر ہی کوئی قدم اُٹھائیں گے۔ اُن کے والدین کی کوشش یہ تھی کہ وہ آپا کے ساتھ پھر وہی سلوک کریں لیکن عارف بھائی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے بلکہ جس روز اماں، ابا اُن کے گھر گئے انہوں نے اپنے

بھائی کے غلط رویے کی معافی بھی مانگی۔ اور اماں، ابا کے لیے یہی بہت تھا کہ اُن کی بیٹی اپنے گھر میں آباد و خوش رہے۔ بہر حال اُسے بھی آپا کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا اور اپنی طرف سے اُس کے خیال میں بس چند دن کی پریشانی تھی۔ پھر وہ جاب چھوڑ کر اطمینان سے گھر بیٹھ جائے گی۔ جابر کا خوف بھی نہیں رہے گا۔ جو اب ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روزانہ جب وہ آفس سے نکلتی وہ اُس کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ شروع کے چند دن اُس کا انداز دل لگی اور دل جوئی والا تھا جیسے وہ کسی معمولی بات پر خفا ہو اور دل جوئی کرنے پر مان جائے گی۔ جب کہ اُس نے اُس کے منہ نہ لگنے کی قسم کھائی تھی۔ اُس کی باتوں پر خواہ کتنا ہی دل جلتا، یا غصہ آتا لیکن وہ ضبط سے کھڑی رہتی۔ بظاہر بڑے سکون سے اپنی بس کا انتظار کرتی اور پھر اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ بھی اُس کے پیچھے آئے گا، بس میں سوار ہو جاتی۔ اور شروع کے چند دن ہی یہ سلسلہ رہا اس کے بعد وہ باقاعدہ دھمکیوں پر اُتر آیا۔ اور وہ اُس کی دھمکیوں سے تو زیادہ مرعوب نہیں ہوئی۔

لیکن اُس روز جب اُس کے ساتھ اُسی کی قماش کے تین چار لڑکوں کو دیکھا تو سچ مچ بے حد خوفزدہ ہو گئی۔ گو کہ خاصی مصروف شاہراہ تھی لیکن ان دنوں شہر کے جو حالات تھے ان کے پیش نظر اُس سے ہر بات کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ ویسے بھی ایسے حالات میں لوگ اپنی ذاتی دشمنیوں کا بدلہ بڑی آسانی سے لے کر بچ نکلتے ہیں۔ وہ اُس کے چہرے اور ساتھ دوسرے آوارہ لڑکوں کو دیکھ کر ہی بھانپ گئی کہ اُس کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں۔ اس لیے بجائے بس کا انتظار کرنے کے رکشہ ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔ اُسی وقت حماد حسن آفس سے نکل کر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ نظر اُس پر پڑی۔ وہ بے حد پریشان کھڑی تھی۔ پھر اس سے قدرے فاصلے پر جابر کو دیکھ کر اُسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تو فوراً گاڑی اُس کے قریب لے آیا۔

''آ جاؤ عائشہ!'' وہی انداز تھا اور وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر فوراً بیٹھ گئی۔

''آخر کون ہے وہ جو اس طرح تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے؟'' وہ کافی دُور آ کر پوچھنے لگا۔ اور اُس کا وہی جواب تھا۔

''میں نہیں جانتی۔''

''جب جانتی نہیں ہو تو پھر اس کی بدتمیزیاں کیوں برداشت کر رہی ہو۔ اپنے گھر والوں سے کہو، یا پھر مجھے اجازت دو۔ میں اس کا علاج کروں۔''

''نہیں۔''

''کیا نہیں؟''

''میرا مطلب ہے، اب تو بس چار پانچ روز کی بات ہے پھر تو میں آفس چھوڑ دوں گی۔''

''اوہ!'' اُس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر اُس کی بات سے قیاس کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے تم اسی کی وجہ سے جاب چھوڑ رہی ہو۔''

''نہیں۔''

''کم آن عائشہ! یا خود سچ بولو یا میرے سچ کو تسلیم کرو۔'' وہ واقعی جھنجھلا گیا۔

''چھوڑیں حماد حسن! آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں سچ بولوں، یا جھوٹ۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب اپنے آپ سے پوچھیں اور پلیز یہاں گاڑی روک دیں۔ میں چلی جاؤں گی۔''

''نہیں۔ میں تمہیں گھر تک چھوڑوں گا'' وہ حتمی انداز میں بولا۔ ''اور گھر بھی اُس وقت آئے گا جب تک تم اپنی بات کی وضاحت نہیں کرو گی۔''

''یہ اچھی زبردستی ہے۔'' وہ رُخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

''کچھ بھی کہو۔'' اُس نے بے نیازی سے کہہ کر اسپیڈ بڑھا دی۔ تو وہ انجانے راستوں کو دیکھ دیکھ کر اُلجھتی رہی۔ آخر رہا نہیں گیا تو زچ ہو کر بولی۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''مجھ سے سچ بولو۔''

''کیوں۔ میرا آپ سے ناتا ہی کیا ہے جو سچ بولوں؟''

''کوئی ناتا نہیں؟'' اُس کے لہجے میں گہرے دُکھ کا احساس اُس نے شدت سے اپنے دل پر محسوس کیا اور ہونٹوں تک آئے ''نہیں'' کو سختی سے روک دیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد عاجزی سے بولی۔

''پلیز حماد حسن! گھر چلیں۔''

''ہاں۔ گھر چلتے ہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''لیکن کم از کم یہ تو بتا دو کہ تم میری ہر بات کا جواب گول کیوں کر جاتی ہو۔''

''ایسے جواب سے خاموشی بہتر ہے جو......'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ تو وہ فوراً بولا۔

''اپنی بات پوری کرو۔''

''میں نہیں کر سکتی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔ پھر راستے پر نظر ڈال کر پوچھنے لگی۔ ''یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''گھر۔''

''لیکن یہ راستہ میرے گھر کی طرف نہیں جاتا۔''

''میرے گھر کی طرف تو جاتا ہے۔'' اُس کے اطمینان سے کہنے پر وہ چیخ پڑی۔

''مجھے کہیں نہیں جانا۔ بس یہیں اُتار دیں۔'' اور اُس پر نہ اُس کے چیخنے کا اثر ہوا اور نہ اس کے بعد عاجزی کا۔ گھر کے اندر آ کر گاڑی روکی۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا۔

''آؤ اندر چلو۔''

''نہیں۔'' اُس کے خفگی بھرے انداز میں جارحیت بھی تھی۔ جیسے اُس سے بُری طرح اُلجھنے لگے گی۔

''ٹھیک ہے پھر میں مما کو یہیں بلا لاتا ہوں۔''

''کیوں؟ میرا مطلب ہے۔'' اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ کئی بار مجھ سے کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے کیسے کہوں اور پتا نہیں تم میری بات کا یقین کرو گی بھی، یا نہیں۔'' وہ اپنی بات کہہ کر نیچے اُتر گیا۔ اور آ کر اُس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''پلیز، تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ۔ پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔'' وہ چپ چاپ اُتر کر اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ سیدھا اُسے مما کے بیڈ روم میں لے آیا اور دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی پکار کر بولا۔

''مما! عائشہ آپ سے ملنے آئی ہے۔''

''ارے!'' مما بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئیں تو وہ سلام کرتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔ جب کہ وہ وہیں سے واپس پلٹ گیا۔

''کیسی ہو بیٹا؟'' مما اُسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''جی۔ آپ کیسی ہیں؟ ابھی حماد صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''عجیب لڑکا ہے۔ اب جب کہ میں کافی بہتر ہو چکی ہوں تو تمہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا ہو گا کہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''جی!'' اُس نے بلاارادہ جی کہا۔ پھر کچھ جھجک کر پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟''

''بیٹا! میں چاہتی ہوں تم حماد کو سمجھاؤ۔ وہ میری بات تو نہیں مان رہا۔'' اُس کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگیں۔ ''میں اُس کی شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن اُس کا کہنا ہے کہ وہ تمہاری جگہ

کسی کو نہیں دے سکتا۔ یہ تو سب قسمت کے کھیل ہیں بیٹا۔ میں نے تو اُس سے یہاں تک کہا ہے کہ میں بار بار تمہارے دروازے پر جانے کے لیے تیار ہوں لیکن اُس نے بتایا تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ کیا واقعی؟''

''میرے خدا!'' اُس نے سر جھکا لیا۔ جسے وہ اعتراف سمجھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''اب اس صورت میں میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم ہی اُسے سمجھانے کی کوشش کرو۔'' اُسی وقت وہ چائے لے کر آ گیا اور کن انکھیوں سے اُسے دیکھ کر بولا۔

''مما! اس سے پوچھیں، یہ جاب کیوں چھوڑ رہی ہے۔''

''تم جاب چھوڑ رہی ہو؟'' پھر وہی سوال جو اُس نے کیا تھا۔ ''کیا شادی طے ہو گئی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''بس۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

''خیر، یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اور تمہیں اس سے کیا، یہ جاب کرے یا نہ کرے۔'' مما کے ٹوکنے پر وہ خاموش ہو رہا۔

اور وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے جلدی جلدی چائے ختم کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اب چلو گی آنٹی! بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''پھر آؤ گی؟''

''وعدہ نہیں کرتی۔''

''اچھی بات ہے۔ جاؤ حماد! چھوڑ آؤ عائشہ کو۔'' وہ کپ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تو وہ مما کو خدا حافظ کہہ کر اُس سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔

''کیوں ملنا چاہتی تھیں مما تم سے۔ میرا مطلب ہے کیا انہیں تم سے کوئی کام تھا۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''نہیں۔ بس ایسے ہی ملنا چاہتی تھیں۔''

''اچھا! لیکن مجھ سے تو روز تمہیں لانے کے لیے اصرار کرتی تھیں جیسے انہیں کوئی کام ہو۔''

''اور آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''بتایا تا کہ مجھے خدشہ تھا کہ تم یقین نہیں کرو گی اور تم میرے ساتھ جو رویہ چاہے اختیار کرو، جو چاہے مجھے سمجھو لیکن میں یہ ہرگز گوارا نہیں کروں گا کہ تم مجھے جھوٹا بھی سمجھو۔ اس لیے کہ میں نہ جھوٹ

بولتا ہوں اور نہ سننا پسند کرتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ تب قدرے توقف سے وہ کہنے لگا۔

"سنو! کل سے تم آفس مت آنا۔" وہ اب بھی خاموش رہی۔ تو وہ زچ ہو کر بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا عائشہ کہ تم مجھ سے خفا کیوں ہو۔ حالانکہ میں نے تو اس تمام عرصے میں تمہیں کوئی الزام بھی نہیں دیا۔ جو کہ میرا حق تھا۔ اور میں اپنے اس حق سے محض اس خیال سے دست بردار ہوا کہ تم خفا نہ ہو۔ لیکن پھر بھی تم خفا ہو۔"

"نہیں۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں خفا ہوں۔"

"تمہاری اجنبیت اور غیریت نے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "میرا خیال تھا ہمارے درمیان لاکھ نہ مٹنے والا فاصلہ حائل ہو پھر بھی ایک اَن دیکھی ڈور رہے گی جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہو گا اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔ لیکن تم نے تو ایک ہی جھٹکے میں اس ڈور کو توڑ ڈالا۔"

"اس ڈور کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ ورنہ جو الزام آپ نے مجھے نہیں دیا وہ کسی اور کے ہونٹوں پر آ کر مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیتا۔"

"ایک بات کا جواب اور دے دو۔" وہ گاڑی اُس کے گھر کے سامنے روکتے ہوئے بولا۔ تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اگر کبھی ایسا ہو کہ میرا دل تم سے ملنے کو مچلنے لگے اور میرے سمجھانے سے بھی نہ سمجھے تو میں کیا کروں؟"

بات کے اختتام پر وہ اُسے دیکھنے لگا۔ تو وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر نیچے اُتر آئی اور پھر اُس کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اسی وقت دروازہ کھول کر ابا باہر نکلے۔ انہیں دیکھ کر بس ایک پل کو اُس کا دل زور سے دھڑکا۔ پھر اُن کے قریب آ کر بولی۔

"ابا! یہ حماد حسن ہیں۔ آج راستے میں جابر اپنے دوستوں کے ساتھ مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اس لیے یہ خود مجھے چھوڑنے آئے ہیں۔"

اپنی بات کہہ کر وہ جلدی سے اندر آ گئی۔

"کتنی بار کہا ہے جب دیر سے آنا ہو تو بتا کر جایا کرو۔"

اماں اُسے دیکھتے ہی بولیں اور وہ کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔ خوفزدہ تو نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ حماد حسن کے ساتھ آنے پر پتا نہیں ابا کیا کہیں۔ اس لیے فوراً اُن کے سامنے

جاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔ کمرے سے نکلی تو کچن میں پناہ لی اور ابھی یہ جائزہ لے رہی تھی کہ رات کا کھانا پک چکا ہے، یا پکانا باقی ہے کہ اماں آ کر عجلت میں بولیں۔

"جلدی سے چائے بنا دو۔"

"کون آیا ہے؟" وہ بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔

"ہائیں!" اماں نے تعجب سے اُسے دیکھا۔ "تمہارے ساتھ ہی تو آیا ہے۔"

"کون؟ حماد حسن؟"

"ہاں وہی۔ جلدی سے چائے چڑھا دو اور ہاں وہ بتا رہا ہے جابر تمہارے دفتر آ گیا تھا۔ خیر، تمہارے ابا نے اُس سے کہہ دیا ہے کہ اب جابر سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ دیکھو اس لفافے میں نمکو ہو گی، وہ بھی پلیٹ میں نکال دو۔ میں اس سے کہتی ہوں اگر آئندہ جابر......"

بوکھلاہٹ میں اماں پتا نہیں کیا کیا کہے جا رہی تھیں جب کہ وہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے کبھی بھی معلوم ہو کہ اُس کی منگنی جابر سے ہوئی تھی۔ اس میں سراسر جابر کے لوفروں والے حلیے کو دخل تھا جواب بھی اُسے شرمندگی سے ہم کنار کر رہا تھا۔

چائے دم کر کے اُس نے ٹی پاٹ ٹرے میں رکھی اور پھر ٹرے اماں کو تھما کر خود وہیں بیٹھ گئی۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں حماد حسن کے ساتھ یہاں تک آئی۔ اُس شخص کے سامنے تھوڑا بہت بھرم تو رہنا ہی چاہیے تھا۔ اب پتا نہیں ابا اُس سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی اور اندر جب بات شروع ہوئی تو بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ گو کہ اُس نے خاص طور سے کوئی بات نہیں پوچھی تھی اور نہ ہی اماں ابا نے خاص طور سے کوئی بات بتائی پھر بھی وہ سب جان گیا۔ لیکن یہ نہیں جان پایا کہ عائشہ نے اُسے منگنی ٹوٹنے کا کیوں نہیں بتایا اور یہ بات وہ اُس سے ضرور پوچھنا چاہتا تھا۔ جب جانے لگا تو کچن میں اُسے بیٹھے دیکھ کر رُک کر قدرے اُونچی آواز میں بولا۔

"مس عائشہ! کل سے میری گاڑی آپ کو لینے آیا کرے گی۔"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ لیکن وہ ابا کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ راستے میں تو وہ منع کر رہا تھا کہ کل سے آفس نہ آئے پھر اب یہ کیا کہہ گیا ہے۔

اگلے دن وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر وہی خیال کہ اب تین چار روز کی تو بات ہے پھر تو گھر بیٹھنا ہی ہے۔ وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ ابا جا چکے تھے اور اماں کے پاس رات سے ایک ہی موضوع تھا جب کہ وہ انتہائی خجالت محسوس کر رہی تھی کہ پتا نہیں حماد حسن نے

اُس کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ کس دھڑلے سے وہ اُس کے بار بار پوچھنے پر بھی جابر کے بارے میں یہی کہتی رہی تھی کہ وہ اُسے نہیں جانتی۔

''دیکھو، گاڑی آ گئی ہے۔''

اماں ہارن کی آواز سن کر بولیں۔ تو وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر حماد حسن کو دیکھ کر وہ رُک گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اُسے رُکتے دیکھ کر سادگی سے بولا۔ تو وہ خود کو سرزنش کرتے ہوئے اُس کے برابر بیٹھ گئی۔

''کہاں چلیں؟''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''بھئی آفس سے تو تمہاری چھٹی ہوگئی۔'' وہ بڑے آرام سے بولا۔

''پھر آپ کیوں آئے ہیں؟''

''تم سے ملنے اور یہ پوچھنے کہ..........''

''کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ٹوک کر بولی۔ ''اس لیے کہ میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔''

''جواب تو تمہیں دینا پڑے گا اور وہ بھی ہر بات کا۔ اب نہ سہی چند دن بعد سہی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آج شام مما اپیل دائر کرنے تمہاری عدالت میں آ رہی ہیں اور چند دن بعد تمہیں میری عدالت میں حاضر ہونا ہوگا۔''

وہ اُس کا اشارہ سمجھ کر نروس ہوگئی۔ اور یہ غنیمت تھا کہ ابھی تک اُس نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی۔ اس لیے جلدی سے دروازہ کھول کر اُترنے لگی تو اُس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''سنو! کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم سارے سوال جواب ابھی کرلیں تاکہ نئی زندگی کی ابتدا پر ہمارے دلوں میں کوئی شبہ نہ ہو۔ بلکہ اس وقت ہم پوری سچائی اور ایمان داری سے ایک دوسرے کی محبت کا اعتراف کریں۔''

اُس نے ایک پل کو سوچا۔ پھر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔''

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو
تتلیوں کے، جگنوؤں کے
دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو
روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

''ویری گڈ سعدیہ! ویری گڈ بس طے ہوگیا، تمہیں فنکشن میں ضرور گانا ہے۔''

ندا اور حبیبہ نے سعدیہ کی خوب صورت آواز کو سراہتے ہوئے کہا۔ تو وہ آداب بجا لاتی ہوئی بولی۔

''تھینک یو۔ تھینک یو۔ لیکن میں فنکشن میں نہیں گا سکوں گی۔''

''کیوں؟'' ندا کے استفسار پر حبیبہ فوراً بولی تھی۔

''اترا گئی ہے۔''

''بائی گاڈ نہیں۔ اصل میں جس روز کالج میں فنکشن ہوگا اُس روز مجھے ملتان جانا ہے۔ اپنی کزن کی شادی میں۔'' سعدیہ کی مجبوری اُن دونوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے ملتان جانے کی۔ ہر تیسرے مہینے تمہاری کزن کی شادی ہوتی ہے۔ آخر کتنی کزنز ہیں تمہاری؟''

''ماشاء اللہ بہت ہیں۔''

''تو بہت سوں میں سے اگر ایک کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ندا نے کہا۔ وہ عاجزی سے بولی۔

''ہائے نہیں۔ تانیہ میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔ اگر میں نہیں جاؤں گی تو وہ بہت ناراض ہوگی۔ پھر میں یہاں اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔ سب گھر والے جا رہے ہیں۔''

''ہائے نہیں۔'' حبیبہ اُس کے انداز کی نقل اُتارتی ہوئی بولی۔ ''ایک تو تمہاری معصومیت ہمیں مار ڈالتی ہے۔''

''اُف دو بج گئے۔ میری گاڑی آ گئی ہوگی۔'' معاً سعدیہ کی نظر گھڑی پر پڑی تو فوراً اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''کل تو آؤ گی نا؟'' ندا کے پوچھنے پر اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر خدا حافظ کہہ کر اپنی کتابیں سنبھالتی گیٹ سے باہر نکلی تھی کہ سامنے گھنے پیڑ تلے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ گھبرا کر اپنی گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔

''بی بی! گاڑی اِدھر ہے۔'' ڈرائیور کی آواز اور اشارے کی سمت اُس نے دیکھا اور فوراً قدم بڑھایا تھا کہ وہ لپک کر اُس کے قریب آ کر بولا تھا۔

''سعدیہ! میری ایک بات سُن لو۔'' بڑی عاجزی تھی اُس کے لہجے میں۔ لیکن وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور پر چلائی تھی۔

''جلدی چلو۔''

ڈرائیور نے اسپیڈ سے گاڑی آگے بڑھائی۔ تب بھی وہ بار بار پیچھے مڑ کر یوں دیکھتی جیسے وہ اُس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہو اور اُس کی آواز کی بازگشت بہرحال تعاقب کرتی آئی تھی۔ جب ہی تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے بھی اُس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ دُور تک کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی کوئی تڑپ کر پکار رہا تھا۔

''سعدیہ! میری ایک بات سُن لو۔''

اُس کے خوف نے چپکے سے آزردگی کی چادر اوڑھ لی۔ یوں کہ خود اُسے بھی پتا نہیں چلا اور اپنے تئیں وہ سر جھٹک کر سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کتابیں رکھ کر اے سی کا بٹن آن کیا تھا کہ فدا اُس کے کمرے کا دروازہ پورا کھول کر بولا۔

''سعدی! چل کھانا لگ گیا ہے۔''

اُس نے ہمیشہ کی طرح فدا کو بدتمیزی سے دروازہ کھولنے اور بولنے پر نہیں ٹوکا۔ اس کے برعکس قدرے گم صم سے انداز میں ''مجھے بھوک نہیں ہے'' کہتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ کمرے میں آئی تو آن منتظر کھڑی تھیں۔

''سعدیہ! کھانا......'' آن نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ چڑ کر بولی۔

''میں نے فدا سے کہا تو ہے، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''کیوں بھوک نہیں ہے۔ صبح ناشتا بھی برائے نام کیا تھا۔ چلو چودھری صاحب انتظار میں بیٹھے ہیں۔''

''آن پلیز، آپ ابا جی سے کہہ دیں۔ میں نے کالج میں برگر کھا لیا تھا۔'' اُس نے لجاجت سے آن کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔ تو وہ بغور اُسے دیکھنے لگیں۔ پھر دھیرے سے اُس کا گال چھو کر پوچھنے لگیں۔

''کیا بات ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں آن!'' وہ ایک دم انہیں چھوڑ کر بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔

''سعدیہ! تمہیں پتا ہے نا۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتیں۔'' آن نے جتا کر کہا۔ تو وہ پھر چڑ گئی۔

''آپ جائیں نا۔ ابا جی آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ اور میں اب سو رہی ہوں، فدا کو منع کر دیجیے گا، اس بدتمیزی سے میرا دروازہ نہ کھولے ورنہ میں ابا جی سے شکایت کر دوں گی۔''

آن سمجھ گئیں۔ اس وقت وہ یونہی اُلجھتی رہے گی۔ جب ہی اُسے مزید کریدنے کا ارادہ ترک کر کے کمرے سے نکل گئیں۔ اور روزانہ تو وہ کالج سے آنے کے بعد بڑے آرام سے لمبی تان کر سو جاتی تھی ابھی بھی سونا چاہتی تھی لیکن ایک طویل عرصے بعد آج پھر اُس شخص نے سامنے آ کر اُسے اپ سیٹ کر دیا تھا اُس کی زندگی میں حقیقتاً اُس شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی نہ دل میں اُس کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ جب ہی تو اُسے دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔ پھر جانے کس اُمید پر وہ وقفے وقفے سے اپنا آپ منوانے چلا آتا تھا اور وہ کیوں مانے اُسے، کیوں تسلیم کرے؟

اس وقت جب وہ آن کے پیٹ میں تھی۔ تب تمام ڈاکٹری رپورٹس کو غلط قرار دیتے ہوئے اُس شخص نے نہ صرف اُس کے وجود سے انکار کیا تھا بلکہ اللہ کی طرف سے عطا ہونے والی نعمت سے منکر ہوا تھا اور اب شاید اسی کی سزا میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ بہرحال سعدیہ کو اُس سے کوئی بغض نہیں تھا نہ وہ انتقاماً اُس سے منہ موڑ کر بھاگتی تھی۔ بلکہ وہ خوف جو بہت بچپن میں اُس کے دل میں جاگزیں ہو گیا

تھا کہ وہ شخص اُسے آن سے چھین کر بہت دُور لے جائے گا، اُسے اس شخص سے ہمدردی سے بھی روکتا تھا۔ ورنہ اُس کے نرم نرم دل میں بڑی گنجائش تھی۔ بنا کسی لالچ کے وہ محبتیں بانٹتی تھی اور اس کا بس نہیں چلتا تھا سب کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ حتی الامکان سمیٹتی بھی تھی اور جہاں بے بس ہوتی وہاں اُس پر جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی تھی۔

رات میں آن بہت فراغت سے اُس کے پاس آ کر بیٹھیں۔ اور پہلے تانیہ کی شادی پر ملتان جانے کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میں نے تمہارے لیے دو سوٹ بنا دیے ہیں۔ باقی مہندی وغیرہ پر پہننے کے لیے تم اپنی پسند سے لے لو۔ کہاں یہاں سے لوگی، یا ملتان سے؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ ایسے معاملات میں بڑی لاپروا تھی۔

''چلو ملتان سے لے لینا۔ فدا اور مونی کے بھی وہیں سے لیں گے۔''

''یہ دونوں کہاں ہیں؟'' اُس نے فدا اور مونی کا پوچھا۔

''مونی سو گیا ہے اور فدا جی کے ساتھ مستیاں کر رہا ہے۔'' آن صوفے پر نیم دراز ہوتی ہوئی بولیں ''میں دوپہر میں بہت سوئی اب مشکل ہی سے نیند آئے گی۔''

''ابا جی سو گئے؟''

''ہاں دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، وہ اپنے وقت پر سوتے جاگتے ہیں۔ خیر تم سناؤ، تمہارے کالج میں فنکشن ہونے والا تھا۔ کب ہے؟'' آن نے اُس کے کالج کا ذکر چھیڑ کر بغور اُسے دیکھا۔

''تب ہم تانیہ کی شادی میں ملتان میں ہوں گے۔'' وہ بتا کر یوں ہو گئی جیسے اُسے افسوس ہو رہا ہو کہ یہ دونوں فنکشن میں ساتھ کیوں آ گئے۔

''تو تمہارا موڈ اس لیے خراب تھا۔'' آن نے اپنے طور پر سمجھ کر کہا۔ تو وہ چونک کر بولی۔

''کب؟''

''دوپہر میں جب تم کالج سے آئی تھیں بے وقوف! کالج فنکشن سے زیادہ تم تانیہ کی شادی میں انجوائے کرو گی۔ وہاں تمہاری سب کزنز ہوں گی۔''

آن ابھی بھی اُسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھیں۔ پھر اُسے بہت خاموشی سے دیکھتے پا کر قدرے رُک کر پوچھنے لگیں۔ ''کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلا کر گہری سانس کھینچی۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے قریب نیچے کارپٹ پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اُن کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

''آپ کو پتا ہے نا آن! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ پھر آپ جاننے کی جلدی کیوں کرتی ہیں؟''

''مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ میں تمہیں ایک پل آزردہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور تم چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنے لگی ہو۔'' آن نے بہت محبت سے اُس کا گال تھپکا۔ تو وہ نظریں چرا کر بولی۔

''چھوٹی بات نہیں ہے آن! آج وہ میرے کالج آیا تھا۔''

''کون؟'' آن یک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔

''غیاث۔'' اُس کی نظریں آن کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ اُن کی پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہو گئی تھیں اور بولیں تو لہجے میں حد درجہ ناگواری تھی۔

''کچھ کہا اُس نے تم سے؟''

''نہیں۔ میں نے موقع ہی نہیں دیا اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔''

''اچھا کیا۔'' آن کا انداز سوچتا ہوا تھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اُٹھتی ہوئی بولیں۔

''بہرحال کل تم کالج نہیں جانا۔''

''آن!'' وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اَن سنی کرتی اُس کے کمرے سے نکل گئیں۔

''عجیب مصیبت ہے۔'' وہ رو دینے کو ہو گئی۔ ''آخر کب تک آن مجھے اُس سے چھپاتی رہیں گی اور وہ میرے رویے سے مایوس کیوں نہیں ہو جاتا۔ خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے آ جاتا ہے۔ اب پتا نہیں کتنے دن مجھے گھر میں بند رہنا پڑے گا۔'' معاً اُس کے ذہن کے دریچوں پر دستک ہونے لگی۔

''سعدیہ! میری ایک بات سن لو۔'' زندگی کے ہر دوسرے موڑ پر وہ شخص اُس کے سامنے آیا تھا لیکن اتنی عاجزی سے پہلے کبھی نہیں پکارا تھا، یا شاید وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ لائٹ آف کر کے لیٹی تو یہاں وہاں ہر طرف اُس کی پکار تھی۔

پھر نہ صرف اگلے دن بلکہ اُس کے بعد بھی آن نے اُسے کالج نہیں جانے دیا۔ اور اُس کا مزید احتجاج فضول تھا کیونکہ اُس کے ساتھ شروع سے ہی ایسا ہوتا آ رہا تھا۔ گو کہ چودھری صاحب کا خاصا اثر و رُسوخ تھا۔ وہ چاہتے تو اُس شخص کا اپنے شہر میں داخلہ بند کروا سکتے تھے لیکن وہ سرے سے کوئی اہمیت دینے کو ہی تیار نہیں تھے۔ اُن کے نزدیک وہ ایک معمولی شخص تھا اور بڑے لوگوں کے پاس یوں بھی معمولی لوگوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔

''کچھ نہیں کر سکتا وہ۔ بس دُور ہی سے سعدیہ کو دیکھتا ہے نا۔ دیکھنے دو۔ آخر باپ ہے اُس کا۔''

اُن کے اطمینان دلانے کے باوجود جانے کیوں آن کو دھڑکا لگا رہتا تھا اور کچھ اس دھڑکے کے

باعث اور کچھ سعدیہ کو بہلانے کی خاطر انہوں نے فوراً ملتان جانے کا پروگرام بنالیا۔ حالانکہ تانیہ کی شادی میں ابھی پورے آٹھ دن تھے۔

ملتان آکر وہ سچ مچ بہل گئی تھی۔ رات دیر تک کزنز کے ساتھ مل کر ڈھولک پر گیت گانا۔ صبح دیر تک سونا۔ پھر شام میں شاپنگ کے لیے جانا۔ اُسے زندگی میں ایسی ہل چل اچھی لگتی تھی اور وہ بچوں کی طرح یوں خوش ہوتی کہ سارے میں اُس کی آواز سنائی دیتی تھی۔

''باجی مونا! آپ کا علی آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

''ثوبیہ باجی! آپ کو بھائی جان بلا رہے ہیں۔''

بظاہر کتنی لاپرواہ نظر آتی تھی لیکن ایک ایک کی خبر رکھتی تھی۔ اس سے اُس کی ہر ایک کے ساتھ گہری وابستگی اور محبت ظاہر ہوتی تھی۔ اس وقت وہ اعزاز کے کمرے کے دروازے میں رُک کر کہہ رہی تھی۔

''بھائی جان اعزاز! آپ کو ابی بلا رہے ہیں۔''

''پلیز ابی سے کہہ دو، میں موجود نہیں ہوں۔'' اعزاز نے کہا۔ تو وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

''ہائے نہیں بھائی جان! میں ابی سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

''تو سچ بول دو کہ میں سو رہا ہوں۔'' اعزاز نے سر تک چادر کھینچ لی۔ تو وہ پریشان ہوگئی۔

''بھائی جان پلیز۔'' اعزاز نے دھیرے دھیرے چادر نیچے کھسکائی اور بہت خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ دونوں ایک ہی آنگن میں کھیلے تھے اور شروع سے وہ جیسی تھی ابھی بھی اتنی پیاری اور معصوم نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں بڑی ہوگئی تھیں اور قد کاٹھ میں تو وہ بھی اُونچی ہوگئی تھی لیکن انداز میں وہی بچپنا تھا۔ جب ہی دل کی بات کہنے کے لیے اعزاز کو بہت سوچنا پڑ رہا تھا۔

''سنو۔'' وہ کہنیوں پر وزن ڈال کر اُونچا ہوتا ہوا بولا۔ ''اپنے بھائی جانوں کی لسٹ سے میرا نام خارج کردو۔''

''کیوں بھائی جان؟''

''بس مجھے نہیں اچھا لگتا۔'' وہ بظاہر سرسری انداز میں کہتا چادر پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کمرے سے نکلتے ہوئے آہستہ سے اُس کا سر ہلا کر بولا۔ ''سمجھ گئیں نا۔''

اور وہ بالکل نہیں سمجھی۔ جب ہی اُس کے پیچھے حیران کھڑی تھی۔ پھر آن کی پکار پر چونک کر

بھاگی تھی۔

''کہاں ہو تم، تیار نہیں ہونا۔ ابھی وہ لوگ مہندی لے کر آجائیں گے۔'' آن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ تو وہ جلدی سے سوٹ کیس کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

''سعدیہ! تم کیا پہنو گی؟'' ارم نے آئینے میں اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''یہ۔'' اُس نے مہندی کلر کا جھلملاتا سوٹ سامنے کیا تو ارم آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

''بہت خوب صورت ہے۔''

''آپ کو اچھا لگ رہا ہے تو آپ پہن لیں۔'' اُس نے بڑے خلوص سے سوٹ ارم کی طرف بڑھایا۔ تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''میں قد میں تم سے کافی چھوٹی ہوں۔''

''چلیں پھر میں ہی پہن لیتی ہوں۔'' وہ ہنستی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد نکلی تو کمرے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ مہمانوں کی آمد کا سوچ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ہلکے میک اپ کے بعد بالوں میں برش کیا۔ پھر کانوں میں کپڑوں کے ہم رنگ ٹاپس ڈال رہی تھی کہ اعزاز کمرے میں آکر بولا۔

''تمہاری تیاری ابھی ختم نہیں ہوئی؟''

''ہوگئی۔'' اُس نے آئینے کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ سے دوپٹہ اُٹھایا اور شانے پر ٹکا کر پوچھنے لگی ''سچ بتائیں، کیسی لگ رہی ہوں۔''

''تم ہمیشہ بہت اچھی لگتی ہو۔'' اعزاز کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''تھینک یو۔'' وہ اپنے سادہ سے انداز میں مسکرائی اور دوپٹہ سنبھالتی کمرے سے نکل آئی۔

مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ وہ جیسے ہی برآمدے سے نکل کر لان میں آئی تو اچانک سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اُس سے پہلے مہمانوں سے آن کا تعارف ہو رہا تھا۔ پھر اِدھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔

''یہ کون ہے؟''

''کس کی بیٹی ہے؟''

''یہ ہماری آن کی بیٹی ہے سعدیہ؟'' ارم اُس کا تعارف کراتی ہوئی بولی ''جیسے آن اکلوتی ہیں، یہ بھی ایک ہی ہے۔''

''ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔'' اور ان ساری تعریفوں سے بے نیاز اُس کی نظریں اپنی بقیہ کزنز

کو ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھیں اور قدرے فاصلے پر کھڑے اعزاز کو اُس پر پڑنے والی ستائشی نظروں میں چھپی خواہش، یا غرض پریشان کر رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے سب کے درمیان میں سے نکال کر لے جائے۔

''سعدیہ!'' ضبط کرتے کرتے بھی بے اختیار اُسے پکار لیا۔

''جی بھائی جان!'' حسبِ عادت وہ فوراً متوجہ ہوئی تو اعزاز کچھ گڑبڑا گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے پھر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔

''وہ تمہیں چچی جان بلا رہی ہیں۔''

''کون سی چچی جان! کہاں ہیں؟'' وہ پوچھتی ہوئی مہمانوں کے درمیان میں سے نکلی اور اعزاز کے اشارے پر اندر آ کر ابھی پہلے کمرے میں جھانک کر دیکھ رہی تھی کہ وہ ایک دم سامنے آ کر بولا۔

''تمہیں لان میں جانے کو کس نے کہا تھا؟''

''کیوں سب لوگ وہاں نہیں ہیں کیا؟'' اُس نے سادگی سے پوچھا۔

''سب لوگوں کو چھوڑو۔ تم وہاں نہیں جاؤ گی۔''

''میں کیوں نہیں جاؤں گی۔ ابھی مہندی کی رسم ہونے والی ہے۔ اتنا مزہ آئے گا اور دیکھیں آن مجھے پکار بھی رہی ہیں۔'' وہ کہتی ہوئی اس تیزی سے بھاگی کہ پیچھے وہ جھنجھلا کر رہ گیا تھا۔

پھر اگلے دو دن یعنی شادی اور ولیمے کی تقریبات میں بھی وہ اسی طرح جھنجھلاتا اور پریشان ہوتا رہا تھا کیونکہ وہ اپنے معصوم حسن کی بدولت سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اور اُسے یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی اُس کے لیے دامن پھیلا کر آن کو سوچنے پر مجبور نہ کر دے۔ جب ہی ولیمے کی تقریب سے لوٹتے ہی وہ آن کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ پھر جب آن سونے کے لیے لیٹیں تو وہ بھی بہت خاموشی سے اُن کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھا اور اُن کی ٹانگیں دبانے لگا تو نیم اندھیرے میں وہ اُچھل پڑیں۔

''کون؟'' پھر اُسے دیکھ کر بولیں۔ ''ہائے اعزاز! تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔ ویسے اس وقت تمہیں میری ٹانگیں دبانے کا خیال کیسے آیا؟''

''میں نے سوچا آپ تھک گئی ہوں گی۔'' وہ مسکرایا۔

''میں صدقے۔ میں ابھی بوڑھی نہیں ہوئی۔ جاؤ جو بوڑھے ہیں اُن کی خدمت کرو۔''

''یہاں کوئی اپنے آپ کو بوڑھا ماننے کو تیار ہی نہیں۔'' وہ اُن کی ٹانگیں نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''کوئی ہو تو مانے۔ بھائی جان اقبال سے لے کر حسن تک ماشاء اللہ سب جوان جہان ہیں۔'' آن کے لہجے میں اپنے بھائیوں کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

''کوئی نہیں۔ سب بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' اُس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ آن نے فوراً اپنی ٹانگیں کھینچ لیں۔

''خبردار میرے بھائیوں کو بوڑھا کہا۔ چلو جاؤ۔ اب مجھے سونے دو۔''

''نہیں ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں آپ سے باتیں کروں گا۔'' اُس نے کہا تو انہوں نے کچھ چونک کر اُسے دیکھا پھر تکیہ سیدھا کر کے قدرے اُونچی ہو کر پوچھنے لگیں۔

''کوئی خاص بات ہے؟''

''جی!'' وہ سر جھکا کر بولا۔ ''آپ وعدہ کریں، میری بات ضرور مانیں گی۔''

''ماننے کی ہوئی تو مانوں گی لیکن وعدہ نہیں کرتی۔''

آن کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے۔ جب ہی کچھ تجسس اور اشتیاق سے دیکھنے لگی تھیں۔ اور وہ بولتے ہوئے کچھ جھجک رہا تھا۔

''ایسا ہے آن! کہ میں سعدیہ کو پسند کرتا ہوں، آپ اُس کی شادی مجھ سے.........''

''نہیں اعزاز!'' آن اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑیں۔ ''سعدیہ کی شادی تمہارے ساتھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا سوچنا بھی مت۔''

''کیوں؟'' وہ ہرٹ ہونے کے باوجود براہ راست آن کو دیکھنے لگا۔ اور اُن کا مقصد اُسے ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ جب ہی پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''اس لیے کہ سعدیہ میں اور تم میں صرف ایک کلاس کا فرق ہے۔ وہ فرسٹ ائیر میں ہے اور تم سیکنڈ ائیر میں۔ اِس حساب سے تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بہت سال لگیں گے اور اتنے سال میں سعدیہ کو بٹھائے نہیں رکھوں گی۔''

''کلاس کو چھوڑیں آن! عمر میں تو کافی سالوں کا فرق ہے اور پڑھائی کا کیا ہے۔ میں شادی کے بعد بھی پڑھ سکتا ہوں بلکہ ضرور پڑھوں گا۔'' اُس نے یقین دلایا۔ لیکن آن کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ تو وہ لجاجت سے گویا ہوا۔

''پلیز آن! میرا یقین کریں میں سعدیہ کو بہت خوش رکھوں گا پھولوں کی سیج پر رہے گی وہ۔''

''نو مائی ڈیئر! یہ ناممکن ہے۔ گو کہ تم مجھے بہت عزیز، بہت پیارے ہو۔ لیکن تمہارے ساتھ سعدیہ کی شادی کا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا اور اس کی وجہ صرف ایک کلاس کا فرق ہے۔

اگر عمر کی طرح تعلیم میں بھی تم اُس سے اتنے ہی سال آگے ہوتے تب میں سوچ سکتی تھی۔"

آن نے اُسے کوئی جھوٹی آس دلانی بھی مناسب نہیں سمجھی۔ اور دوٹوک بات کہہ کر ختم کر دی۔ تو وہ کچھ دیر خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اسی طرح اُٹھ کر کمرے سے نکل آیا۔

اُسے آن سے اتنے صاف انکار کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ گوکہ آن نے آئندہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی پھر بھی وہ انہیں ہموار کرنے کے پلان بناتا رہا۔ کیونکہ اُس کا دل کسی بھی طرح سعدیہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اور اپنی سندرتا سے بے نیاز ہر ایک کو دل سے سراہتی تھی۔

"بے بی باجی! آپ اتنی اسمارٹ ہیں، مجھے رشک آتا ہے آپ پر۔"

"اچھا!" بے بی باجی بہت پیار سے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتیں۔ "کبھی آئینے میں اپنے آپ کو نہیں دیکھا تم نے؟"

"میں بھی اچھی لگتی ہوں کیا؟"

"اچھی۔ بہت اچھی۔"

اور وہ بچوں کی طرح خوش ہو جاتی۔ اُس کے نزدیک زندگی ان ہی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا نام تھا۔ شاید اس لیے کہ اُس کی اب تک کی زندگی میں کہیں کوئی محرومی نہیں تھی۔ اس کے برعکس بے حد و حساب محبتیں تھیں جو اُسے ہمہ وقت شاد رکھتیں۔

اُس کی شادمانیوں میں دُکھ کا پہلا کنکر اُس وقت گرا جب اُس نے سنا ثوبیہ آن سے کہہ رہی تھی۔

"آن! آپ کو پتا ہے، سعدیہ کے رئیل فادر (حقیقی باپ) کی ڈیتھ (وفات) ہوگئی ہے۔"

اُس کی آنکھیں یک بارگی یوں دھندلائی تھیں کہ اُسے دیوار کا سہارا لینا پڑا تھا حالانکہ اُس شخص کی اُس کی زندگی میں کبھی گنجائش نہیں تھی اور نہ دل میں کوئی نرم گوشہ۔ پھر جانے کیسے وہ ٹوٹ رہی تھی، بکھر رہی تھی۔ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہو کر بولی۔

"کب ثوبیہ باجی؟ غیاث کی ڈیتھ کب ہوئی؟"

"سعدیہ!" آن نے لپک کر اُسے بازوؤں میں لے لیا۔ "آؤ یہاں بیٹھو۔"

"آن! بتائیں نا، غیاث کب؟" وہ آن کے بازوؤں میں مچلی تو انہوں نے ثوبیہ کو دیکھا جس نے ابھی یہ خبر سنائی تھی۔

"میرا خیال ہے۔ پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں۔" ثوبیہ کے لاپروائی سے کہنے پر وہ دُکھ سے بولی۔

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا، جب ہم آئے تھے؟"

"شادی کے ہنگاموں میں کہاں کوئی بات یاد رہتی ہے اور پھر ہمارا اُس سے کیا تعلق۔ کیوں آن؟"

ثوبیہ نے سابقہ انداز میں آن کی تائید بھی چاہی تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں سعدیہ تڑپ کر اُن کے بازوؤں سے نکلی اور بھاگ کر واش روم میں بند ہوگئی۔

یہ صحیح ہے کہ اُس نے کبھی غیاث سے کوئی واسطہ تعلق نہیں رکھا تھا اور نہ کبھی اس بات پر اُس کا دل آمادہ ہوا تھا لیکن اُس سے جو خون کا تعلق تھا اس سے تو انکار ممکن نہیں تھا۔ اور اب وہی تعلق اپنا آپ منوا کر اُس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر رہا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسو ایک تواتر سے بہ نکلے تھے۔

"پندرہ بیس دن پہلے۔" اُس نے سوچا تو اُسے وہ تپتی دوپہر یاد آئی جب کالج سے نکلتے ہی اُسے وہ سامنے نظر آیا تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ اپنی جگہ کھڑا نہیں رہا تھا بلکہ بہت بے قراری سے لپک کر اُس کی طرف آتا ہوا پکار کر بولا تھا۔

"سعدیہ! میری ایک بات سُن لو۔" اُس کی پکار میں کیسی تڑپ اور لہجے میں کیسی عاجزی تھی کہ اُس وقت بھی خوفزدہ ہونے کے باوجود اُس نے شدت سے محسوس کی تھی اور اب تو دل میں درد جاگ اُٹھا تھا۔

"ہائے کاش! میں سُن لیتی۔ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔"

اک خلش نے دل کا دامن تھام کر اُس ہنستی کھیلتی مگن سی لڑکی کو درد آشنا کر دیا تھا۔ اور قصور وار وہی شخص تھا اُس کا باپ۔ جس نے ساری زندگی اُسے کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جاتے جاتے روگ دے گیا تھا۔

وہ کتنی دیر واش روم میں بند اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی رہی۔ پھر پورا شاور کھول کر کھڑی ہوگئی اور یہ اُس کی زندگی کا نہ صرف پہلا دُکھ تھا بلکہ صرف اُس کا اپنا جس میں وہ کسی کو شریک نہیں کر سکتی تھی۔ آن کو بھی نہیں جو اُس کی ماں ہی نہیں دوست بھی تھیں۔ اسی لیے جب وہ نہا کر نکلی تو یوں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی جب کہ آن جلے پیر کی بلی کی طرح چکراتی پھر رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ واش روم سے نکلی اُس کے پاس بھاگی آئیں۔

"سعدیہ بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟"

"کیا ہوا ہے مجھے۔ میں نہا رہی تھی۔" وہ ہمیشہ کی لاپروا تھی لیکن اس وقت اُسے خود کو لاپروا پو

کرنا پڑ رہا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی۔ وہ میرا مطلب ہے آج ہمیں واپس جانا ہے۔ تم نے اپنے سارے کپڑے رکھ لیے؟'' آن نے فوراً موضوع بدل کر پوچھا۔

''میرے کپڑے۔'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُکتا کر بولی۔ ''مجھے آج واپس نہیں جانا۔ آپ ابا جی سے کہہ دیں ہم ابھی کچھ دن یہیں رہیں گے۔''

''اتنے دن تو رہ لیا۔ اب اور رہ کر کیا کرنا ہے۔ چلو شاباش! تیاری کرو۔ تمہارے کالج کا بھی حرج ہو رہا ہے۔''

''اب میرے کالج کا حرج ہو رہا ہے اور جب آپ غیاث کے ڈر سے مجھے گھر بٹھا لیتی تھیں، اُس وقت حرج نہیں ہوتا تھا۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہوگئی۔

''مجھے اس کا کوئی ملال نہیں کہ میں نے تمہیں غیاث سے دُور رکھا۔'' آن کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ تو وہ بہت بے دلی سے اپنے کپڑے اکٹھے کر کے سوٹ کیس میں رکھنے لگی اور ابھی اس کام سے فارغ ہوئی تھی کہ ارم بھاگتی ہوئی آئی اور اُس کے گلے میں بازو ڈال کر خوشی سے بولی۔

''سعدیہ! آج تم نہیں جا رہیں۔ ابی نے آن کو روک لیا ہے اور تمہارے ابا جی چلے گئے۔''

''اچھا ابی نے کیوں روکا ہے؟'' اُس نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔ شاید امریکہ سے چچا جی آنے والے ہیں۔''

''کون ڈیڈی! چلو میں آن سے پوچھتی ہوں۔'' وہ ایک دم خوش ہوگئی۔ اور بہت عجلت میں ارم کو چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آن کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اعزاز نے سامنے آ کر اُس کا راستہ روک لیا۔

''بھائی جان اعزاز! پلیز مجھے آن کے پاس جانے دیں۔'' اُس نے منت سے کہا لیکن وہ اَن سنی کرتا اُس کی کلائی تھام کر تقریباً کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا اور بڑے آرام سے پوچھنے لگا۔

''آن سے تمہیں کیا کام تھا؟''

''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' وہ اُس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کام تو کوئی نہیں۔ بس تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''پہلے یہ بتائیں امریکہ سے ڈیڈی آ رہے ہیں؟'' وہ جو آن سے پوچھنے جا رہی تھی بڑے شوق سے اُس سے پوچھ لیا۔ تو جواب میں وہ لاعلمی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

''مجھے آن کے بارے میں نہیں پتا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ تمہارے چچا اور پھپیاں آ رہی ہیں۔''

''کون؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''غیاث کے بھائی اور بہنیں۔ اور شاید اُن کے ساتھ تمہارا بھائی بھی ہوگا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ سچ مچ اُلجھ گئی۔

''اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ غیاث تمہارا باپ تھا۔ تھا۔ میں نے اس لیے کہا کہ اُس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ بہرحال تمہارے خون کے سارے رشتے تو اُن ہی کے ساتھ ہیں۔ آئی مین غیاث کے بہن بھائی اُس کا بیٹا جو کہ اُس کی دوسری بیوی سے ہے۔ یہ سب شام میں آ رہے ہیں۔''

اعزاز نے خونی رشتوں کا حوالہ دے کر غالباً اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ مزید اُلجھ کر بولی۔

''کیوں، کیوں آ رہے ہیں وہ لوگ؟''

''پتا نہیں۔ صبح تمہارے چچا کا فون آیا تھا۔ اسی لیے ابی نے آن کو اور تمہیں روک لیا ہے۔''

''کہیں وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بات تو نہیں کریں گے۔'' وہ سہم کر بولی۔ تو اعزاز ذرا سا ہنسا۔

''ارے نہیں۔ جب تمہارا باپ تمہیں نہیں لے جا سکا تو............''

''میں جاؤں۔'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''ہاں اور جانے سے پہلے ایک اہم بات سن لو کہ میں نے تمہیں آن سے مانگ لیا ہے۔''

اعزاز کی معنی خیز مسکراہٹ اُسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی پھر بھی وہ ناسمجھی کے عالم میں کتنی دیر اُسے دیکھتی رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ ساری باتیں ایک ساتھ ہو رہی تھیں۔

دُکھ۔ غیاث مر گیا۔

حیرت۔ اُس کے گھر والے آ رہے ہیں۔

اور اعزاز کے مانگنے کو وہ کیا نام دے۔ اُس نے تو کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا تھا اور ابھی سوچ سکتی تھی اگر جو اس سے پہلے کی دونوں کیفیات شدید نہ ہوتیں۔ شاید اعزاز نے اظہار میں جلدی کر دی تھی۔ یہ وقت اس لڑکی کی دل جوئی کرنے کا تھا جو اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی لیکن کمال کا

ضبط تھا کہ شام میں جب غیاث کے بھائی اور بہنیں آئیں تو اُن کے سامنے بیٹھ کر وہ اُن سے حد درجہ لاتعلقی ظاہر کرتی رہی۔ جب کہ وہ تینوں بے پناہ لگاوٹ کا اظہار کر رہے تھے۔

''بیٹی! میں تمہارا چاچا ہوں، سگا چاچا۔ غیاث بھائی تم سے ملنے کی حسرت لیے چلے گئے۔ بہت چاہتے تھے وہ تمہیں۔'' وہ آن کو پہلو بدلتے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے افسوس ہے، غیاث!'' اُس نے فوراً نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ کیا کرتی ساری زندگی اُس شخص کا نام لیتی آئی تھی۔ اُسے ابو یا پاپا کہنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو بیٹا! میں تمہیں تمہاری امانت دینے آیا ہوں۔'' اُسے جانے پر آمادہ دیکھ کر اُس کے چاچا نے فوراً اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ تو وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

''میری امانت؟''

''ہاں بیٹا! تمہاری والد نے تمہارے لیے یہ تین لاکھ کا چیک چھوڑا ہے۔ اُن کی وصیت کے مطابق.........''

''آن کو دے دیں۔'' وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے لاپروائی سے بولی۔ تو آن نے تنبیہی نظروں سے اُسے گھورا۔

''بیٹھ جاؤ سعدیہ! یہ تم سے ملنے آئے ہیں۔''

''مجھ سے تو میرا باپ بھی ملنے آتا تھا، اُس سے کیوں نہیں ملنے دیا۔'' اُس نے دُکھ سے سوچا اور محض آن کی بات رکھنے کی خاطر دوبارہ بیٹھ گئی۔ تو اُس کی پھوپھی کہنے لگیں۔

''تمہاری امی سے ہم بہت شرمندہ ہیں۔ اُن سے کہو، ہمیں معاف کر دیں۔''

''میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی کدورت نہیں ہے۔ میں بہت پہلے سب کو معاف کر چکی ہوں اور شاید اسی لیے اپنی زندگی میں بہت مطمئن ہوں۔'' آن نے فوراً اپنی طرف سے معافی کا اعلان کرنے کے ساتھ ایک طرح سے جتا بھی دیا کہ تمہارے گھر سے نکالے جانے کے بعد میرے لیے راستے بند نہیں ہو گئے تھے۔

''غیاث بھائی کو بھی معاف کر دیں اگر اُن کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے۔'' غیاث کی بہنیں رو رہی تھیں۔

''سب کو۔ سب کو معاف کیا۔ آپ لوگ بھی ہمیں معاف کر دیں۔'' آن وہ ساری زیادتیاں بھولی نہیں تھیں پھر بھی دل سے سب کو معاف کر کے اطمینان سے تھیں۔ اس لیے کہ خدا معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

پھر اُن لوگوں کے جانے کے بعد ابی کے بلانے پر آن اُن کے کمرے میں چلی گئیں اور وہ فدا کو ڈھونڈتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی کہ ساری کزنز نے اُسے گھیر لیا۔

''سعدیہ! سنا ہے تم لکھ پتی ہو گئی ہو۔''

''میرے پاس پہلے بھی کوئی کمی نہیں ہے باجی!'' وہ قصداً مسکرائی۔

''لیکن یہ تو تمہاری ذاتی ملکیت ہے نا!'' اعزاز نے کہا۔ تو وہ دل میں اُٹھتی درد کی ٹیسوں کو دبا کر بولی۔

''پتا نہیں۔'' پھر فوراً اِدھر اُدھر دیکھ کر پکارنے لگی۔ ''فدا! فدا! چھٹنکو کہاں ہو تم۔''

''تمہارے چھٹنکو کو میں نے علی کے ساتھ دیکھا تھا۔'' ارم نے کہا۔ تو وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ پھر اپنے چہرے پر اعزاز کی نظریں محسوس کر کے اسی خاموشی سے سب کے درمیان سے نکل گئی تھی۔

اگلے دو دن اُس کے بڑی مشکل سے کٹے کیونکہ سب کے سامنے وہ خود کو نارمل پوز کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ تیسرے دن جب چودھری صاحب نے گاڑی بھجوائی تو وہ بہت عجلت میں سب سے مل کر آن سے بھی پہلے گاڑی میں جا بیٹھی اور آن کتنی دیر بعد آئی تھیں۔

''آپ کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔'' اُس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ وہ آن پر جھنجھلائی۔ جس کا نوٹس لیے بغیر وہ بڑے آرام سے بولیں۔

''مجھے بھائی جان سے بہت ضروری باتیں کرنی تھیں اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر چڑ رہی ہو۔''

''بس میں گلٹی فیل کر رہی ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تو آن نے خاموشی اختیار کر لی۔ کیونکہ وہ اُس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ باتیں کرنے لگے گی اور وہی ہوا جب گاڑی ملتان سے آگے لاڑی قدرے تنگ سڑک پر دوڑنے لگی تب غالباً باہر کے مناظر سے اُکتا کر وہ آن کی طرف رُخ موڑتے ہوئے سادگی سے کہنے لگی۔

''آن! مجھے غیاث کی ڈیتھ کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔ کیا ہوا ہو گا اُسے۔ اُس روز دیکھنے میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔''

''ہوں!'' آن اپنے جس خیال میں تھیں اسی میں مگن رہ کر بس ہوں کر کے رہ گئیں۔

''میری طرف بھاگ کر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ کاش میں اُس کی بات سن لیتی۔''

اُسے یہی خلش بے چین کر رہی تھی۔ ''آپ کو خواہ مخواہ یہ وہم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے آپ سے چھین کر لے جائے گا۔ اُس کے بھائی اور بہنیں کتنا رو رہی تھیں۔ مجھے اُن پر بھی ترس آ رہا تھا۔ بے چارے۔''

''ہائے بے چارے!'' آن نے سر جھٹکا۔

''کیوں آن! وہ بے چارے نہیں ہیں؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' آن اس موضوع سے اُکتانے لگیں۔ ناگواری سے بولیں۔ تو وہ خاموش ہو گئی لیکن اُسے چین نہیں آ رہا تھا۔ قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔

''آن! اُن لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا، جو وہ آپ سے اتنی معافیاں مانگ رہی تھیں۔''

''بیٹا! چھوڑو یہ سب باتیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پھر میں معاف کر چکی ہوں اللہ بھی معاف کرنے والا ہے۔ تم اپنا ذہن مت اُلجھاؤ۔''

آن نے دھیرج سے ٹوک کر کہا۔ لیکن وہ نہیں مانی پیچھے پڑ گئی۔

''مجھے بتائیں آن! میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''بیٹا! اب تو وہ ساری باتیں احمقانہ سی لگتی ہیں بلکہ ہنسی بھی آتی ہے۔'' آن کا انداز ٹالنے والا تھا۔ بہت سرسری انداز میں شروع ہوئیں۔ میں بالکل ایسی ہی تھی جیسی اب تم ہو۔ لاپرواہ، لااُبالی اور تھوڑی بے وقوف سی۔ شاید اس لیے کہ میری دنیا میرے بھتیجے، بھتیجیوں تک محدود تھی۔ یہاں تک کہ اسکول کالج میں اپنی سہیلیوں کے درمیان بھی میرے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہوتا تھا۔ لڑکیاں مجھ پر رشک کرتی تھیں۔ کہتیں تم بہت لکی ہو۔ تمہیں دنیا کا کوئی غم نہیں ہے۔ اور مجھے کیوں کوئی غم ہوتا۔ میں ماشاءاللہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور وہ بھی سب سے چھوٹی۔ بھائی جان چھڑکنے والے تو بھابیاں اُن سے زیادہ محبت کرنے والیں۔ پھر اُن کے بچوں سے میں کیسے نہ محبت کرتی۔ یوں بھی ہماری عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ جب سب سے بڑے بھائی جان اقبال کی شادی ہوئی اُس وقت میں دو سال کی تھی۔ اس حساب سے میرا سب سے بڑا بھتیجا نعیم مجھ سے تین سال چھوٹا تھا۔ پھر یونہی ایک ایک سال کے فرق سے آصف، طارق، بے بی، بانو۔ یعنی میں اُن ہی کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بھائیوں اور بھابیوں کے لیے میں اُن کے بچوں جیسی تھی۔ بہت لاڈ اُٹھائے سب نے میرے۔ اتنی محبتیں، جن سے نکلنے کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے برعکس زندگی جیسے اُن ہی محبتوں کے سائے میں تمام ہو جائے گی۔ وہ تو جب میں نے انٹر کر لیا تب چاروں طرف سے رشتوں کی بھرمار نے اچانک مجھے احساس دلایا کہ اس خوب صورت دنیا سے نکل کر مجھے

کہیں اور بھی جانا ہے۔''

وہ جو بہت سرسری انداز میں شروع ہوئی تھیں عہد رفتہ نے بہت دھیرے دھیرے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اُس کے سب بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس لیے اُس کے لیے آنے والے پرپوزلز میں بھائیوں کا انتخاب تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اُن کے نزدیک دولت ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے برعکس تعلیم ایک تو بندے کو انسان بناتی ہے دوسرے آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ بہرحال غیاث ایم اے پاس تھا اور اسی حساب سے اُس کے دوسرے بہن بھائی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کو یوں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بس وہ کچھ خائف سی تھیں کہ بالکل اجنبی لوگوں میں پتا نہیں وہ ایڈجسٹ ہو سکے گی، یا نہیں۔ جانے اُن کا ماحول کیسا ہو۔ اور اس اندیشے کا اظہار انہوں نے بھائی جان کے سامنے بھی کیا تھا۔ جس پر انہوں نے کہا تھا۔

''بیٹا! تعلیم یافتہ لوگوں کا ماحول اچھا ہی ہوتا ہے اور اُن کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ ہم نے غیاث کا انتخاب یہی سوچ کر کیا ہے۔ انشاءاللہ، تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ گو کہ اس وقت وہ بہت معمولی جاب کر رہا ہے لیکن شادی کے بعد میں اُسے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بہت اچھی جاب دلا دوں گا۔''

اور بھائی جان کے لیے یہ کچھ مشکل بات نہیں تھی۔ انٹر پاس لڑکے اُن کے پاس جاب کے لیے آتے تھے اور انہوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا۔ پھر بہن کے لیے تو وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی اس لیے اُس نے مزید کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا اور بھائیوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔ اور اپنے طور پر تو سب بھائیوں نے بہت دیکھ بھال کر اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد اُس کی شادی کی تھی۔ لیکن ساری بات مقدر کی ہوتی ہے جس کے سامنے انسان کی ساری فہم و فراست دھری رہ جاتی ہے۔

بہرحال بابل کے آنگن سے رُخصت ہوتے ہوئے اُس کے دامن میں بے حد و حساب محبتوں کے ساتھ ڈھیروں دُعائیں تھیں اور اعلیٰ عہدوں والے بھائیوں کا دیا ہوا مان تھا جس پر نازاں ہو کر اُس نے حجلۂ عروسی کو قدرے ناگواری سے دیکھا تھا۔ اُس کی جگہ اگر کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو شاید وہ اُس سے زیادہ ناگواری کا اظہار کرتی۔ کیونکہ چھوٹے سے کمرے میں ایک پلنگ اور دیوار کے ساتھ دو بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز تک کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ اُسے اچانک اپنی زبان اور حلق

خشک لگنے لگا تب ہی غیاث کی دونوں بہنیں بڑی بے تکلفی سے دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر آئیں اور اُن کے سامنے ایک چھوٹی سی گٹھڑی پھینکتی ہوئی بولیں۔

''اس میں آپ کے کپڑے ہیں، پہن لیجیے گا۔ اور ہاں زیور اُتار کر یوں ہی اِدھر اُدھر نہیں ڈال دینا، سنبھال کر رکھنا۔'' اُس نے پہلی بار براہِ راست اُن دونوں کو دیکھا تھا۔ خاصی میچور لڑکیاں تھیں۔

''کچھ چاہیے تو نہیں؟'' جاتے جاتے ایک نے رُک کر پوچھا۔ تو وہ فوراً بولی۔

''ہاں، پانی!''

''غیاث سے کہہ دوں گی، لیتا آئے گا۔'' وہ احسان کرتی چلی گئیں اور اُس کے انداز پر غور کرتی رہ گئی۔ پھر جب غیاث آیا تو وہ اُس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

''آپ کی بہنیں آپ سے چھوٹی ہیں، یا بڑی؟''

''چھوٹی۔ میں گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ کیوں؟'' وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

''بس یونہی ہی پوچھ لیا تھا۔'' اب ملن کی پہلی گھڑی میں وہ کیا کہتی۔

''ہمارا کوئی لمبا چوڑا کنبہ نہیں ہے۔ اماں، ابا اور ہم چار بہنیں بھائی۔'' وہ اُس کے سامنے بیٹھ کر اپنے گھر کا تعارف کروانے لگا۔ ''سب سے بڑا میں ہوں۔ پھر جمیلہ ہے جو ایم اے کر رہی ہے۔ اس کے بعد عیاض بھی ایم اے کا اسٹوڈنٹ ہے اور سب سے چھوٹی راحیلہ ہے، بی اے میں پڑھ رہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے اس گھر میں کمانے والے ایک صرف آپ ہیں۔'' اُس نے یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ جس پر وہ خفگی سے گویا ہوا۔

''ہاں اور یہ بات تمہارے بھائی جانتے تھے۔''

''جی!'' وہ سر جھکا کر ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔

پھر ابتدائی چند دنوں میں ہی اُس نے دیکھ لیا کہ جس چیز کو اُس کے بھائیوں نے سب سے زیادہ اہمیت دی تھی اس کا اس گھر کے کسی فرد پر رتی برابر بھی اثر نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے گدھوں پر کتابیں لادی گئی ہوں۔ عجیب بے تکا سا ماحول تھا۔ جہاں سب مل بیٹھتے اُس کا مذاق اُڑاتے۔ ساس سسر کو اُس کے ہر کام میں بُرائی نظر آتی۔ یہ صحیح ہے کہ گھر کے کام کاج میں وہ مشاق نہیں تھی کیونکہ اکلوتی لاڈلی ہونے کے باعث اپنے گھر میں اُس نے کبھی کام نہیں کیا تھا، پھر ابھی انٹر سے فارغ ہوئی تھی۔ لیکن ساس نندیں اُس کی کوشش کو بجائے سراہنے کے ایسی ایسی تنقید کرتیں کہ وہ چکرا جاتی تھی۔

''دس لڑکیاں ہوں یا ایک، ماں کا فرض ہوتا ہے انہیں گھر کے کام کاج سکھائے۔ تمہاری اماں کیسی ہے جو تمہیں گھر داری نہیں سکھائی۔''

''لو یہ انڈونیشیا کا نقشہ۔'' عیاض نے اُس کی ڈالی ہوئی روٹی توے سے کھینچ کر سب کے سامنے لہرائی۔

''مجھے دکھاؤ۔''

''مجھے دکھاؤ۔'' راحیلہ اور جمیلہ اچک اچک کر اُس کے ہاتھ سے روٹی کھینچنے لگیں۔ عجیب تماشا تھا۔ وہ دھندلائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ معاً باہر گاڑی رُکنے کی آواز پر وہ چونک کر بولی۔

''میرے بھائی جان آئے ہیں۔ گاڑی اُن ہی کی ہے۔ عیاض دیکھو۔'' عیاض سر جھٹک کر باہر گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ساتھ واقعی بھائی جان تھے۔ وہ بھاگ کر اُن سے لپٹ گئی۔

''کیسی ہو بیٹا؟'' بھائی جان کے مشفق لہجے نے اُس کی پلکیں نم کر دیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو تماشا ہو رہا تھا دل چاہا سب بیان کر دے لیکن بڑے ضبط سے مسکرا کر بولی۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔ بھابی جان، بچے، سب کیسے ہیں؟''

''سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''غیاث آ جائیں پھر میں آؤں گی۔ آپ بیٹھیں، ابا جی کے پاس۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' وہ کہہ کر جانے لگی کہ ساس فوراً پکار کر بولیں۔

''تمہیں چائے بنانے کا ڈھنگ کہاں ہے۔ راحیلہ سے کہو، وہ بنا دے گی۔'' اُس نے سٹپٹا کر بھائی جان کو دیکھا۔ اُن کے چہرے کی مسکراہٹ یک لخت معدوم ہو گئی تھی۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولے۔

''سیکھ جائے گی آہستہ آہستہ۔''

''ہونہہ! اماں نے تو سکھایا نہیں یہاں سیکھے گی۔ ساس نے نخوت سے سر جھٹکا تو وہ بھائی جان سے نظریں چرا کر جلدی سے کچن میں آ گئی۔ پھر اُن کے جانے کے وقت ہی باہر نکلی تھی۔

''سنا تم نے، کیا کہہ گئے ہیں تمہاری بیوی کے بھائی جان۔'' غیاث کی آمد پر اُس کی ماں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ''بہن کے لیے نوکر رکھ دیں گے۔ بڑے آئے نوکروں والے۔ ہم پر رُعب جماتے ہیں۔''

''ہائے اماں! نوکر؟ توبہ توبہ۔ ہمارے کیا ہاتھ پیر ٹوٹے ہوئے ہیں جو ہم نوکر سے کام کروائیں گے۔'' جمیلہ نے اپنے گال پیٹ کر کہا۔

''اللہ نہ کرے۔ ہاتھ پیر ٹوٹیں اُن کے جو..........''

''اُف!'' وہ اُن کے کوسنوں سے گھبرا کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور کتنی دیر بعد غیاث آیا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔

''یہ سب میری برداشت سے باہر ہے غیاث!''

''کیا کیا برداشت سے باہر ہے؟'' وہ اُلٹا اُس پر بگڑ گیا۔

''سنا نہیں، آپ کی اماں کیا کہہ رہی تھیں؟''

''ٹھیک تو کہہ رہی تھیں۔ تمہارے بھائیوں کا رُعب ہم پر نہیں چلے گا۔''

''میرے بھائیوں کو رُعب جمانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' اُسے بھی غصہ آ گیا۔ ماشاء اللہ اُن کی پرسنالیٹیز مرعوب کرنے والی ہیں اور آپ لوگ خواہ مخواہ اُن کے سامنے احساس کم تری کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اُس کی اتنی صاف گوئی پر تلملا گیا۔

''مطلب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔''

''تو تم بھی اچھی طرح سمجھ لو، میں تمہارے ساتوں بھائیوں کو ناکوں چنے چبوا سکتا ہوں۔'' وہ پیر پٹختا کمرے سے نکل گیا۔

عجیب مشکل تھی۔ شوہر تک اُس کی بات کو اہمیت دینا تو دُور کی بات سمجھنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ جو اُس کے اماں ابا کہتے وہی ٹھیک۔ جو بہن بھائی نے کہا وہی سچ اور ایک وہی غلط تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے اس گھر میں آنے سے پہلے ہی سب نے اُس کے خلاف محاذ بنا لیا تھا اور اُس نے کہاں ایسا ماحول دیکھا تھا۔ اس کے گھر میں تو سب بھابیاں ساتھ رہتی تھیں اور کبھی آپس میں معمولی رنجش بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہاں وہ پہلی بہو ہی کسی سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ہر آئے گئے کے سامنے اُسے پھوہڑ، بدسلیقہ اور بددماغ جیسے القاب سے نوازا جاتا۔

اس روز ایک بڑی بی نے اُس کی ساس کو ٹوک دیا۔

''بی بی! کیوں پیچھے پڑی ہو اس کے۔ ابھی تو بچی ہے پھر ماشاء اللہ بڑے گھر کی ہے۔ اگر بددماغ ہوتی تو تمہارے ڈربے نما گھر میں ایک دن نہ ٹکتی۔''

''آئے ہائے۔'' ساس پنجے جھاڑ کر بڑی بی کے پیچھے پڑ گئیں۔

''تم اور دماغ خراب کرو اس کا۔ کیا لگتی ہے یہ تمہاری؟''

''میں نے تو حق بات کہی ہے۔'' بڑی بی برقعہ سنبھالتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تمہارے تو آگ لگ گئی۔ پتا نہیں اس کے بھائیوں نے کیا دیکھا تم لوگوں میں۔ تمہارے جیسے تو پانی بھرتے ہوں گے ان کے سامنے۔''

''ویری گڈ!'' وہ اپنے کمرے میں کھڑی خوش ہو رہی تھی کہ کوئی تو اُس کی طرف داری میں بول رہا تھا۔

یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ راحیلہ کے لیے ایک دو جگہ سے رشتے آئے تو وقتی طور پر اُس کی طرف سے سب کا دھیان ہٹ گیا جس سے اُس نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ سارا وقت نہ صرف وہی موضوع ہوتی بلکہ تنقید کا نشانہ بنتی تھی۔ اُن دنوں غیاث بھی اچھے موڈ میں تھا جب ہی اُس نے اُس کے سامنے بھائی جان کی آفر رکھ دی۔

''غیاث! اُس روز بھی بھائی جان مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں انہیں آپ کے ڈاکومنٹس دے دوں اُن کے پاس بہت اچھی ویکنسی ہے۔''

''ہاں، مجھ سے بھی ذکر کیا تھا انہوں نے۔'' اُس کے سرسری انداز پر وہ جز بز ہو کر بولا۔

''پھر آپ دیر کیوں کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو آگے بڑھنے کا شوق نہیں ہے۔ اور اس وقت تو ضرورت بھی ہے۔ اگر راحیلہ کی بات طے ہو گئی تو پھر شادی کا کتنا خرچا آ جائے گا۔''

''ہوں۔ صبح دیکھوں گا۔'' اُس کا انداز ٹالنے والا تھا۔ پھر بھی صبح وہ اُس کے پیچھے پڑ گئی اور وہ بجائے اُس کی بات سمجھنے کے اُسے لے کر اپنے ماں، ابا کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کہتی ہے اس کے بھائی مجھے اچھی نوکری دلا دیں گے۔'' غیاث نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ اُس کی اماں چیخ پڑیں۔

''نہ، نہ، اس کے چکر میں نہیں آنا۔ اس نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ غیاث! خبردار اپنے ڈاکومنٹس نہیں دینا۔ پھاڑ کے پھینک دیں گے تو تم بالکل ناکارہ ہو جاؤ گے۔'' جمیلہ نے فوراً اماں کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ روہانسی ہو کر وہاں سے ہٹ گئی۔

''کیسی جاہلانہ سوچ ہے۔'' کچھ دیر بعد غیاث کمرے میں آیا تو وہ اُسے دیکھ کر پھٹ پڑی۔

''آخر میرے بھائیوں کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ایک تو وہ آپ کا بھلا سوچتے ہیں۔''

''بس اماں جو کہہ رہی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم خواہ مخواہ بحث مت کرو۔''

وہ اُسے خاموش کرا کے آفس کے لیے نکل گیا تو اُس نے بھی غصے میں اپنے کمرے کا دروازہ

بند کرلیا۔ کیونکہ جانتی تھی کہ اب سارا دن سب کے پاس یہی موضوع ہوگا۔ وقفے وقفے سے اُس کے بھائیوں کو بُرا بھلا کہا جائے گا۔ پھر دن میں وہ کھانا وغیرہ پکانے کے لیے کمرے سے نکلی بھی تو قصداً کسی سے بات نہیں کی۔ حقیقتاً اُسے دکھ ہو رہا تھا کہ اُس کے خلوص پر بھی شبہ کیا جاتا تھا۔ بھائی جان نے تو کہا تھا، تعلیم یافتہ لوگوں کا ماحول اچھا ہی ہوتا ہے اور اُن کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ بھی جلدی ہو جاتی ہے لیکن یہاں تو اُس کی بات ہی نہیں سنی جاتی۔ سارے دن وہ اپنے آپ کڑھتی رہی تھی۔

شام کو اُس کے بھتیجے نعیم، آصف اور طارق آ گئے تو اُسے اپنا موڈ خوشگوار کرنا پڑا۔ کیونکہ اُس کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ تھا کہ سب لوگ اُس کے بارے میں متجسس رہتے تھے۔ جس طرح وہ اپنے گھر میں ماں باپ، بھائیوں، بھابیوں اور بھتیجے بھتیجیوں کی لاڈلی تھی اس سے زیادہ تر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ سسرال میں نباہ نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک فطری سوچ تھی اور اکثر لوگ اُس کے منہ پر بھی کہہ چکے تھے جب ہی وہ خائف تھی کہ ایسا نہ ہو اتنی محبتیں اُس کے لیے الزام بن جائیں۔ اور ایک وہی نہیں اُس کے ساتھ سب اُس کے چاہنے والے قصوروار ٹھہرائے جائیں گے۔ اس لیے وہ اپنے گھر کی کوئی بات میکے میں نہیں کرتی تھی نہ اُن سب کے رویوں کی بابت کسی کو بتایا تھا۔ حالانکہ بھتیجوں کے ساتھ اُس کی بہت دوستی تھی۔ اپنے اسکول کالج کے قصے انہیں سنائے بغیر رہتی نہیں تھی اور اب اُن ہی کے سامنے پوز کر رہی تھی۔

''کہاں سے آ رہے ہو تم لوگ؟'' اُن کے حلیے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کہیں سے گھوم پھر کر آ رہے ہیں۔

''ہم لوگ ابھی وحید مراد کی فلم دیکھ کر آ رہے ہیں۔'' نعیم جانتا تھا کہ اُسے وحید مراد کتنا پسند ہے جب ہی چھیڑ کر بولا۔ تو وہ اُچھل پڑی۔

''ہائے سچ، کون سی کہاں لگی ہے؟''

''ڈریم لینڈ میں۔ لیکن آن! بہت بور فلم ہے۔''

''جی نہیں اُس کی فلم بور ہو ہی نہیں سکتی۔ میں ضرور دیکھنے جاؤں گی غیاث کے ساتھ۔'' اُس نے یقین سے کہہ کر اُن تینوں کو چڑایا۔ پھر پوچھنے لگی۔ ''کیا پیو گے چائے، ٹھنڈا؟''

''کچھ نہیں بس ذرا اپنی نندوں کا دیدار کرا دیجیے۔''

''اُف کتنے کمینے ہو تم لوگ۔'' اُس نے گھورا۔ پھر خود ہی کھی کھی ہنسنے لگی۔ اُس کی ہنسی ایسی ہی تھی روکے نہیں رُکتی تھی۔

''آن پلیز۔''

''پاگلو! وہ عمر میں مجھ سے بڑی ہیں۔ اُن کا دیدار کر کے کیا کرو گے۔'' وہ اس طرح ہنستی ہوئی بولی۔

''پھر تو ہمارا آنا بے کار ہوا۔ ہم تو سمجھے تھے......'' اُن تینوں کے چہروں پر مایوسی چھا گئی اور ایک دوسرے کو چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔

''مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے جوجو۔'' اُسے مذاق اُڑانے کا موقع مل گیا۔

''چلو یار! چلتے ہیں۔'' وہ تینوں خجل سے ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اچانک یاد آنے پر آصف کہنے لگا۔

''وہ آن! چاچا جی کا میسج دینا تھا آپ کو۔ کہہ رہے تھے غیاث انکل فوراً اُن سے مل لیں۔ بہت اچھی جاب ہے اُن کے پاس۔ گاڑی، بنگلہ سب۔''

''میں کہہ دوں گی غیاث سے۔'' وہ اسی قدر کہہ سکی تھی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے ایک آخری کوشش کے طور پر رات میں سب کے سامنے غیاث کو بھائی جان کا پیغام دیا۔ تو ہر بار کی طرح اب بھی اس سے پہلے اُس کی اماں بول پڑیں۔

''تو تم بنگلہ گاڑی کے خواب دیکھتی ہو؟''

''خواب وہ دیکھیں جنہوں نے بنگلہ گاڑی دیکھی نہ ہو۔'' وہ سلگ کر کہتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے پیچھے غیاث تلملایا ہوا آیا تھا۔

''کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔''

''میں جو ہوں وہی سمجھتی ہوں اور آپ کی ترقی وخوش حالی کی خواہش ایسی ناجائز نہیں ہے جو سب لوگ میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔''

وہ اُس کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں ایسے رویوں کی عادی نہیں ہوں غیاث۔ اپنی زندگی میں بس کبھی کسی مقام پر نظرانداز نہیں ہوئی۔ اتنا تو آپ سمجھتے ہیں نا۔ یا آپ کو صرف اپنی اماں، ابا کی بات سمجھ میں آتی ہے۔''

''ہاں میں صرف اُن ہی کی بات سمجھتا ہوں اور بس۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ تو وہ ہونٹ بھینچ کر اُسے دیکھے گئی۔ پھر تاسف سے سر جھٹک کر بولی۔

''ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی بھائی جان سے۔ انہیں تمہارے لیے تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم اس حال میں خوش ہو۔''

''اور وہ تمہاری بات سن کر خوش ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ محض اپنی اُونچی پوسٹ کا رُعب ڈالنے کے لیے اتنا شور مچا رہے ہیں۔''

یہ اُس کا کمپلیکس تھا جو باتوں ہی سے نہیں چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اور اپنے تئیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم نادان ہو خواہ مخواہ بھائیوں کی باتوں میں آ جاتی ہو۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اور میرے سامنے اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اچھا فرض کرو میں تمہیں طلاق دے دوں تو کیا کریں گے تمہارے بھائی سب؟''

اُس نے انتہائی تاسف سے اُسے دیکھا۔ پھر سوچ کر بڑے آرام سے بولی تھی۔

''کیا کریں گے میرے بھائی میری کسی اور اچھی جگہ شادی کر دیں گے۔''

''ہیں!'' وہ واقعی چکرا گیا تھا۔ ''تم دوسری شادی کر لو گی؟''

''میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا ہے اور بس۔'' اُس نے بات ختم کر دی لیکن اُس بات کا بتنگڑ بن گیا تھا۔

صبح جب وہ ناشتا بنا رہی تھی اسی وقت غیاث نے اپنی ماں سے جانے کیا کہا کہ اُس نے واویلا شروع کر دیا۔

''یہ نہیں بسنے والی۔ اس کے دماغ میں ہے کہ یہ دوسری شادی کرے گی۔ نکالو اسے باہر پھر میں دیکھتی ہوں کیسے اس کی دوسری شادی ہوتی ہے۔''

''طلاق کی بات آپ کے بیٹے نے کی تھی پہلے۔ میں نے اُس کی بات کا جواب دیا تھا۔'' وہ ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑی۔

''ارے وہ تو مرد ہے اور مرد تو ایسی باتیں کرتے ہیں۔ آگے بدمعاش عورتیں جواب دیتی ہیں۔''

''اونہہ مرد! یہ مردانگی ہے۔ روز اپنی عزت کا تماشا بنواتا ہے۔'' اُس نے دُکھ سے سوچا۔

''چل نکل۔ کوئی ضرورت نہیں یہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی۔'' ساس نے آ کر اُسے بازو سے پکڑ کر کچن سے باہر کھینچ لیا اور پھر وہ احتجاج کرتی رہ گئی۔ کسی نے ایک نہیں سنی۔ یہاں تک کہ وہ مٹی کا مادھو بھی خاموش کھڑا دیکھتا رہا تھا۔

اتنی ہمت ہی نہیں تھی اُس میں جو اپنی ماں کو روک سکے۔ اُس کے سامنے وہ اُسے اپنے گھر سے نکال کر میکے کی دہلیز پر چھوڑ گئی تھی۔

جانے کیوں جو باتیں پہلے سے فرض کر لی جائیں وہ ہو کر رہتی ہیں۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کے

باوجود لوگوں کے خدشات جھٹلانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ ایک سال تو ہو گیا تھا اُس کی شادی کو اور اس تمام عرصے میں اب جب کہ ساس خود اُسے چھوڑ گئی تھی تب اماں جی کو سارے حالات بتانے پڑے اور اماں جی تو سن کر رونے لگیں۔

''اتنے نازوں سے پالا ہم نے تمہیں، تمہاری ہر خواہش پوری کی اور وہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ میں کہتی ہوں تمہارے بھائی جان سے۔''

''نہیں اماں جی! کسی بھائی جان سے کچھ نہیں کہیں۔ خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔'' اُس نے عاجزی سے کہا۔

''لیکن بیٹا! خاموشی اختیار کرنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ اُس بڑھیا سے پوچھنا تو پڑے گا کہ وہ کس حساب سے تمہیں یہاں چھوڑ گئی ہے۔'' اماں جی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ پھر بھی وہ سوچ کر بولی۔

''کچھ دن انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے غیاث کو احساس ہو جائے اور وہ اپنی ماں کے اس اقدام کو غلط مان کر آ جائے۔ کیونکہ میری اُس سے تو لڑائی نہیں ہوئی اور نہ ہی اُس نے مجھے گھر سے نکلنے کو کہا تھا۔''

''کہا نہیں تھا لیکن دیکھ تو رہا تھا۔ روک نہیں سکتا تھا اپنی ماں کو۔''

''بزدل ہے۔ حالانکہ گھر میں سب سے بڑا ہے پھر بھی ڈرتا ہے۔ بہرحال آپ ابھی کسی سے کچھ نہیں کہیں۔''

اُس نے منت سے اماں جی کو خاموش رہنے پر آمادہ کر لیا تھا لیکن خود وہ خاصی پریشان تھی کہ غیاث تو اپنی اماں کے مشورے کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یہاں آنے کے لیے بھی وہ پہلے اُن سے پوچھے گا اور اگر بڑی بی نے اجازت دے بھی دی تو جو وہ کہیں گی یہاں آ کر وہ اُن ہی کی زبان بولے گا۔

اور یہی ہوا چار دن کے بعد وہ آیا اور آتے ہی اماں جی کے سامنے اُس کی شکایات کا دفتر کھول کر بیٹھ گیا۔

''بہت بد دماغ ہے یہ۔ ہم پر میکے کا رُعب جھاڑتی ہے۔ بات بے بات کہتی ہے سب کو ٹھوکر مار کر چلی جاؤں گی وغیرہ وغیرہ۔''

''افسوس تمہیں ٹھوکر مارنے والی ملی نہیں۔'' اُس نے سوچا اور دل تو چاہا اُس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دے، لیکن وہی خیال کہ لوگوں کے خدشات سچ نہ ہو جائیں وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

پھر کچھ دن سکون سے گزر گئے کیونکہ گھر میں راحیلہ کی منگنی کی تقریب ہونے والی تھی۔ اور وہ قدرے بے وقوف بھی تھی جو یہ سمجھتی رہی کہ چار دن میں سب کو اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اور اب کبھی اُس کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوگا اور وہ خود سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی تھی، اس لیے اُن دنوں بہت خوش تھی اور ہونے والی تقریب کا سارا انتظام اُس نے سنبھال لیا تھا۔ گو کہ صرف منگنی تھی پھر بھی اُس کی ساس نے نہ صرف سارے خاندان کو اکٹھا کر لیا تھا بلکہ قریبی عزیزوں کو رات میں بھی روک لیا تھا۔ جس پر وہ کوئی اعتراض تو نہیں کر سکتی تھی لیکن جگہ کی تنگی کے باعث پریشان ضرور ہو رہی تھی کہ اتنے سارے لوگ سوئیں گے کہاں۔ اور یہی پوچھنے کے لیے وہ جمیلہ کی تلاش میں آنگن میں آئی۔ جہاں سارے مہمان موجود تھے۔ وہیں اُن کے درمیان جمیلہ اور راحیلہ بڑے آرام سے سب کے سونے کا مسئلہ حل کر رہی تھیں۔

''یہاں چاچا، چاچی سوئیں گے۔ اِدھر سرہانے ماما، مامی کے لیے چارپائی ڈال دو اور تایا تائی کے لیے اُدھر۔''

اُس نے بے حد حیران ہو کر دونوں بہنوں کو دیکھا۔ حقیقتاً کوئی بیاہتا، بچوں کی ماں بھی سب کے درمیان اس طرح نہیں بول سکتی تھی جیسے وہ کہہ رہی تھیں۔ کوئی شرم، کوئی لحاظ نہیں اور سننے والے بھی بڑے آرام سے سن رہے تھے۔ اچانک اُسے بڑے زور کی ہنسی آئی تو دوپٹہ منہ میں دبا کر اُن ہی پیروں وہ اپنے کمرے میں آ کر ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' غیاث نے تکیے سے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ تو وہ اس طرح بے تحاشا ہنستی ہوئی بولی۔

''وہ جمیلہ اور راحیلہ سب کے سونے کا انتظام کر رہی ہیں۔''

''تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

چاچا، چاچی، ماما، مامی، تایا، تائی اور اگر غلطی سے مامی کے ساتھ چاچا اور چاچی کے ساتھ ماما ہو گیا تب؟'' اُسے غالباً اسی خیال سے ہنسی آئی تھی اور اب پیٹ پکڑ کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ غیاث کچھ نہیں سمجھا تو اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر کروٹ بدل گیا۔

اگلے روز منگنی کی خوشی میں اُس نے اپنی طرف سے سب کو ٹریٹ دینے کا اعلان کیا تو راحیلہ نے جھٹ قلعہ قاسم باغ چلنے کی فرمائش کر ڈالی۔ جسے اُس نے رد نہیں کیا اور شام میں اماں، ابا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ البتہ اُن سب کو اجازت دے دی تھی۔ اُس وقت وہ چاروں بہن بھائی بہت اچھے موڈ میں تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق اور اُس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جیسے ہمیشہ اُن کے درمیان ایسا ہی ماحول رہا ہو۔

بہرحال وہ نہ صرف خوش تھی بلکہ دعا بھی کر رہی تھی کہ اُس کی زندگی میں یہ خوشگوار فضا یونہی قائم رہے۔ پھر سب کو کھلانے پلانے میں اُس نے ذرا کنجوسی نہیں کی۔ دل کھول کر خرچ کیا۔ حالانکہ غیاث کی طرف سے اُسے کچھ نہیں ملتا تھا۔ یعنی اپنی ساری تنخواہ وہ اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھتا اور جیب خرچ کے نام پر بھی اُسے ایک پیسہ نہیں دیتا تھا۔ یہ اُس کے اپنے پیسے تھے جو جہیز میں ملے ہوئے مکان کے کرائے سے حاصل ہوئے تھے اور اپنی چھوٹی موٹی ذاتی ضروریات وہ اُن ہی سے پوری کرتی تھی۔ یہ اُس کے اندر محبتوں کا خوف تھا جو وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ ورنہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ اگر جو اپنی حیثیت کے زعم میں اُس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا لیکن وہ ایسی نہیں تھی، محبتوں کے سائے میں پروان چڑھ کر اُس نے محبت کرنی سیکھی تھی۔ جس طرح اُس کی بھاوجیں اُس سے محبت کرتی تھیں وہ بھی اُن ہی کی طرح مثال بننا چاہتی تھی اور کیونکہ ابھی اتنی میچور نہیں تھی اس لیے شاید اُن سب کے مزاج کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

غیاث بھی تو اُس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا تھا۔ ہر بات میں اُس کی نفی اور کہیں اُس کا دفاع بھی نہیں کرتا تھا۔ جب سب اُس پر تنقید کرتے تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ ابھی بھی سب نے مل کر اُس ساری تفریح کا مزہ غارت کر دیا تھا۔ حالانکہ تانگے پر بیٹھنے میں اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر اُن بہن بھائیوں کا احساس کم تری اپنے آپ ظاہر ہو جاتا تھا۔ شاید اُن کے اندر بھی یہ خوف تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کر دے جس سے حیثیتوں کا فرق ظاہر ہو۔ اس لیے تانگے پر بیٹھتے ہی قریب کھڑی گاڑی کو دیکھ کر راحیلہ بولی تھی۔

''یہ بھی کوئی سواری ہے۔ پاگل لوگ بیٹھتے ہیں اس میں۔''

''کس میں؟'' اُس نے شاید ٹھیک سے سنا نہیں تھا، یا سمجھی نہیں تھی۔

''ایسی گاڑی میں۔'' راحیلہ اُسے گاڑی کی طرف متوجہ کرتی ہوئی کہنے لگی۔ ''دیکھیں دیکھیں، وہ آدمی کتنا پاگل لگ رہا ہے۔''

''بالکل اُلو کی طرح۔'' جمیلہ بھی شروع ہو گئی اور وہ سمجھ گئی ان ڈائریکٹ اُس کے بھائیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

''یہ لوگ پیدل نہیں چل سکتے۔ ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہوتی ہیں کیا ان کی۔ اس سے اچھا سائیکل ہی چلا لیں۔''

''سائیکل کی کیا شان ہے۔'' غیاض کیوں پیچھے رہتا۔ ''پتا چلتا ہے کہ آدمی کے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔''

گھر میں داخل ہونے تک یہی موضوع تھا اور سسر صاحب جیسے منتظر تھے وہ بھی اولادوں کے ساتھ شروع ہو گئے۔ ایسی جاہلانہ گفتگو اور حرکتوں کو وہ حیران ہو کر دیکھتی رہی تھی اور پھر اُس نے تہیہ کر لیا کہ اُن کے ساتھ وہ ایسی باتوں پر کبھی نہیں اُلجھے گی۔ اُس کی بلا سے وہ کچھ بھی کہنے دیں۔ لیکن پھر اُس کی خاموشی بھی کسی سے گوارا نہیں ہوئی۔ جس کا مطلب تھا وہ جان بوجھ کر اُسے طیش دلاتے تھے۔ جانے اُن کا مقصد کیا تھا، وہ سوچتے سوچتے پریشان ہو جاتی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اُسے بے اولادی کے طعنے ملنے شروع ہو گئے۔ ساس نے بڑے یقین سے کہہ دیا کہ وہ بانجھ ہے۔ اُس سے اولاد نہیں ہو سکتی اور جس روز انہوں نے غیاث کی دوسری شادی کی بات کی اُس روز وہ اُس سے اُلجھ پڑی۔

''آخر آپ یہ ساری باتیں خاموشی سے کیوں سنتے رہتے ہیں۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''کیا بولوں؟'' جواب میں اُس نے اتنے آرام سے پوچھا کہ وہ رو پڑی۔

''میں بانجھ نہیں ہو سکتی۔ آپ چلیں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔''

''تمہارا مطلب ہے اماں غلط کہتی ہیں؟'' وہ اُس کی بات پر بُری طرح سلگ گئی تھی۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولی تھی۔

''میں آپ کی اماں کو چیلنج نہیں کر رہی غیاث! لیکن ڈاکٹر کے پاس جانے میں کیا حرج ہے۔''

''اچھا چلیں گے کسی دن۔'' اُس کا انداز ٹالنے والا تھا۔ وہ سمجھ کر بھی خاموش ہو رہی کیونکہ اُس سے اُلجھنا بے کار تھا۔ ہر بات تو وہ اپنی اماں سے کہہ دیتا تھا۔ البتہ اُس نے سوچ لیا کہ اب جب وہ اپنے میکے جائے گی تو کسی بھابھی کے ساتھ جا کر اپنا چیک اپ کرا لے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہی اُوپر والے نے اُس کی دُعائیں سن لی تھیں۔

اُس روز ابھی ناشتا کرنے کے لیے بیٹھی ہی تھی کہ اُسے بڑے زور کی ابکائی آئی۔ وہ بھاگ کر واش بیسن پر جا کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے اُس کی ساس وہیں آنگن میں موجود تھی۔ فوراً قریب آ کر دیکھنے لگی اور ظاہر ہے سمجھ بھی گئی کہ اُس کی گود بھرنے کے دن آ رہے ہیں اور بجائے خوشی کا اظہار کرنے کے چلانے لگی۔

''ہائے ہائے، بہو کو کوئی بیماری لگ گئی ہے۔ دیکھو تو کیسا پیلا پیلا پانی منہ سے نکل رہا ہے۔ غیاث! جلدی آؤ۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ اس کی اماں کے پاس چھوڑ آؤ۔''

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' اِدھر اُدھر سے سب نکل کر آ گئے۔ جمیلہ جو سب سے آگے تھی، ماں نے

اُس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

''اس کے قریب مت جاؤ۔ روگی ہے یہ۔ اللہ نہ کرے جو میری کسی اولاد کو ایسی بیماری لگے۔''

اور وہ اُس وقت کچھ بھی سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ناک اور آنکھوں سے بہتے پانی کو دوپٹے میں جذب کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ پھر بہت نڈھال سی اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد غیاث آیا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا۔

''چلو تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ دوں۔ اماں کہہ رہی ہیں یہ چھوت کی بیماری ہے خدانخواستہ یہاں..........''

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ غیاث! مت بات کرو مجھ سے۔'' وہ چیخ کر بولی تب بھی اُس کی آواز بہت ہلکی تھی اور خود کو اتنا کمزور محسوس کر کے اُس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

''مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ شام میں تیار رہنا۔''

وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تو اُس کی بے حسی پر وہ دُکھ سے رو پڑی۔ کتنی دیر گزر گئی کسی نے اُس کے کمرے میں جھانکا تک نہیں اور اُس کی حالت یہ تھی کہ سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ کمزوری اتنی کہ اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت نہیں دے پا رہی تھی۔ پیٹ الگ کچھ کھانے کا مانگ رہا تھا اور کسی سے کوئی اُمید نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ پھر کچن کی طرف جا رہی تھی کہ ساس کے کمرے سے باتوں کی آواز سن کر وہ قصداً رُک گئی۔ راحیلہ پوچھ رہی تھی۔

''اماں! کیا سچ مچ بھابھی کو کوئی بیماری لگ گئی ہے؟''

''ہاں!'' جمیلہ کی ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ ''وہ ماں بننے والی ہے۔''

''چپ!'' ماں نے فوراً اُسے چپ کرایا۔ ''خبردار غیاث کو پتا نہیں چلے۔ ابھی تو وہ ہمارے کہنے میں ہے اگر اولاد ہو گئی تو اُس کا ہو جائے گا۔''

''میرے خدا!'' وہ ابھی اپنے ماں بننے کا سن کر خوش ہونے لگی تھی کہ ایک دم ڈھے گئی۔

''لیکن اماں! غیاث سے یہ بات کب تک چھپے گی۔'' اس سے آگے وہ سن ہی نہیں سکی۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا تھا۔ بمشکل چارپائی کا سہارا لیا اور اس پر گرتے ہوئے اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نما آواز نکلی تھی۔ جسے سن کر وہ تینوں دوڑی آئیں۔

''کس نے کہا تھا تمہیں کمرے سے نکلنے کو۔ ارے کیا ہم سب کو مارو گی۔ چل، چل اُٹھ اور نکل یہاں سے۔''

اور گزشتہ کی طرح اب بھی بڑی بی کو روکنے والا کوئی نہیں تھا جو زبردستی اُسے رکشہ میں ڈال کر

میکے کی دہلیز پر چھوڑ گئی تھی۔

''اماں جی! وہ اتنی نڈھال ہو رہی تھی کہ فوراً کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ اشارے سے پانی پھر کھانا مانگا اور اماں جی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اُوپر سے چھوٹی بہو کو بلایا۔ انہوں نے ہی آ کر اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ پھر آرام سے بٹھا کر کتنی دیر اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہیں جب اُس کے حواس بحال ہوئے تب اُس نے اماں جی اور چھوٹی بھابھی کو ساری باتیں کہہ سنائیں۔''

''تم یہ اتنا کچھ برداشت کیسے کرتی رہیں؟'' بھابھی حیران تھیں۔ اور ایک وہی نہیں شام میں اماں جی نے جسے بتایا اُس نے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا۔

''اس دن کے انتظار میں کہ بچہ ہوگا تو شاید سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہاں تو معاملہ اور ہی بگڑ گیا۔'' وہ دُکھ سے بولی تو بھائی جان اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''کچھ نہیں بگڑے گا بیٹا! سب ٹھیک ہوگا۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں خود غیاث سے بات کروں گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں بھائی جان! وہ کسی کی نہیں سنتا۔ جو اُس کی ماں بہنوں نے کہہ دیا وہ بس پتھر کی لکیر ہے۔''

''پھر بھی بیٹا! بات تو کرنی پڑے گی۔'' بھائی جان نے کہا اور اُسے بہت تسلی دی۔ لیکن ہوا وہی جو اُس نے کہا تھا۔ غیاث یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور اپنی ماں کی بات کو سچ کہتا رہا۔

''اُسے کوئی بیماری ہے اور ایسی بیمار لڑکی کو میں اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔''

اُس کے بھائی جان نے میڈیکل رپورٹ اُس کے سامنے رکھی اُس نے وہ بھی جعلی قرار دے دی اور کچھ دنوں بعد اس نام نہاد بیماری کو بنیاد بنا کر اُسے طلاق بھی دے دی۔ اس انتہائی اقدام کے بارے میں کسی نے سوچا تک نہیں تھا اور اُسے دُکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوگئی تھی۔ دوسرے بنا کسی قصور کے یہ داغ اُس کی پیشانی پر لگا تھا۔ بہر حال یہاں وہ تنہا نہیں تھی۔ اُس کا دھیان بٹانے والے بہت تھے۔ جب ہی بہت جلد وہ اُس جہنم سے نکل آنے، یا نکالے جانے پر شکر کرنے لگی تھی۔

''ٹھیک کہتے ہو تم لوگ، غیاث کبھی نہیں سدھر سکتا تھا۔ اُس کی ماں بہنیں اگر مجھے زہر دے کر مار ڈالتیں تب بھی وہ ان کے اقدام کو صحیح قرار دیتا۔'' اُس وقت وہ اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے درمیان بیٹھی اُن کے خدشات کی تائید کر رہی تھی۔

''آپ نے غلطی کی آن! آپ کو شروع ہی میں بتانا چاہیے تھا۔''

''میں ڈرتی تھی، لوگ باتیں بنائیں گے۔''

''خواہ مخواہ لوگوں کے ڈر سے اُن کے ظلم وستم سہتی رہیں۔ فائدہ کیا ہوا۔''

''دفع کرو۔ مت ذکر کیا کرو اُن لوگوں کا۔'' وہ پریشان ہوکر بہت جلد یہ موضوع ختم کر دیتی۔

اور جب بہت پیاری سی گڑیا، سعدیہ اُس کی گود میں آئی تو سچ مچ سارے دُکھ بھول گئی تھی۔ اُسے یہ ملال بھی نہیں تھا کہ اُس کی بچی پدرانہ شفقت سے محروم کی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے کہیں بڑھ کر شفقتیں اُسے یہاں میسر تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماموؤں اور اُن کے بچوں میں یوں رچ بس گئی کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا وہ کس کی بیٹی ہے۔ سب بچوں کی طرح اپنی امی کو آن کہتی اور جو بچے اپنے باپ کو جس نام سے پکارتے وہ بھی اس طرح پکارتی تھی۔ ابی، ابو، ڈیڈی۔ آن نے بھی اُسے ماموں کہنا نہیں سکھایا اور یہی اُس بچی کے لیے بہتر تھا کہ اُس کے اندر اپنے بے حس باپ کا خانہ خالی نہیں رہا تھا اور اگر تھا بھی تو اُسے چودھری صاحب نے پُر کر دیا۔

اس وقت سعدیہ پانچ سال کی تھی جب اُس کے لیے آئے ہوئے پرپوزلز میں سے چودھری صاحب کا انتخاب کر کے اُس کے بھائیوں نے ایک بار پھر اُسے وداع کیا تھا اور اس بار انتخاب واقعی لاجواب تھا۔ خود اُس کی سوچ سے بڑھ کر۔

چودھری صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور تین بیٹے تھے۔ جو بہت خوشی سے اُس کی پیاری سی گڑیا کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جس سے اُس کے اندر کے خدشات اپنی موت آپ مر گئے۔ بہر حال وہ چودھری صاحب کے ساتھ بیاہ کر رحیم یار خان آئی تھی اور یہاں سے نئی زندگی کے آغاز پر ہی وہ بہت خوش تھی۔ ساری آسائشوں کے ساتھ چودھری صاحب کی محبت اور اُن کے بیٹے بھی بہت جلد اُس کے ساتھ مانوس ہو گئے تو زندگی میں جیسے کوئی کمی تھی نہ دُکھ۔ کبھی کبھی منہ سے کہی کوئی بات یوں پوری ہوتی ہے جسے غیاث کے پوچھنے پر اُس نے کہا تھا۔

''کیا کریں گے میرے بھائی۔ میری کہیں اور اچھی جگہ شادی کر دیں گے۔''

اُس وقت غیاث کا مقصد محض اپنی اہمیت جتانا تھا۔ جیسے اُس کے چھوڑ دینے سے وہ ساری زندگی رُلتی پھرے گی۔ اور وہ تو نہیں رُلی البتہ کہنے یا سمجھنے والا بیٹی کے پیچھے بھاگتا رہا۔ جانے اُس کے دل میں بیٹی کی محبت کب جاگی تھی۔ اور جاگی بھی تھی، یا اُس کی اطمینان بھری زندگی کو ڈسٹرب کرنا مقصود تھا۔ اگر دوسری بات ٹھیک تھی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کیونکہ اُسے اور کوئی دُکھ نہیں تھا بلکہ فدا اور اُس کے بعد مونی کی پیدائش نے تو اُسے بہت مضبوط کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ اندر سے خائف رہتی کہ کہیں وہ سعدیہ کو بہکا کر لے نہ جائے اور یہی خوف اُس نے سعدیہ کے دل

میں بھی ڈال دیا تھا جو وہ غیاث کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔

اور یہ طے ہے کہ انسان کہیں نہ کہیں مات ضرور کھاتا ہے۔ خواہ وقت کے ہاتھوں سہی۔ ہمیشہ جیتنے والا کہیں ہارتا ضرور ہے اور ہمیشہ ہارنے والے کی کہیں جیت بھی ہوتی ہے۔ اب اس مقام پر گو کہ آن ہاری نہیں تھیں، سعدیہ اُن کے پاس موجود تھی لیکن اُس کے دل میں ہمیشہ کے خوف نے جو آزردگی کی چادر اوڑھ کر غیاث سے نہ ملنے کی کسک کو جنم دیا تھا وہ انہیں بے چین کر گئی تھی۔ شاید یہ خون کی کشش تھی اور اس کی نفی کسی طرح ممکن نہیں تھی۔ پھر بھی آن کو کچھ تو کہنا تھا۔

''اسی لیے میں نے تمہیں غیاث سے دُور رکھا۔ جب میرے ساتھ انہوں نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تو تمہارا پتا نہیں کیا حشر کرتے اور میں تو تمہاری طرف آنے والی گرم ہوا کا رُخ موڑ دیتی ہوں۔ جانتی ہو نا۔'' انہوں نے اُس کی خالی خالی آنکھوں میں جھانکا تو اتنی دیر سے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کر کے وہ قصداً ذرا سا مسکرائی پھر اُن کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

''آپ نے جو کیا اچھا کیا آن! مجھے آپ سے تو کوئی گلہ نہیں۔ بس مجھے غیاث کے مرنے کا دُکھ ہو رہا ہے۔''

''قدرتی بات ہے بیٹا! آخر تمہارا باپ تھا۔ دُکھ تو ہو گا۔''

''لیکن آن! میں نے اُسے کبھی باپ سمجھا نہیں، پکارا نہیں پھر۔'' اُس کی عاجزی میں احتجاج تھا جیسے یہ دُکھ زبردستی اُس کی جھولی میں ڈالا گیا ہو۔ آن دھیرے دھیرے اُس کا ہاتھ تھپکنے لگیں۔ کہا کچھ نہیں مبادا اور رو پڑے۔

وہ جتنی نرم دل تھی، اتنی ہی لاپروا بھی تھی۔ اسی لیے آن کا خیال تھا کہ کچھ دنوں میں وہ سب بھول بھال جائے گی اور بظاہر ایسا ہی ہوا۔ سارے میں اُس کی ہنسی کی جل ترنگ سنائی دینے لگی۔ مونی کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنا اور فدا کی چھیڑ چھاڑ پر ہنستے ہنستے اچانک اُلجھ پڑنا۔ آن کے ساتھ چودھری صاحب بھی مطمئن ہو گئے کہ وہ اپنی زندگی میں لوٹ آئی ہے اور لوٹ آنا اُس کی مجبوری تھی کہ وہ اپنے اتنے چاہنے والوں کو دُکھ نہیں دے سکتی تھی۔ اتنے دنوں سے گھر پر اداسیوں کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اُس دن اچانک اُسے احساس ہوا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہے۔

آن بولائی بولائی پھر رہی ہیں۔

فدا اور مونی اُس کے پاس آتے ہیں لیکن اُس کی خاموشیوں سے سہم کر پلٹ جاتے ہیں۔

اور چودھری صاحب، جنہیں اُس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ابا جی کہا تھا اور حقیقتاً انہوں نے حقیقی باپ سے بڑھ کر اُسے پرورش کیا تھا۔ انہیں بھی غالباً احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اُس کے باپ نہیں ہیں۔ یہ ساری باتیں محسوس کرتے ہی وہ اپنے خول سے نکل آئی تھی اور غیاث کے دُکھ کو اپنی تنہائیوں میں رکھ چھوڑا تھا۔

پھر آن کی خواہش پر بڑی مشکل سے اُس نے خود کو دوبارہ کالج جانے پر آمادہ کیا ورنہ اُس کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا اور یہ وہی جانتی تھی کہ دل کیوں نہیں چاہتا۔ ہر راستے پر وہی شخص تھا، تعاقب کرتا ہوا اور اُس کی آواز کی بازگشت ساری آوازوں پر حاوی تھی۔

''سعدیہ! میری ایک بات سن لو۔''

''سنو۔'' کالج کے سامنے گاڑی سے اُترتے ہی وہ بے اختیار اس گھنے پیڑ تلے آن کھڑی ہوئی اور اُس سے مخاطب کر کے بولی۔ ''وہ جو تمہارے سائے تلے ٹھہرتا تھا وہ چلا گیا۔ اب کبھی نہیں آئے گا۔ اُس نے تم سے کچھ کہا تھا، میرے بارے میں، میں اُس کی بیٹی ہوں۔''

''سعدیہ!'' دُور سے ندا نے پکارا تھا۔ وہ چونک کر پلٹی اور جلدی جلدی پلکیں جھپک کر آنکھوں میں تیرتی نمی اپنے اندر اُتارنے لگی۔

''کہاں ہو تم؟'' ندا قریب آ کر بولی۔ ''کیا ملتان سے اب آ رہی ہو۔''

''نہیں، بہت دن ہو گئے۔'' اُس نے گیٹ کی طرف قدم بڑھایا۔

''پھر آ کیوں نہیں رہی تھیں؟''

''بس، ملتان سے آئی تو بیمار ہو گئی اور تم لوگوں کو اتنی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ آ کر پوچھ لو۔''

''ہاں۔ تو جیسے الہام ہوا تھا۔ ویسے کافی کمزور لگ رہی ہو۔'' ندا نے چلتے چلتے رُک کر اُسے دیکھا تو وہ اپنی طرف سے اُس کا دھیان ہٹانے کی خاطر فوراً موضوع بدل گئی۔

''یہ بتاؤ فنکشن کیسا تھا؟''

''زبردست۔ وہ گیت جو اس روز تم گا رہی تھیں اور فنکشن میں تھرڈ ائیر کی ایک لڑکی نے گایا تھا لیکن اُس کی آواز اتنی اچھی نہیں تھی۔'' ندا بتا کر پوچھنے لگی ''اور تمہاری کزن کی شادی کیسی رہی؟''

''اچھی۔ کافی انجوائے کیا ہم نے۔'' اُس کا انداز سرسری تھا۔ جیسے اس موضوع پر بھی بات نہ کرنا چاہتی ہو۔

''تم ابھی بھی کچھ سُست ہو رہی ہو۔'' ندا نے فوراً محسوس کر کے ٹوکا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہوں اصل میں آج بھی میرا کالج آنے کا موڈ نہیں تھا بس آن کی ناراضگی کے خیال سے چلی آئی۔''

''اتنی چھٹیاں کر کے تمہارا دل نہیں بھرا۔''

''نہیں۔'' وہ ندا کو چڑا کر ہنسی اور بھاگ کر کلاس روم میں چلی گئی۔ پھر اُس کی وہ روٹین شروع ہوگئی تو وہ کافی حد تک بہل گئی تھی۔ خصوصاً فدا اور مونی کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

یہ دونوں چھوٹے بھائی اُس کی جان تھے۔ فراغت کے سارے لمحات وہ اُن ہی کے ساتھ لگی رہتی۔ گو کہ فدا کی شرارتیں بعض اوقات بدتمیزی کی حد کو چھونے لگتی تھیں۔ بہت تنگ کرتا تھا وہ اُسے۔ اُس کے کمرے میں آ کر خوب اودھم مچاتا اور وہ بس تھوڑی دیر کے لیے خفا ہوتی تھی۔ اس وقت وہ پڑھنے کا موڈ بنا کر بیٹھتی تھی کہ فدا ٹیپ ریکارڈ لے کر اُس کے کمرے میں آ گیا جسے دیکھتے ہی وہ عاجزی سے بولی۔

''فدا! پلیز، یہاں نہیں بجانا۔''

''اِدھر ابا جی سو رہے ہیں اور مجھے اپنا کیسٹ چیک کرنا ہے۔'' فدا پر اُس کی عاجزی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بڑے آرام سے پلگ لگا کر بٹن آن کر دیا۔

سانولی سلونی سی محبوبہ۔

''ہائے چھٹنکو! یہ کیسٹ تم کب لائے؟'' اُسے جب فدا پر پیار آتا تھا تو اُسے اسی نام سے پکارتی تھی اور جب وہ تنگ کرتا تو چپو کہتی۔

''تمہارے لیے نہیں لایا۔'' اُس کے پیار کا انداز سمجھنے کے باوجود فدا نے ٹکا سا جواب دیا۔ تو اُس نے ہونٹ سکیڑ کر اُس کی نقل اُتاری۔

''تمہارے لیے نہیں لایا۔ بڑا آیا چپو۔''

''کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھ لیا کرو۔'' فدا نے تپ کر کہا۔ تو وہ اُسے مزید چڑانے کی خاطر زور زور سے ہنسنے لگی۔ تبھی آن دروازے سے جھانک کر اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

''بچو! کیا ہو رہا ہے؟'' پھر اندر آ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے فدا کو ٹوکا۔ ''آواز آہستہ کرو فدا! باہر تک جا رہی ہے۔''

''میں بند ہی کر دیتا ہوں۔'' فدا نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ کا بٹن دبا دیا تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔

''میں نے بند کرنے کو تو نہیں کہا بیٹا! سنو مگر آہستہ آواز میں۔'' آن نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن فدا کا موڈ غالباً آف ہو چکا تھا جب ہی دوبارہ ٹیپ آن نہیں کیا۔

''چلو میں گاتی ہوں۔'' وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجاتی ہوئی بولی۔ ''پتا ہے آن! مجھے کالج فنکشن میں گانا تھا لیکن ہم ملتان چلے گئے۔ فدا بتا رہی تھی یہ گیت کسی اور لڑکی نے گا دیا۔''

''کون سا؟''

''میں سُناتی ہوں۔ شروع میں پتا نہیں کیا ہے مجھے یہاں سے آتا ہے۔''

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو
تتلیوں کے، جگنوؤں کے
دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو
روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
ہمیں

معاً اُس کی نظر فدا پر پڑی جو اُس کی آواز ٹیپ کر رہا تھا۔ وہ گانا بھول کر چیخ پڑی۔

''چپو! ٹیپ کر رہا ہے۔''

''بھونڈی آواز۔'' فدا نے فوراً پلگ کھینچ دیا اور ٹیپ اُٹھا کر جانے لگا کہ وہ پھر چیخی۔

''مجھے تو سننے دو اپنی آواز۔''

''جی نہیں، کبھی نہیں سننے دوں گا۔'' وہ چڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تو اُس نے آن کو دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگیں۔

''جانے دو، پھر کسی وقت سن لینا۔ ابھی اُس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔''

''آپ نے خراب کیا ہے اُس کا موڈ۔ اچھا بھلا وہ کیسٹ سن رہا تھا۔ میں بلا کر لاتی ہوں۔''

اُس سے بھلا کہاں خفگی برداشت ہوتی تھی۔ اُٹھ کر جانے لگی کہ آن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات؟'' اُس نے عدم توجہی سے کہا تو آن ٹوک کر بولیں۔

''سعدیہ! مجھے حسرت ہے کہ کبھی تم توجہ سے میری بات سنو اور سمجھو پھر اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ بھی دو لیکن تم.........''

"اوفوہ! آپ بات بتائیں۔" وہ تمہید سے جھنجھلا گئی۔ تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آن کہنے لگیں۔

"ابھی جب ہم ملتان گئے تھے تو بھائی جان نے مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی تھی۔ اسرار کا پرپوزل دیا ہے انہوں نے۔"

"بھائی جان اسرار، وہ تو امریکہ میں ہیں۔" اُس کی حد درجہ معصومیت سے کسی کسی وقت آن واقعی پریشان ہو جاتی تھیں۔

"امریکہ میں ہے تو کیا ہوا، اُس کی شادی نہیں ہونی؟ بہرحال دو مہینے بعد وہ چھٹی پر آنے والا ہے اور بھائی جان نے کہا ہے اُس وقت نکاح کر دیں گے۔ پھر جب اُس کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تب رخصتی کریں گے اور میں نے اُن سے ہامی بھر لی ہے کیونکہ مجھے اسرار پسند ہے۔ چودھری صاحب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔" آن کو یقین تھا کہ وہ کوئی اعتراض نہیں اُٹھائے گی کیونکہ اپنے بارے میں تو وہ سوچتی ہی نہیں تھی اور واقعی وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ انہیں دیکھے گئی۔ معاً اعزاز کی بات یاد آئی۔

"ایک اہم بات سن لو کہ میں نے تمہیں آن سے مانگ لیا ہے۔"

"کیا سوچنے لگیں؟" آن کے پوچھنے پر وہ چونک کر بولی۔

"آن! وہ بھائی جان اعزاز تو کہہ رہے تھے۔ انہوں نے آپ سے بات کی ہے آئی مین۔"

"ہاں کہا تھا اعزاز نے مجھ سے۔ لیکن میں نے صاف منع کر دیا اس لیے کہ تمہارے ساتھ اُس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"

پھر قدرے رُک کر پوچھنے لگیں۔ "اعزاز نے ڈائریکٹ تم سے بات کی تھی؟"

"جی!" وہ سر جھکا گئی۔

"خیر، اب اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خود بھائی جان نے اس کے بجائے اسرار کا پرپوزل دیا ہے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟" آن نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تو حسب عادت وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر بولی۔

"مجھے کیا پتا آپ اور ابا جی بہتر جانتے ہیں۔"

"یہاں تک تو ٹھیک ہے سعدیہ کہ تم نے اپنی ہر بات ہر معاملہ ہم پر چھوڑ دیا لیکن آگے زندگی میں یہ سب نہیں ہوتا بیٹا! اب تمہیں.........."

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بڑے آرام سے اُٹھ کر بیڈ پر جا لیٹی۔ تو آن نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس معاملے میں شاید وہ اپنے باپ پر گئی تھی کہ سننا اور سمجھنا اُس کی سرشت میں نہیں تھا۔ فرق

اتنا تھا کہ وہ صرف بیوی کی نہیں سنتا تھا اور یہ اپنے آپ سے لاپروا تھی۔ ورنہ باقی سب لوگ اُس کے لیے بہت اہم تھے۔ آن اپنے بھائیوں میں سے کسی کا ذکر کریں، یا بھتیجے بھتیجیوں کا وہ پوری جان سے متوجہ ہوتی تھی، کیونکہ آن کی طرح اُس کی دنیا بھی کچھ محدود تھی اور وہ اس میں خوش اور مگن رہتی تھی۔ اُسے پتا تھا کہ سب لوگ اُس سے بہت پیار کرتے ہیں اور شاید اتنی محبتوں ہی نے اُسے خود سے بے نیاز کر دیا تھا۔ جیسے لاشعور میں کہیں یہ یقین موجود ہو کہ اُس کے ساتھ سب اچھا اچھا ہی ہونا ہے اور ابھی تک تو سب ٹھیک ہی تھا۔ اسرار کے ساتھ اُس کی نسبت طے کر کے آن بھی نہ صرف مطمئن بلکہ اُس کے نکاح کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کسی دن اچانک اسرار آ جائے گا لیکن اس کے برعکس ملتان سے بھائی جان آ گئے اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں نے اسرار کا پرپوزل دیا تھا لیکن اُس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اگلے چار پانچ سالوں تک اُس کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں لگتا اور میرا خیال ہے اتنا عرصہ سعدیہ کو بٹھائے رکھنا مناسب نہیں۔"

"پھر؟" آن مجسم سوالیہ نشان بن گئیں۔

"پھر میں نے سوچا اعزاز بھی تو ہے۔" انہوں نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ آن بے اختیار بول پڑیں۔

"نہیں بھائی جان!"

"انکار نہیں کرو بیٹا! سعدیہ میرے گھر میں خوش رہے گی۔ کیونکہ اُس کا زیادہ وقت میرے بچوں کے ساتھ گزرا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ پھر کیا فرق ہے اسرار اور اعزاز میں۔ دونوں میرے بیٹے ہیں اور سعدیہ بھی میری اپنی بیٹی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کہیں اور کسی اجنبی ماحول میں جائے۔ تم جانتی ہو اجنبی لوگوں میں ایڈجسٹ ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔" بھائی جان نے سمجھاتے ہوئے کہا تو اُن کی آخری بات پر آن نے سر جھکا دیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی جان! مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ اعزاز پڑھتا نہیں ہے۔"

"اُس کا باپ بھی پڑھے گا۔ اُس کی تم فکر نہیں کرو۔"

"پھر مجھے انتظار تو اتنا ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ایک سال میں تو اعزاز گریجویشن بھی نہیں کر سکتا۔ چار پانچ سال لگیں گے اُسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں۔"

آن کا انداز سوچتا ہوا تھا جیسے آن کا ذہن ان ساری باتوں کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔

"وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ اعزاز کو اوّل تو نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہے وہ میری زمین

جائیداد سنبھالے گا۔ تمہارا مسئلہ صرف سعدیہ ہے جس کی تم جلد شادی کرنا چاہتی ہو اور میں تمہارا مسئلہ حل کرنے آیا ہوں۔ کہو تو اگلے جمعہ اعزاز کی بارات لے کر آ جاؤں۔ اُن کی بات ٹھیک تھی۔ پھر بھی آن شش و پنج میں پڑ گئیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔ گو کہ نہ سعدیہ اُن پر بوجھ تھی نہ اس کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ ابھی تو وہ ٹین ایج سے بھی نہیں نکلی تھی۔ چار پانچ سال بڑے آرام سے گزر سکتے تھے لیکن غیاث کی موت کو جس طرح اُس نے دل پر لے لیا تھا اُس سے آن خائف تھیں۔ جانتی تھیں کہ وہ کتنی حساس ہے۔ اس لیے اُس کا دھیان بٹانے کی خاطر اُس کی زندگی کو نیا رنگ دینا چاہتی تھیں اور یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کے بھائی جان اُن کی طرح اُن کی بیٹی سے بھی غافل نہیں تھے۔

''پھر کیا کہتی ہو تم؟'' اُن کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بھائی جان نے ٹوکا۔ تو چونکنے کے ساتھ وہ گہری سانس کھینچ کر بولیں۔

''ٹھیک ہے بھائی جان! جیسا آپ مناسب سمجھیں لیکن اعزاز پڑھے گا ضرور۔ اُسے آپ صرف زمین جائیداد کے لیے نہیں رکھیں۔''

''اُس کی تم فکر نہیں کرو۔'' بھائی جان انہیں یقین اور اطمینان دلا کر گئے تھے۔

اور جب اُس نے سنا تو حسبِ عادت کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا۔ یوں جیسے اُسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ رات میں جب سونے کے لیے لیٹی تو پہلی بار دل کے دروازوں پر دستک ہونے لگی تھی۔

''سنو، اپنے بھائی جانوں کی لسٹ سے میرا نام خارج کر دو۔''

''اوں ہوں۔'' اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کروٹ بدلتی ہوئی دھیرے سے بڑبڑائی۔ ''کتنے بے ایمان ہیں بھا۔ نہیں صرف اعزاز۔''

اور پھر ان تھوڑے سے دنوں میں اُس نے بڑے بڑے سندر سپنے سجا لیے تھے۔ اُن کا خیال ٹھیک تھا۔ زندگی کا یہ نیا رنگ اُس کے اندر کی خلش پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی اور شادی کی شاپنگ کے لیے بھی جب آن کہتیں وہ اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتی اور یہ دن جیسے پر لگا کر اُڑ رہے تھے کہ اچانک آن کے سب سے بڑے بھتیجے نعیم کی وفات سے بھاگتا ہوا وقت جیسے تھم گیا۔

''سعدیہ!'' اس اطلاع پر آن بڑے زور سے چیخی تھیں۔ وہ اپنے کمرے سے ننگے پیر بھاگی آئی۔

''کیا ہوا آن؟''

''بیٹا! وہ وہ نمی چلا گیا۔''

''کون بھائی جان نعیم کہاں چلے گئے!''

وہ سمجھی نہیں۔ پھر بھی پریشان ہو گئی تو آن ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑیں۔ بس اب کچھ ہی دن تو تھے کہ سب لوگ بارات کے ساتھ آن کے گھر آنے والے تھے اور اب وہ سارا قافلہ بھائی جان اقبال کے گھر اُترے گا جہاں اُن کا لاڈلا پیارا بیٹا نعیم دولہا بنے گا۔

انہوں نے فوراً رختِ سفر باندھ لیا اور سعدیہ کو ہدایات دینے لگی تھیں کہ اُس نے سننے سے صاف انکار کر دیا اور اُن سے پہلے بھاگ کر گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ اُس کے اتنے چاہنے والے آنسو بہائیں اور وہ یہاں بیٹھی خواب سجاتی رہے۔

اور جیسے ایک اُس کا دامن تھا سب کے آنسو سمیٹنے کے لیے۔ اتنی چھوٹی سی معصوم لڑکی ایک ایک کے پاس جا کر منتیں کرتی پھر رہی تھی۔

''نہیں روئیں نا۔ نہیں روئیں نا۔''

آن کی نظریں اُس کے ساتھ ساتھ بھٹکتی رہیں۔ کسی کسی وقت اپنی کوکھ سے جنم دی ہوئی یہ لڑکی خود اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جو اپنے لیے کسی کو آزردہ نہیں کرنا چاہتی تھی جب ہی اپنے دُکھ، اپنے آنسو خوب صورتی سے چھپا لیتی لیکن دوسرے کی آنکھ کی ذرا سی نمی بھی اُسے تڑپا دیتی تھی اور یہاں تو جواں مرگی سے کہرام مچا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا بس ایک وہی ہوش میں تھی۔

''بھائی جان! نہیں روئیں نا!'' اس وقت وہ نوید کے پاس کھڑی اُس کی منت کر رہی تھی کہ عقب سے اعزاز نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

''تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''کیوں میں کیوں نہ آتی؟ آپ کو پتا ہے بھائی جان نعیم مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے۔''

''مجھے پتا ہے، سب تم سے پیار کرتے ہیں۔'' وہ خواہ مخواہ جیلس ہو رہا تھا۔ اگر اُس کا دھیان اندر کی طرف نہ ہوتا تو ضرور محسوس کرتی۔

''اس لیے کہ میں سب سے پیار کرتی ہوں۔'' وہ اُس کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر اندر چلی گئی۔

پھر ابھی اس سانحے کو تیسرا دن تھا کہ آن کے بھائی جان نسیم کی موت نے تھکی تھکی خشک ہوتی آنکھوں کو ایک بار پھر اشکبار کر دیا۔ اور اس بار وہ سب سے چھپ کر سیڑھیوں کے نیچے جا بیٹھی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس لیے کہ بھائی جان نسیم کو وہ اُن کے بچوں

کی طرح ڈیڈی پکارتی تھی اور شاید ڈیڈی کے ساتھ ہی اُسے اپنا باپ یاد آیا تھا جس کے لیے وہ سب کے سامنے آنسو نہیں بہا سکتی تھی۔ مبادا کوئی پوچھ لے، ہماری محبت، ہماری شفقت میں کوئی کمی تھی اور کمی تو کہیں نہیں تھی پھر بھی دل پر ایسی چوٹ پڑی تھی جو اُسے لگتا تھا زندگی کی آخری سانسوں تک وہ بھلا نہیں پائے گی۔

اور پھر آن جو اُس کے اندر کی خلش مٹانے کی خاطر جلد سے جلد اُس کی زندگی کو نیا رنگ دینا چاہتی تھیں وہ بھائی اور بھتیجے کی ناگہانی اموات سے غم سے نڈھال ہو گئیں۔ تو وہ پھر اپنا دکھ چھپا کر اُن کی دل جوئی میں لگ گئی تھی۔

”آن! آپ اپنا نہیں ابا جی کا خیال کریں۔ وہ کتنے چپ چپ رہنے لگے ہیں۔ آپ جانتی ہیں وہ آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتی ہو سعدیہ! تمہیں کیسے پتا کہ تمہارے ابا جی مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں تو اپنا پتا نہیں ہے۔“

”آپ کو تو بس وہم ہے۔ ہر بات میں مجھے گھسیٹ لیتی ہیں۔ جائیے ابا جی کے پاس۔“ وہ انہیں لاؤنج میں دھکیل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”آن کہتی ہیں مجھے اپنا پتا نہیں۔“ جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہیں آن! لیکن اس میں قصور میرا تو نہیں ہے۔ اُن محبتوں کا ہے جنہوں نے مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ میری جڑیں کہیں اور ہیں۔ بچہ بچہ اتنا فراخ دل کہ کبھی لڑائی میں بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میرے ابی کو تم ابی مت کہو، یا میرے ڈیڈی کو تم ڈیڈی مت کہو۔ یہ تمہارے ڈیڈی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ہر گھر میں میرے وجود کو یوں تسلیم کیا جاتا ہے جیسے میں نے اسی گھر میں جنم لیا ہو اور جنم تو میں نے اُس گھر میں بھی نہیں لیا۔ شاید آن مجھے اپنے آنچل میں چھپا کر لائی ہوں گی کہ جانے چودھری صاحب کی اتنی بڑی حویلی میں میرے لیے جگہ ہو گی بھی کہ نہیں۔ لیکن اس حویلی سے بڑے اس کے مکینوں کے دل ہیں۔ یہاں بھی وہی محبتیں، وہی چاہتیں، بے لوث، بے غرض پہلے مقام پر ہی یہ تمہارے ابا جی ہیں اور آج تک مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ابا جی کی بیٹی نہیں ہوں۔ کتنا خیال کرتے ہیں سب لوگ میرا۔ پھر میں اپنا پتا کیوں رکھوں۔ آن تو بس یونہی زبردستی کوئی نہ کوئی فکر پال لیتی ہیں۔“ وہ یونہی سوچتے سوچتے جانے کب نیند کی وادیوں میں اُتر گئی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے کتنے دن بیت گئے۔ اُس کی کیونکہ شادی تیار تھی جو مقررہ تاریخ پر تو نہیں ہو سکی البتہ آن کے بھائی اور بھتیجے کے چالیسویں کے بعد ہونا طے پائی وہ بھی سادگی سے۔ اس لیے بارات میں ایک طرف اعزاز کے سب گھر والے شامل تھے۔ باقی گھروں میں سے ایک ایک یا دو افراد شریک ہوئے تھے۔ اور وہ اگر بابل کا آنگن چھوٹ جانے سے افسردہ تھی تو آگے یہ خیال خوش کن تھا کہ اب وہ مستقل ملتان میں رہے گی جہاں جانے کے لیے وہ بے قرار رہتی تھی۔ کچھ ملی جلی کیفیات میں گھری انہی پرانی راہوں پر وہ اپنے ہم سفر کے ساتھ روانہ ہوئی تو اُس کی آنکھوں میں سنہرے سجیلے خواب انگڑائیاں لے رہے تھے۔

اُس کے لیے یہاں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ خصوصاً یہ گھر اور یہ کمرہ جسے اُس کا حجلۂ عروسی بنایا گیا تھا۔ کیونکہ گزشتہ تمام عرصے میں وہ جب بھی ملتان آئی تھی اسی کمرے میں ٹھہرتی تھی۔ بہرحال کچھ دیر وہ اپنی سات نندوں کے جھرمٹ میں رہی جن میں پانچ شادی شدہ تھیں۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں وہ بس ہنستی رہی۔ کچھ شرمیلی سی ہنسی تھی جو اُس کے حسین چہرے کو حسین تر بنا رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ عام دنوں میں بھی اپنے تمام کزنز میں سب سے نمایاں نظر آتی تھی اور اب دلہن کے روپ میں تو اور قیامت ڈھا رہی تھی۔

”چلو بھئی نکلو یہاں سے۔ ادھر اعزاز بڑی بے قراری سے ٹہل رہا ہے۔“

سب سے بڑی توبیہ ساری بہنوں کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئی تو بس چند لمحے تنہائی کے میسر آئے تھے۔ اس کے بعد اعزاز آ گیا اور آتے ہی بولا تھا۔

”میں جو چیز پسند کر لوں اُسے حاصل کر لیتا ہوں۔ تمہاری آن نے تو مجھے صاف منع کر دیا تھا لیکن دیکھ لو۔“

”کیا دیکھ لوں؟“ وہ اپنی ازلی سادگی سے اُسے دیکھنے لگی۔ تو وہ ہنس پڑا۔ پھر اُس کے سامنے بیٹھ کر سرتاپا اُسے دیکھتا ہوا بولا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“

”تھینک یو۔“ اُس کی پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

”صرف تھینک یو سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ اچانک کچھ جارحانہ انداز میں اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کی کلائی میں پڑے کنگن چھو کر کہنے لگا۔ ”یہ کنگن مجھے دے دو بلکہ یہ سارا زیور، یہ سب کچھ میرا ہے۔ میرا ہے نا۔“

''جی!'' وہ نہ صرف حیران ہوئی بلکہ اُس کے انداز سے کچھ ڈر بھی گئی۔

''ہاں ہاں کہو۔ میرا ہے سب کچھ۔'' اور اگر اس میں ذرا سی بھی ہوشیاری ہوتی تو ہاں کے ساتھ یہ بھی کہتی کہ میں بھی تمہاری ہوں لیکن وہ اپنی سادگی سے مار کھا گئی۔

''نہیں اعزاز! آپ نے تو زیور کے نام پر مجھے بس یہ دو چوڑیاں دی ہیں باقی سب تو......''

''کیا باقی سب؟'' اُس کے سخت لہجے پر وہ ایک دم خاموش ہوگئی تو قدرے توقف سے وہ اُس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر ہنس پڑا۔

''ارے! میں تو مذاق کر رہا تھا اور تم، خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ وہ جو تمہارے باپ نے تمہارے لیے تین لاکھ کا چیک چھوڑا تھا وہ کہاں گیا؟''

''وہ ان ہی پیسوں میں سے میں نے اپنے لیے یہ زیور بنوایا ہے اور باقی جو بچے ہیں وہ میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔'' اُس نے صاف گوئی سے بتایا۔ تو کچھ دیر کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ حیرت سے بولا۔

''اچھا میرا تو خیال تھا وہ چیک تمہارے سوتیلے باپ نے لے لیا ہوگا۔''

''سوتیلا باپ!'' اُسے شدید دھچکا لگا تھا۔ ''سوتیلا باپ آپ کسے کہہ رہے ہیں؟''

''چودھری صاحب۔''

''کیوں کیا کمی کی انہوں نے، یا میری پرورش میں کہیں کوتاہی کی۔ اتنا تو غیاث میرے لیے نہیں کر سکتا تھا جتنا انہوں نے کیا اور آپ انہیں......'' اس کی آواز بھر آگئی تو اُس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''کچھ بھی ہو، وہ کہلائے گا سوتیلا باپ اور میں تمہیں اب کسی سوتیلے رشتے سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم صرف اپنے خونی رشتوں کو یاد رکھو۔'' وہ اُس کے رونے کی پروا کیے بغیر بولا۔

''خونی رشتے؟'' وہ ہاتھ نیچے گرا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہاں غیاث کے بھائی، بہنیں اور اُس کا بیٹا۔ صرف وہی تمہارا سگا بھائی ہے۔ باقی چودھری صاحب کے بیٹوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ فدا اور موتی بھی تمہارے سوتیلے بھائی ہیں۔''

''اُف فدا اور موتی میرے ماں جائے۔'' اُسے اعزاز کی دماغی حالت پہ شبہ ہونے لگا، جو نئی زندگی کی ابتدا پر ہی اُسے سگے، سوتیلے کی پہچان کرانے بیٹھ گیا تھا۔ جانے اُس کا مقصد کیا تھا۔

''اور ہاں!'' وہ اُٹھ کر واش روم کی طرف جاتے جاتے رُک کر بولا۔ ''اُن سب کے ساتھ اُن کو بھی بھول جاؤ۔''

''میرے خدا!'' اُسے لگا جیسے وہ ایک دم تنہا ہوگئی ہو۔ اتنی ساری محبتیں چھن جانے کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ چیخ کر کمرے سے باہر نکل آئی اور چوکھٹ سے پیشانی ٹیک کر مزید چیخوں کو روکنے کی سعی میں اُس کا وجود جھٹکے کھانے لگا تھا۔

''کیا ہوا سعدیہ؟'' آنٹی (ساس) غالباً اُس کی چیخ کی آواز سن کر آئی تھیں۔

''پتا نہیں آنٹی! اندر بہت گھٹن ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ تیز سانسوں کے درمیان رُک رُک کر بول رہی تھی۔ چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔

''کیوں اعزاز نہیں ہے اندر؟'' آنٹی نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔ ساتھ ہی کمرے کے اندر جھانکا جو اسی وقت واش روم سے نکل کر سامنے آگیا۔

''اعزاز! یہ سعدیہ۔''

''ہاں! عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔'' وہ فوراً آگے آکر بولا۔ ''آپ سوئیں جا کر۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی اُسے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور دروازہ بند کر دیا۔

اُس نے کب کبھی اپنے بارے میں سوچا تھا۔ بس ابھی چند دن ہی تو ہوئے تھے۔ خوابوں کی خوب صورت وادی میں وہ کسی خوش رنگ تتلی کی مانند اُڑتی پھر رہی تھی۔ اگر معلوم ہوتا کہ خوابوں کی تعبیر اتنی بھیانک ہوتی ہے تو وہ اپنی آنکھوں پر پہرے بٹھا دیتی۔ کس قدر سنگ دلی و سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا اعزاز نے۔ اُسے دُکھ کے ساتھ حیرت گھیرے ہوئے تھی کہ وہ تو کبھی ایسا نہیں تھا بلکہ بچپن سے اب تک سب سے زیادہ اُس کا خیال رکھنے والا تھا۔ اُسے کس بات نے اتنا وحشی بنا دیا تھا۔ سوچتے سوچتے اُس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی تھیں۔ رات کے آخری پہر کہیں جا کر نیند مہربان ہوئی تو تکلیف دہ سوچوں سے نجات ملی تھی۔

اگلے روز ولیمے کی تقریب میں وہ بہت کوشش سے بھی خود کو خوش تو کیا نارمل بھی پوز نہیں کر سکی۔ ایک ہی رات میں وہ یوں کملا گئی تھی جیسے اُس پر کوئی سانحہ بیت گیا ہو۔ اور سانحہ ہی تو تھا کہ نئی زندگی کی ابتدا پر ہی اعزاز نے اُسے محبتوں کے حصار سے کھینچ کر اپنے کسی انتقام کی سولی چڑھا دیا تھا۔ شاید اپنے رجیکٹ کیے جانے پر وہ اتنا زہریلا ہو رہا تھا۔ حالانکہ جانتا بھی تھا کہ وہ کتنی حساس ہے۔ محبتوں کے حصار سے تو نکل کر تو اُس کی حالت جل بن مچھلی کی سی تھی۔

''خبردار کسی سے بات کی تو۔'' سارا دن وقفے وقفے سے وہ انتہائی سخت لہجے میں اُسے تنبیہ کرتا رہا تھا اور وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ جب اُسے مہمانوں کے درمیان لا کر بٹھایا گیا تو اُس نے باقاعدہ گھونگھٹ نکال کر اپنا چہرہ چھپا لیا حالانکہ وہاں سب اُس کے اپنے تھے۔

''ارے سعدیہ! کل تو تم نے گھونگھٹ نکالا نہیں تھا اور اب۔'' کزن نادرہ نے اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے اُس کا گھونگھٹ اُلٹ دیا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولی۔ ''کل تم بہت پیاری لگ رہی تھیں ابھی بھی اچھی لگ رہی ہو۔ بھائی جان اعزاز بھی اچھے لگ رہے ہیں۔''

اُس کی پلکیں اُٹھ کر نہیں دیں۔ مبادا اتنی پیاری کزن سے نظریں ملتے ہی وہ بے اختیار ہو جائے۔

''اِدھر دیکھو نا میری طرف، کوئی بات کرو۔'' نادرہ اُس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔ ''اچھا ہمارے ہاں آؤ گی نا؟''

اُس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر ایک کے بعد ایک کزن نے اُس کے پاس آ کر شوخ و ذومعنی جملوں سے اُسے شرمانے اور کھلکھلانے کی کوشش کی لیکن وہ اسی طرح گم صم بیٹھی رہی جب کہ اُس کا دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

ایسا کب سوچا تھا اُس نے۔ بلکہ وہ تو خوش ہی اس خیال سے تھی کہ یہاں سب کے ساتھ اُس کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔

''آن! سعدیہ کو کیا ہوا ہے؟'' کہیں قریب ہی آن کو سب نے گھیر لیا تھا۔ وہ ایک ایک کی آواز سننے لگی۔

''کل تو اتنی پیاری لگ رہی تھی۔''

''اب تو پہچانی بھی نہیں جا رہی۔''

''لگتا ہے کسی نے جان بوجھ کر اس کا اتنا خراب میک اپ کیا ہے۔ ورنہ وہ تو میک اپ کے بغیر ہی اتنی اچھی لگتی ہے۔''

وہ آن کا جواب سننا چاہتی تھی لیکن وہ جانے کیوں خاموش تھیں۔ اُسے لگا جیسے وہ ہر ایک کی بات پر بس سر ہلا رہی ہوں۔ تب اُس کا دل چاہا وہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ سب کو خاموش کرا دے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن وہ کب کسی کے سامنے روئی تھی۔ بلکہ شاید اُسے رونا سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ کبھی تو کسی نے اُسے ہرٹ کیا ہوتا، یا کوئی ایسی بات جو اُس کے دل میں ترازو ہوتی۔

''میرے ابی کو تم ابی مت کہو۔''

''یہ صرف میرے ڈیڈی ہیں۔ تمہارے نہیں۔''

بچوں میں ایسی باتیں ہوتی ہیں پھر اُس کے ساتھ کیوں نہیں ہوئیں۔ اتنا بڑا خاندان اور اس

میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے اُسے اُس کے اپنے باپ کی کمی کا احساس دلا کر رونا سکھایا ہوتا، یا اُس کے ہاتھ سے کوئی کھلونا چھین کر محرومی کا احساس بخشا جاتا۔ تب بھی وہ روتی یہ کیسی محبتیں ہیں جنہوں نے اُسے اظہار کرنا نہیں سکھایا اس کے برعکس اظہار کی راہ میں اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ پہلی بار وہ محبتوں سے شاکی ہو رہی تھی۔

پھر اِدھر کھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو آن اُسے اُٹھا کر اُس کے کمرے میں لے آئیں اور اُس کے کملائے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''تمہیں پتا ہے نا گڑیا کہ تم مجھ سے کوئی بات نہیں چھپا سکتیں۔ جلدی بتاؤ، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

''آن!'' اُس نے عاجزی سے ابھی اس قدر کہا تھا کہ اعزاز آ گیا۔ یہ اُس کے دل کا چور تھا جو فوراً پیچھے چلا آیا تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں آن! باہر سب آپ کا پوچھ رہے ہیں۔''

''ہاں، میں سعدیہ کو یہاں چھوڑنے آئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے۔'' آن اُس کی آمد پر جزبز ہو کر بولیں۔ تو اُس نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے دونوں کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ پھر تکیہ سیدھا کرتا ہوا بولا۔

''تم آرام کرو سعدیہ! میں منع کر دیتا ہوں سب کو۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ آیئے آن! اسے آرام کرنے دیں۔''

''تم چلو، میں ذرا سعدیہ کے پاس بیٹھوں گی۔'' آن بڑے آرام سے اُس کے پاس بیٹھ گئیں تو وہ اُسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا اور فوراً ہی اپنی بہن ارم کو اندر بھیج دیا جس سے آن اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی تھیں۔

اور پھر گزشتہ شب کی طرح اس شب بھی اعزاز کے پاس وہی باتیں تھیں۔ ''یہ سب زیور اور تمہارے اکاؤنٹ میں جتنا پیسہ ہے سب میرا ہے، کیونکہ میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔''

''ہاں سب آپ کا ہے۔'' اُس نے جان چھڑانے کی خاطر کہہ دیا۔ پھر پوچھنے لگی ''آپ زیور کا کیا کریں گے؟''

''کچھ بھی کروں تمہیں کیا۔'' وہ سگریٹ سلگا کر دُور جا بیٹھا۔

اور بات صرف زیور اور پیسے پر ختم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اُس کی لگائی ہوئی پابندیاں ناقابلِ برداشت تھیں۔ وہ خاندان میں کہیں آ جا نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی آ جائے تو اُس سے بات کرنا تو دُور

کی بات سامنے جانا بھی منع۔ اچھا پہننے پر پابندی۔

میک اپ تو بڑی بات لپ اسٹک تک لگانے کی اجازت نہیں۔

حقیقتاً اُسے عرش سے کھینچ کر فرش پر پٹخ دیا تھا اُس شخص نے اور یہ نہیں تھا کہ گھر میں اور کسی کو خبر نہیں تھی سب دیکھ رہے تھے اور اُسے ٹوکنے کے بجائے مزید شہہ دے رہے تھے۔ ایک بار اُس نے ابی سے کہنے کی کوشش کی کہ اعزاز کو سمجھائیں تو وہ اُلٹا اُسے سمجھانے بیٹھ گئے۔

''بیٹا! وہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ اُس کی ہر بات تمہارے لیے حکم درجہ رکھتی ہے اور اُس کا حکم ماننا تمہارے فرائض میں شامل ہے۔''

وہ انتہائی دل گرفتہ سی اُن کے پاس سے اُٹھ کر آ گئی۔ دُکھ اس بات کا تھا کہ اتنے برسوں میں کسی کا یہ روپ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اب اچانک چہروں سے نقاب اُترے تھے تو ساری محبتوں پر سے اُس کا اعتبار اُٹھ رہا تھا۔

''کیوں، کیا ضرورت تھی نقاب چڑھانے کی؟'' اُس روز وہ اعزاز سے اُلجھ پڑی۔ ''آپ ہمیشہ اس روپ میں نظر آتے تو میں شروع ہی سے ان ہی رویوں کی عادی ہو جاتی اور مجھے آپ سے زیادہ افسوس ابی پر ہے جو مجھے مجازی خدا کا درجہ سمجھانے بیٹھ گئے۔''

''کیا غلط کہا انہوں نے اور تمہیں تو شکر گزار ہونا چاہیے ابی کا جنہوں نے تم جیسی یتیم و لاوارث لڑکی کو بہو بنانا منظور کیا۔''

''اُف!'' شدت غم سے اُس کا دل پھٹنے لگا۔ ''میں یتیم و لاوارث نہیں ہوں اعزاز۔ اللہ سلامت رکھے ابا جی کو۔''

''ہونہہ ابا جی!'' وہ نخوت سے بولا۔ ''تمہارا باپ مر چکا ہے اور سوتیلے رشتوں کو میں تسلیم نہیں کرتا۔''

''آپ کے تسلیم نہ کرنے سے میرے اُن کے ساتھ رشتے ٹوٹ نہیں جائیں گے۔ وہی میرے وارث ہیں۔''

''تم میری بات کو غلط کہو گی۔'' وہ دست درازی پر اُتر آیا اور انتہائی بے دردی سے اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا پچھلے کمرے میں لے جا کر بند کر دیا اور اگلے دن تک اُس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کھانا پانی ندارد۔ پھر اُوپر والے کو رحم آیا تھا جو رحیم یار خان سے فدا اُسے لینے آ گیا۔

''جاؤ لیکن دوبارہ یہاں نہیں آنا۔'' وہ اُسے روک نہیں سکا۔ تو واپسی کے دروازے بند کر دیئے۔

آن اپنی نازوں پلی گڑیا کو دیکھ کر چکرا گئیں۔ اس سے بہتر حلیے میں اُن کی ملازمائیں پھر رہی تھیں۔ فوراً اُسے اپنے جلو میں چھپا کر اُسے کمرے میں لے آئیں۔

''پہلے نہا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرو پھر میں تم سے بات کرتی ہوں۔'' وہ چپ چاپ بیگ میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد نہا کر نکلی تو آن وہیں اُس کے انتظار میں اور بہت فکرمند بیٹھی تھیں۔ وہ سمجھ گئی اب اُسے ایک ایک بات دُہرانی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل سے برش اُٹھا کر آن کو تھمایا اور اُن کے پیروں کے پاس کارپٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''میں بہت تھک گئی ہوں آن! کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔''

''کھانا کھا کر سونا۔'' آن نے غائب دماغی سے کہا۔ پھر اُس کے بال سلجھاتے ہوئے چیخ پڑیں۔ ''یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے سعدیہ! یہ یہاں سے بال بالکل غائب ہیں۔''

''اعزاز بہت ظالم ہے آن! اس بے دردی سے بال کھینچتا ہے کہ..........''

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' آن کو جیسے یقین نہیں آیا۔ جھٹکے سے اُس کا رُخ اپنی طرف موڑ کر پوچھنے لگیں۔ ''وہ مارتا ہے تمہیں، کیوں؟ تم نے بھائی جان سے نہیں کہا؟''

''اُن سے کیا کہوں؟ وہ تو......'' وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو قدرے سناٹے میں آ کر آن نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اُن کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بس آہستہ آہستہ اُسے تھپکتی رہیں۔ کتنی دیر بعد وہ اُن کے کندھے سے سر اُٹھا کر بولی۔

''پتا نہیں آن! کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں مجھ سے۔ لگتا ہی نہیں کہ وہی ابی کا گھر ہے جہاں سب لوگ سعدیہ سعدیہ کرتے تھے اور آپ کو اور ابا جی کو کتنی عزت دی جاتی تھی۔ اب تو کہتے ہیں میں آپ کا نام نہ لوں اور ابا جی کو میرا سوتیلا باپ کہتے ہیں۔ فدا اور مونی میرے بھائی نہیں ہیں۔ میں یتیم و لاوارث ہوں۔ مجھ پر ترس کھا کر ابی نے مجھے اپنی بہو بنایا۔ وہ سب ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' آن گم صم اُسے دیکھے جا رہی تھیں۔ قدرے توقف سے وہ پھر گویا ہوئی۔

''اوّل روز سے اعزاز کا رویّہ میرے ساتھ انتہائی ہتک آمیز ہے۔ جیسے میں اُس کی بیوی نہیں باندی ہوں اور اس قدر پابندیاں کہ آپ سنیں تو حیران ہوں۔ پہننے اوڑھنے پر، ہنسنے بولنے پر اور گھر میں کوئی آ جائے تو اُس کے سامنے جانے تک کی اجازت نہیں۔ اُس روز بڑے ابی آئے لاؤنج میں سے مجھے پکار رہے تھے۔ سعدیہ سعدیہ بیٹا کہاں ہو اور اِدھر کمرے میں اعزاز مجھے سختی سے منع کر رہا تھا کہ میں اُن کی پکار کا جواب بھی نہیں دوں۔ وہ بے چارے مجھ سے ملنے آئے تھے کیا سوچتے ہوں گے۔ اتنی بد دماغ ہو گئی ہوں میں۔ ساری کزنز کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں کسی سے نہیں ملتی۔ شادی کے

بعد بہت بدل گئی ہوں۔ میں نہیں بدلی آن! مجھے اعزاز نے سب سے دُور کر دیا ہے۔
اور اس قدر حریص و بدنیت ہے کہ اوّل روز سے میرے زیور اور پیسے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے سب کچھ مجھے دے دو۔ مجھے دینے میں اعتراض نہیں ہے۔ لیکن پتا تو چلے کہ وہ کرے گا کیا۔ پوچھنے پر مارتا ہے۔ کہتا ہے تمہیں کیا۔ اور آن! اُس نے مجھے پریگ نینسی میں مارا تھا۔ میرا ابارشن ہو گیا۔''

''بس کرو بیٹا!'' آن میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ کتنی دیر وہ سر تھام کر بیٹھی رہیں پھر جیسے اپنے آپ سے بولی تھیں۔

''کوئی بات ہے جو ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی لیکن میں جان لوں گی۔''

''بہت مشکل ہے آن! اُسے سمجھنا۔''

''کوئی ایک بھی تمہارا ساتھ نہیں دیتا۔ ثوبیہ، ارم، تانیہ، بھائی جان، بھابھی جان؟'' آن نے اُس کی بات اَن سنی کر کے پوچھا۔ تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

''نہیں۔ اور دُکھ تو اسی بات کا ہے۔ میری چیخیں سن کر سب اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔''

''اچھا تم اُٹھو، کھانا کھا کر آرام کرو، میں تمہارے ابا جی سے......''

''نہیں آن پلیز نہیں۔ آپ ابا جی سے کچھ نہیں کہیں۔ انہیں بہت دُکھ ہو گا۔ میں انہیں دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر اتنی عاجزی سے بولی کہ اُن کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

''میں نے تو تمہیں کبھی پھول کی چھڑی سے نہیں چھوا میری بچی! ہاتھ ٹوٹیں گے اُس نامراد کے۔''

''خدا کے لیے آن! ایسی باتیں نہیں کریں۔''

''اچھا چلو کھانا کھاؤ'' آن اُسے ساتھ لے کر کمرے سے نکلیں۔ پھر اُسے ڈائننگ ٹیبل پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔ صرف اس لیے کہ وہ آرام سے کھانا کھا لے۔ اور اس وقت تک اُس کی بھوک مر چکی تھی پھر بھی اُس نے تھوڑا بہت کھا لیا۔ اس کے بعد سیدھی ابا جی کے کمرے میں گئی اور کتنی دیر اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کا حال احوال پوچھتی رہی۔ جب سے اعزاز نے انہیں اُس کا سوتیلا باپ کہنا شروع کیا تھا تب سے اُس کے دل میں اُن کی محبت اور عقیدت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔

''خوش تے ہے نا سعدیہ پتر۔'' ابا جی کو اُس کے چہرے کی زردی پریشان کر رہی تھی۔ بار بار یہی سوال کر رہے تھے۔

''جی ابا جی! آپ کی دعائیں ہیں۔''

''کمزور بہت ہو گئی ہے تو۔ ابی کے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملتا۔''

''سب کچھ میسر ہے ابا جی! بس پچھلے دنوں کچھ بیمار رہی ہوں اس لیے آپ کو کمزور لگ رہی ہوں گی۔''

''اچھا خوش رہ۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔'' مشفق لہجہ اُس کی آنکھیں گیلی کرنے لگا تو وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر اگلے کئی دن آن نے قصداً اعزاز کا ذکر نہیں چھیڑا۔ یوں بھی شادی کا موقع تھا۔ چودھری صاحب کے بیٹے جمی کی شادی تھی۔ آن بڑی دونوں بہوؤں کے ساتھ تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں اور وہ سارا وقت فدا اور مونی کے ساتھ خود کو بہلائے رکھتی۔ اُس وقت اچانک یاد آنے پر وہ فدا سے کہنے لگی۔

''فدا! تم نے جو میری آواز ٹیپ کی تھی۔ وہ مجھے سنوا دو۔''

''ہاں، بڑی اچھی آواز ہے جو مجھے سنوا دو۔'' فدا اُسے تنگ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا تھا۔

''میری آواز اچھی ہے، یا نہیں بس تم سنوا دو۔''

''وہ کیسٹ ہی پتا نہیں کہاں چلی گئی بلکہ میرا تو خیال ہے تم لے گئی ہو۔'' فدا نے کہا تو وہ چیخ پڑی۔

''کیا کیا، میں کیوں لے جاؤں گی۔ کبھی ہاتھ لگایا ہے میں نے تمہاری چیزوں کو۔''

''کیوں نہیں۔ ہر وقت تو میری الماری میں گھسی رہتی تھیں۔''

''ہوں میری الماری میں گھسی رہتی تھیں چپو'' وہ اُس کی نقل اُتار کر اُس کی طرح دانتوں کی نمائش کرنے لگی تو وہ چڑ کر بولا۔

''اب تو بھول جاؤ اس کیسٹ کو۔ کبھی نہیں سنواؤں گا۔''

''میں تو جیسے مری جا رہی ہوں۔ رکھو سنبھال کے اپنے پاس کام آئے گی۔'' وہ رُوٹھے لہجے میں کہہ کر اُٹھنے لگی تھی کہ آن آ گئیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کچھ پیکٹ اور شاپرز تھے۔ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''سعدیہ! کھول کر دیکھو۔ جمی کی شادی پر پہننے کے لیے تمہارے کپڑے اور شوز وغیرہ۔''

''آپ کیوں لائی ہیں؟'' وہ شاپر کے اندر جھانکتی ہوئی بولی۔

''اعزاز کو دکھانے اور جلانے کے لیے کہ اُس کا سگا باپ اُس کے لیے اتنا نہیں کرتا جتنا تمہارے لیے تمہارا سوتیلا باپ کرتا ہے۔'' آن کہہ کر فوراً کمرے سے نکل گئیں اور وہ اُن کے لہجے

پر غور کرتی رہ گئی۔

اُسے اعزاز کے آنے کی اُمید نہیں تھی، کیونکہ ایک تو وہ اُس کے یہاں آنے پر ناراض تھا۔ دوسرے اُس پر واپسی کے دروازے بھی بند کر دیئے تھے۔ اس کے باوجود اُن کو جانے کیوں یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا اور اُن کا یقین سچ ثابت ہوا۔ جمی بھائی کی شادی پر تو نہیں البتہ ولیمے والے روز وہ سہ پہر ڈھلنے سے پہلے آ گیا اور یوں پوز کرنے لگا جیسے بڑی مصروفیات میں سے بمشکل وقت نکال کر آیا ہو۔ حالانکہ اُس کے پاس سرے سے کوئی مصروفیت تھی ہی نہیں۔ جیسا کہ شادی سے پہلے اُس کے ابی نے کہا تھا کہ وہ تعلیم جاری رکھے گا اور ساتھ میں اُن کی زمین جائیداد بھی سنبھالے گا تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

اُن کو سعدیہ کی زبانی معلوم ہو چکا تھا لیکن اب کیونکہ داماد کا معاملہ تھا اس لیے انہوں نے اُس پر کچھ ظاہر نہیں کیا بلکہ جیسے اُس کا یقین کر رہی ہوں اور نہ چاہتے ہوئے اُسے اہمیت بھی دینی پڑی۔ ورنہ حقیقتاً دل یہ چاہ رہا تھا کہ کھڑے کھڑے سارے حساب بے باق کر کے اُسے نکال باہر کریں۔ بہرحال ولیمے کی تقریب میں دُور ونزدیک کے سب عزیز رشتہ دار مدعو تھے۔ شام ڈھلتے ہی وسیع، عریض لان رنگین قمقموں سے جگمگانے لگا۔ جب مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو پوری فضا مہک اُٹھی۔

وہ اس وقت مونی کا ہاتھ تھامے اپنی ازلی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ ایک ایک کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے اعزاز کو بھی دیکھ لیتی جو بہت لیے دیئے انداز میں بیٹھا اور مسلسل اُسے گھور رہا تھا۔ وہ بہت کوشش سے بھی نظر انداز نہیں کر سکی اور آن سے تھک جانے کا بہانہ کر کے اُس کے پاس آ کر بیٹھنے لگی تھی کہ وہ فوراً اُٹھتے ہوئے بولا۔

''آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، تیز قدموں سے لان سے نکل گیا۔ وہ مہمانوں سے معذرت کرتی اُس کے پیچھے اندر آئی تو زہرخند سے بولا۔

''بہت شوق ہے تمہیں اپنی نمائش کرنے کا۔ خبردار جو اب اس کمرے سے نکلی تو۔''

''لیکن اعزاز! وہاں سب لوگ ہمارا پوچھیں گے۔'' وہ یہی سمجھی کہ وہ بھی اُس کے ساتھ یہیں بیٹھے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بولا۔

''فکر مت کرو۔ میں سب کو مطمئن کر دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا تو وہ روہانسی ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس سے تو اچھا تھا وہ آتا ہی نا۔ خواہ مخواہ دل جلانے آ گیا تھا۔ زندگی میں

ایسی ہل چل سے وہ کتنی خوش ہوتی تھی۔ اپنی ہر کزن کی شادی پر وہ سب سے پہلے پہنچتی تھی اور اب اپنے ہی گھر کی شادی میں پابند کر دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آن اُسے ڈھونڈتی ہوئی آئیں تو خفگی سے بولیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ باہر سب تمہارا پوچھ رہے ہیں۔''

''اعزاز ہے نا وہاں، سب کو مطمئن کر دے گا۔'' وہ آزردگی میں گھری اپنی چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔

''کیا مطلب؟'' آن اُس کے قریب چلی آئیں۔

''مجھے نہیں پتا۔ بس آپ جائیں یہاں سے۔''

''تم بھی چلو۔'' آن نے اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ پیچھے کرتی ہوئی قدرے جھنجھلا کر بولی۔

''اعزاز منع کر گیا ہے کہ سب کے سامنے نہیں آنا۔''

''اور وہ خود اُلو کا پٹھا سب کے درمیان کیا کر رہا ہے۔ اُسے بھی یہاں بلاؤ۔ بلکہ میں بلاتی ہوں۔'' آن انتہائی غصے میں کمرے سے نکل گئیں تو وہ ایک دم پریشان ہو گئی اور پھر اُن کے پیچھے جانے کا سوچ رہی تھی کہ وہ اعزاز کو ساتھ لے کر آ گئیں اور خاصی ناگواری سے کہنے لگیں۔

''یہ کون سا طریقہ ہے اعزاز؟ گھر کی شادی میں تم نے اسے پابند کر کے بٹھا دیا ہے۔''

''ابی نے منع کیا تھا آن! سعدیہ گیدرنگ میں نہیں جائے گی۔ مجھے انہوں نے بھیجا ہی اس لیے ہے اور میں خود بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ خود سوچیں وہاں سب غیر لوگ ہیں۔ سعدیہ کا کیا رشتہ ہے کسی سے۔'' وہ اپنی سطحی ذہنیت چھپا نہیں سکا، یا کوشش ہی نہیں کی۔ جس پر آن چیخ کر بولیں۔

''تمہارا بھی کوئی رشتہ نہیں کسی سے پھر تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ یہیں بیٹھو سعدیہ کے پاس میں تم دونوں کا کھانا یہیں بھجوا دوں گی۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اور آن کے جانے کے بعد اُس سہمی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر بولا۔

''اپنی اوقات بھول گئی ہو۔ جاؤ کپڑے بدلو اور سنو، ہمیں صبح سویرے ہی یہاں سے نکلنا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی چپ چاپ اپنے کپڑے لے کر واش روم میں چلی گئی۔

پھر آن کا خیال تھا وہ فراغت سے بیٹھ کر اعزاز سے بات کریں گی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے لیکن اُس نے موقع ہی نہیں دیا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جب آن نے کمرے میں آ کر جھانکا تو وہ سو رہا تھا اور صبح سویرے ہی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ تو آن بس سعدیہ کو تسلی ہی دے سکیں کہ وہ بہت

جلد ملتان آئیں گی اور بھائی جان سے بات کریں گی۔

''آئندہ تم یہاں نہیں آؤ گی۔'' گیٹ سے گاڑی نکالتے ہی وہ اُسے وارن کرتا ہوا کہنے لگا۔ اس گھر پر آخری الوداعی نظر ڈال لو۔ تمہارا میکہ غیاث کا گھر ہے اور اس کے گھر والوں سے میں تمہیں ملنے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن اگر یہاں آنے کا سوچو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔''

''میرے خدا!'' اُس نے سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں۔ اُس کی زندگی کی ناؤ جانے کس دھارے پر بہہ نکلی تھی۔ غیاث زندہ ہوتا تو بات بھی تھی۔ اُس کے گھر والوں سے وہ کیسے ملے جنہوں نے اُس کی ماں کو نہیں بسنے دیا تھا۔ کیا یہ شخص صرف رشتوں کی پہچان کرانے اُس کی زندگی میں آیا ہے جسے خود اپنی پہچان نہیں۔ تمام راستہ اُس کی پلکوں کے اندر جمع ہونے والے آنسو قطرہ قطرہ اُس کے نرم دل پر ٹپکتے رہے تھے۔

''بہو بیگم آ گئیں۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی ابی کا طنزیہ لہجہ اُس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ تو وہ کچھ بے خیالی میں رُک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ہو گئی چودھری صاحب کے بیٹے کی شادی۔''

''جی......''

''چلو تمہارا سوتیلا باپ پہلی بیوی کے بچوں سے فارغ ہو گیا۔ اب تمہاری آن کے بیٹے رہ گئے ہیں۔'' ابی کا انداز ہنوز تھا۔ اُس کا دل چاہا پوچھے۔ میری آن آپ کی کیا لگتی ہیں لیکن وہ ہونٹ بھینچ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہی روز و شب شروع ہو گئے تھے اور جس روز اعزاز کو معلوم ہوا کہ وہ اپنے لاکر کی چابی اور چیک بک وغیرہ آن کے پاس چھوڑ آئی ہے اُس روز سے وہ جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ ذہنی اذیتوں کے ساتھ جسمانی اذیتیں دے کر اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔

''تم غلطی کر گئے اعزاز!'' اُس روز وہ اُس سے بولی۔ ''میرے لیے روپیہ پیسہ، زیور کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان سب کے ساتھ میں اپنی جان بھی تم پر وار دیتی اگر جو تم محبت سے مانگتے لیکن تم نے تو اوّلین شب کے اوّلین لمحوں میں ہی اپنے چہرے سے نقاب اُتار دیا تھا اور تمہارا بھیانک روپ دیکھتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں دوں گی۔''

''میں تمہاری جان لے لوں گا۔'' وہ انتہائی غضبناک ہو کر اُس پر جھپٹا تھا۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ آن آ گئیں۔ اتنے دن بھی انہوں نے بمشکل صبر کیا تھا۔ ہر

پل اُن کا دھیان بیٹی ہی کی طرف رہتا تھا اور اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ یوں جیسے برسوں کی مریض ہو۔ کتنی دیر آن اُسے دیکھ کر گم صم کھڑی رہیں۔ وہ خوش رنگ تتلی کی مانند اُڑتی ہوئی معصوم سی لڑکی جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اُن کا دل چاہا وہ اُسے اپنے سینے میں چھپا کر یہاں سے کہیں بہت دُور لے جائیں۔ کس قدر ظلم تھا اور ظالم کوئی اور نہیں اُن کے اپنے تھے۔ وہ انہی پیروں پلٹ کر بھائی جان کے کمرے میں چلی گئیں۔

''میں سعدیہ کو لینے آئی ہوں بھائی جان!''

''کیوں؟'' انتہائی نروٹھا انداز تھا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے تو تمہارے پاس رہ کر آئی ہے۔ بار بار لے جانے کا کیا مقصد، اُسے اپنے گھر میں بسنے دو۔''

''اسے بسنا کہتے ہیں۔ اُس کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟''

''کیا ہوا ہے، ہٹی کٹی تو ہے۔''

''خدا کے لیے بھائی جان! رحم کریں اُس پر۔ میری ایک ہی بیٹی ہے اُسے یوں مٹی میں نہ رولیں۔'' آن کی اتنی عاجزی پر بھی اُن کا انداز نہیں بدلا۔

''کس چیز کی کمی ہے یہاں؟''

''دُکھ تو یہی ہے کہ کوئی کمی نہ ہوتے ہوئے آپ نے اُسے محروم رکھا ہے۔ اُس کے کپڑے دیکھے ہیں جو وہ پہنے ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں نوکر اس سے اچھے حلیے میں پھرتے ہیں۔''

''اعزاز کی جو حیثیت ہے، اسی کے مطابق پہنائے کھلائے گا۔ میرا کیا تعلق۔'' اُن کے جواب پر آن سچ مچ چکرا گئیں۔

''شادی کے وقت تو آپ نے اعزاز کی یہ حیثیت نہیں بتائی تھی۔ اُسے زمین جائیداد کا مالک کہا تھا۔''

''ہے وہ زمین جائیداد کا مالک، لیکن جب اُس کی دیکھ بھال کرے گا تب اُس کی آمدنی کا حق دار ہو گا۔ ابھی تو تمہاری خواہش کے مطابق پڑھ رہا ہے۔'' اُن کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ آن نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ بڑے بھائی سے وہ لڑ نہیں سکتی تھیں۔ لیکن سعدیہ کو یہاں چھوڑنے پر بھی اُن کا دل اور ذہن دونوں تیار نہیں تھے اس لیے اُن کے پاس سے اُٹھ کر وہ پھر سعدیہ کے پاس آ گئیں۔

''تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے سعدیہ! میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں آن!'' وہ فوراً بولی تھی۔ ''میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں؟'' آن اُس کے چہرے پر لرزتی خوف کی پرچھائیاں دیکھنے لگیں۔

''بس نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنے دیں۔''

''بیٹا! یہاں تم ٹھیک نہیں ہو۔ جو تمہاری حالت ہے، سال دو سال بھی مشکل سے زندہ رہ سکو گی۔ چلو شاباش۔''

''نہیں۔''

''آخر کیوں نہیں؟'' آن زچ ہوگئیں تو وہ رُک رُک کر بولی۔

''وہ اعزاز، وہ کہتا ہے میں اگر آپ کے ساتھ گئی تو وہ مجھے طلاق دے دے گا۔''

''بہت احسان کرے گا طلاق دے کر۔ ایک بار نہیں سو بار دے۔'' آن نے کہا تو وہ رو پڑی۔

''نہیں آن! مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر آپ کی کہانی دہرائی جائے گی۔''

شاید اُس کے لاشعور میں ہمیشہ سے یہی خوف تھا جو اب اچانک سامنے آ گیا تھا۔ آن ایک دم سناٹے میں آگئیں اور وہ یونہی روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''بہت باتیں بنائیں گے لوگ۔ کہیں گے ماں بیٹی دونوں۔ مجھ سے زیادہ آپ نشانے پر آئیں گی اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ پڑا رہنے دیں مجھے یہیں۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ میں مر جاؤں گی۔''

''سعدیہ! سعدیہ!'' آن نے اُسے بازوؤں میں لے کر سینے میں بھینچ لیا۔ ''میری جان، تمہاری زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔''

''ایسی زندگی کس کام کی آن! جس میں صرف رُسوائیاں ہوں۔''

''کوئی رُسوائی نہیں ہوگی میری بچی! تم دیکھنا سب اعزاز پر تھو تھو کریں گے اور اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ تم چلو میرے ساتھ۔''

''نہیں آن! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی ایک ہی بات نہیں مان سکتی۔'' وہ اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ پھر اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی طرف سے اطمینان دلانے لگی۔ ''اب تو سب ٹھیک ہے۔ میں آپ کے پاس جانے کی بات نہیں کرتی۔ اس لیے اعزاز کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا ہے اور آنٹی ایبٹ آباد جانے کا پروگرام بنا رہی ہیں مجھے بھی ساتھ لے جائیں گی۔ بس آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

آن چپ چاپ اُسے دیکھے گئیں۔ اُن ہی کے پیٹ کی اولاد انہیں بہلا رہی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری زندگی اچھائی کے راستے پر چلنے والے اپنی ہی کسی غرض کے ہاتھوں مجبور ہو کر اچانک بھٹک جاتے ہیں جیسے آن کے بھائی جان جن کے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ تھا کہ انہوں نے کئی یتیموں، بیواؤں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے لیکن اپنی یتیم بھانجی کے لیے اُن کا دل تنگ ہو گیا تھا تو اس کی وجہ اُن کا اپنا بیٹا اعزاز تھا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے کہ ہم تمہاری آزمائش کرتے ہیں مال دے کر اور اولاد دے کر۔ دونوں کو باعث رحمت بھی کہا گیا ہے اور آزمائش بھی۔ صاف ظاہر ہے، اولاد اگر نیک صالح ہوگی تو باعث رحمت دوسری صورت میں زحمت اور بھائی جان کی باقی تمام اولادیں تو واقعی اُن کے لیے باعث رحمت تھیں بس ایک اعزاز ہی زحمت بن گیا تھا۔

کم عمری میں بُری صحبت کا شکار ہو کر ہر غلط کام کرنے لگا تھا۔ یہ اور بات کہ اپنے اسٹینڈرڈ سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ یعنی نہ سستا نشہ، نہ سستی عورت۔ پھر ایک تو اُس کی پرسنالٹی خاصی ہینڈسم تھی، دوسرے سادگی و انکساری کا لبادہ اوڑھ کر وہ اپنے بارے میں ہر ایک کی رائے اچھی رکھنے میں کامیاب تھا۔

شاید اسی لیے ایک طویل عرصے تک بھائی جان کو بھی اُس کی سرگرمیوں کا علم نہیں ہو سکا تھا اور جب معلوم ہوا تو انہیں اُسے سدھارنے کا غالباً ایک ہی حل اُس کی شادی سمجھ میں آیا، جب کہ وہ ابھی کسی قابل بھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے لیے سعدیہ کا انتخاب شاید اس لیے عمل میں آیا کہ ایک تو وہ بہت معصوم اور سادہ تھی، دوسرے اُن کے خیال میں اُس کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ جب ہی اوّل روز سے اُسے یہ باور کرایا جانے لگا کہ وہ یتیم و لاوارث ہے اور اُس کا اصل رشتہ صرف غیاث سے تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ گویا اپنے بیٹے کے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے اُن کے نزدیک ہر دم اُس لڑکی کو احساس کم تری میں مبتلا رکھنا ضروری تھا۔ اس کے لیے اُس کے سامنے ایسی ایسی باتیں کی جاتیں جو براہِ راست اُس کے دل پر اثر کرتی تھیں اور ذہنی، جسمانی اذیتیں دینے میں اعزاز ماسٹر تھا۔ اور کیونکہ اُس کے دل میں چور تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے اُس کی شخصیت کا پردہ چاک نہ کر دے اس لیے اُسے گھر کے اندر بھی صرف اپنے حصے تک محدود کر دیا تھا اور اتنی گھٹن میں وہ لڑکی سسک سسک کر زندگی سے دُور ہو رہی تھی تو صرف اس لیے کہ کہیں اُس کی آن کی کہانی نہ دہرائی جائے۔ ابھی بھی اُسے اپنی پرواہ نہیں تھی لیکن آن کیسے اُس سے غافل رہ سکتی تھیں۔ اُن کے لیے تو وہ کل کائنات تھی اور جیسا کہ انہوں نے کہا تھا۔

''کوئی بات ہے جو ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی لیکن میں جان لوں گی۔''

اور بہت جلد انہوں نے جان لیا کہ اُن کی بیٹی پر ترس نہیں کھایا گیا بلکہ بھائی جان نے اپنے بیٹے کے عیوب چھپانے کے لیے اس معصوم لڑکی کا انتخاب کیا اور یہ سراسر خودغرضی تھی جس پر آن کو جتنا دُکھ ہوتا کم تھا کہ وہ بھائی جنہوں نے ساری زندگی اُن کے لیے اچھا سوچا، اچھا کیا، وہ بیٹے کی محبت میں اتنے خودغرض ہو گئے کہ بہن کا خیال کیا نہ بھانجی کا۔ اگر واقعی انہوں نے بھانجی پر ترس کھایا ہوتا تو اُس کے منہ پر اُسے یتیم لاوارث نہ کہتے اور اعزاز کو بھی اُس پر ظلم وتشدد سے روکتے۔ اس کے برعکس انہوں نے حد کر دی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کتنی حساس اور نرم دل ہے۔ اس کی مسلسل دل آزاری کو جیسے شعار بنا لیا تھا اور ایسے ماحول سے اُسے نکالنے میں آن کو چار سال لگ گئے کہ طلاق کے خوف سے وہ اُن کی منتوں، عاجزیوں کے باوجود اُن کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوتی تھی اور وہ تو ابھی بھی تیار نہیں تھی۔ اعزاز نے خود اُسے نکال دیا یہ کہہ کر کہ وہ کبھی بھی اس کے قابل نہیں تھی اور بھائی جان آن سے کہہ رہے تھے۔

"تم اپنی بیٹی کو بسنے نہیں دینا چاہتیں تمہاری مرضی لے جاؤ۔"

اور یہ نہیں تھا کہ آن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا، بہت کچھ تھا۔ لیکن سعدیہ کی حالت کے پیش نظر انہیں فوراً وہاں سے نکلنا پڑا اور اُس وقت رحیم یار خان جانے کے بجائے وہ اُسے بھائی جان ارشاد کے گھر لے گئیں کیونکہ ایک تو وہ اتنے سفر کے قابل نہیں لگ رہی تھی دوسرے آن خود لاکھ بڑے بھائی سے متنفر سہی کسی اور کو اُن کے خلاف کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ یہ بہن کی فطری محبت تھی جو اتنے مظالم کے باوجود بھائی کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا کچھ دن بھائی جان ارشاد کے گھر اُسے مکمل آرام دینے کے بعد رحیم یار خان جائیں گی۔

"کیا ہوا آن! سعدیہ کو کیا ہوا؟" بھائی جان ارشاد کے گھر سب اُسے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ بے حد کمزور اور مضمحل نظر آ رہی تھی۔

"بس کچھ بیمار سی تھی۔ میں نے سوچا اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن راستے میں اسے چکر آنے لگے تو میں یہاں لے آئی۔" آن نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

"بہت اچھا کیا آن! اس بہانے سعدیہ نظر تو آئی۔" رابعہ اُس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔ پھر اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگی "رہو گی نا کچھ دن؟"

"پتا نہیں۔ آن کو پتا ہے۔"

"ہاں بیٹا! رہیں گے۔" آن نے فوراً رابعہ کو جواب دے کر خوش کر دیا۔

پھر شام کو آن اُسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں تاکہ کچھ ٹانک وغیرہ لکھوا سکیں لیکن وہاں ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اُن کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔

"بہت دیر کر دی آپ نے۔ بچی کے دونوں گردے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔" آن کی آنکھوں کے سامنے یک بارگی اندھیرا چھا گیا۔ ڈاکٹر کا چہرہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا البتہ اُس کی آواز سماعتوں میں اُتر رہی تھی۔

"کسی اچھے اسپیشلسٹ کے پاس لے جائیں، علاج ہو سکتا ہے ابھی، آپریشن کا وقت نہیں آیا۔ میں یہ میڈیسن دے رہا ہوں اسے فوراً اسٹارٹ کر دیں۔"

آن نے بمشکل اُس کے ہاتھ سے میڈیسن کا پرچہ لیا پھر فیس ادا کر کے باہر نکلیں تو گاڑی میں سعدیہ کے برابر بیٹھتے ہی اُن کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

"بہت خیال تھا تمہیں میرا کہ کہیں لوگ میری کہانی دہرانے نہ بیٹھ جائیں۔ یہ کیوں نہیں سوچا تمہارے بنا میرا کیا ہوگا۔ پچھلے چار سالوں سے تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی آ رہی ہوں۔ ابھی بھی اگر وہ نہ نکالتا تو تم......" اُن کی آواز ساتھ چھوڑ گئی تو وہ جو اُن کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عاجزی سے بولی۔

"روئیں نہیں آن! مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔"

"مت بچی کو پریشان کرو۔" بھائی جان ارشاد نے فوراً انہیں ٹوکا۔ پھر پوچھنے لگے۔ "کیا کہتی ہو؟ ابھی چلیں اسپیشلسٹ کے پاس۔"

"جی بھائی جان! دیر نہ کریں۔" وہ انہیں جواب دے کر شیشے سے باہر دیکھنے لگیں۔ اپنا ہی شہر کس قدر اجنبی لگ رہا تھا۔

پھر پرائیویٹ کلینک میں ڈاکٹر نے اُسے اُسی وقت ایڈمٹ کر لیا اور آن کو کافی اطمینان دلایا کہ گو کہ اُس کے علاج میں کچھ وقت لگے گا لیکن وہ ٹھیک ہو جائے گی اور اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ رات دیر تک آن اُس کے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔

"مجھے دیکھو، غیاث کے گھر سے نکالے جانے کے بعد مجھ پر زندگی کے دروازے بند نہیں ہو گئے تھے۔ اُس سے لاکھ درجہ بہتر مجھے فرشتہ سیرت انسان ملا۔ تم بھی اللہ سے اچھی اُمید رکھو وہ تمہیں بہت خوشیاں دے گا۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہی اور جب نیند آنے لگی تو پلکیں موند لیں۔

اگلے روز جس کسی نے سنا کہ وہ کلینک میں ایڈمٹ ہے وہی اُسے دیکھنے چلا آیا۔ جس پر حیران و پریشان ہو کر وہ آن سے کہنے لگی۔

"میں تو کسی سے نہیں ملتی تھی آن! پھر سب میری عیادت کو کیوں آ رہے ہیں۔ کیا ابھی بھی مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔"

"جناب! آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔ یہ سب میرے بھتیجے، بھتیجیاں میری محبت میں آپ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔" آن نے ہلکے پھلکے انداز میں اُسے چھیڑا تو عقب سے بے بی فوراً بول پڑی۔

"نہیں سعدیہ! میں تمہاری محبت میں آئی ہوں۔"

"کیوں بے بی باجی! میں تو آپ سے نہیں ملتی تھی۔ جب آپ آتی تھیں تو میں اپنے کمرے میں چھپ جاتی تھی۔"

"اور مجھے تمہارا چھپنا نہیں لپک کر آنا یاد رہا۔" بے بی نے پیار سے اُس کے چہرے پر آئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم اُن کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

"مجھے معاف کر دیں باجی! میں بہت مجبور تھی۔"

"میں جانتی ہوں بلکہ سب جانتے ہیں اور کسی کو تم سے کوئی گلہ نہیں۔ تم اپنے دل پر بوجھ نہیں رکھنا۔ ہم سب تم سے ابھی بھی اتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں اور تمہیں اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"سچ!" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

پھر یہ چند دن جو وہ کلینک میں رہی تو دوا سے زیادہ اُن محبتوں کا اعجاز تھا جو اُس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔ تب آن ڈاکٹر کی اجازت سے اُسے رحیم یار خان لے گئیں کیونکہ آپریشن میں ابھی کافی وقت تھا۔

جیسے آن کی زندگی میں اذیت ناک دور آیا تھا تو وہ بھی اُن ہی کی بیٹی تھی۔ فرق یہ تھا کہ آن جلدی وہاں سے نکل آئی تھیں۔ دوسرے سعدیہ کی صورت آن کی دل بستگی اور زندہ رہنے کا سامان ہو گیا تھا جب کہ اُسے ایک تو نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ دوسرے تہی دامنی کے ساتھ روگ بھی لگ گیا تھا۔ دونوں گردوں کا متاثر ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شاید حد درجہ حساس ہونا اُسے لے ڈوبا تھا۔ آن کے ساتھ گھر آ کر بھی وہ بس یہی سوچتی رہتی، لوگ کیا کہیں گے۔ اور اباجی کے سامنے بھی کم ہی جاتی کہ کہیں انہیں یہ خیال نہ آ جائے کہ ماں کی طرح بیٹی بھی۔

حالانکہ وہ اُس سے بے حد محبت کرتے تھے اور اُس کی بیماری کا سنتے ہی آن سے کہا تھا کہ اُسے علاج کے لیے لندن لے جائیں لیکن آن تیار نہیں ہوئیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ یہاں کے علاج سے مطمئن ہیں۔ ہاں اگر کسی مقام پر انہوں نے محسوس کیا کہ باہر جانا ناگزیر ہے تب وہ اُسے ضرور لے جائیں گی اور اپنے لیے اباجی کی تشویش وہ دیکھ رہی تھی پھر بھی اُن کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہتی۔ اُس کے دامن میں کوئی خوب صورت لمحہ نہیں تھا جس کے تصور سے وہ اپنی تنہائیاں مہکاتی۔ اس کے برعکس تکلیف دہ سوچیں تھیں جن سے دامن بچاتے بچاتے وہ ہلکان ہو جاتی لیکن وہ پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ آن اس خیال سے اُس کے پاس آ کر بیٹھتیں کہ باتوں سے اُس کا دھیان بٹا سکیں لیکن اُلٹا وہ انہیں اُن کی دوسری ذمہ داریوں کا احساس دلانے بیٹھ جاتی۔

"آپ اباجی کے پاس جائیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ میری فکر نہیں کیا کریں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

"تمہیں ٹھیک ہونا ہے سعدیہ! میرے لیے۔" آن نے کہا۔ تو وہ کسی خیال سے جھرجھری لے کر بولی۔

"آپ ہی کا خیال آتا ہے آن! ورنہ زندگی کا اتنا بھیانک روپ دیکھ کر تو مر جانے کو دل چاہتا ہے۔"

"بھول جاؤ بیٹا! سب بھول جاؤ۔ مجھے اب افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اگر پہلے میرے ساتھ آ جاتیں تو تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔ اپنے ساتھ ساتھ تم نے مجھ پر بھی ظلم کیا ہے۔"

"شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔ آپ...... آپ مجھے معاف کر دیں۔ آن پلیز، معاف کر دیں۔"

وہ اُن کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی تو آن نے اُٹھا کر اُسے سینے سے لگا لیا۔

"تم بھول جاتی ہو کہ تم میرے لیے کیا ہو۔"

"بس آپ مجھے معاف کر دیں۔" اُس کی وہی تکرار تھی۔ آن تڑپ گئیں۔

"معاف کر دیا۔ میری جان معاف کر دیا۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ پرسوں ہمیں لاہور جانا ہے۔"

"لاہور کیوں؟" وہ بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

"تمہارے چیک اپ کے لیے چودھ[illegible]احب نے وہاں کے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیا ہے۔"

"اباجی کیوں اتنی فکر کرتے ہیں؟"

”کیوں نہ کریں۔تم اُن کی ایک ہی بیٹی ہو اور تمہارے بھائی سب ہی اتنے پریشان ہیں۔تم نے کیوں خود کو کمرے تک محدود کر لیا ہے۔باہر نکل کر سب کے ساتھ بیٹھا کرو۔“ آن نے دھیرج سے اُسے سمجھایا۔تو وہ بے بسی سے بولی۔

”میں کیا کروں۔مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔اعزاز نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“ پھر قدرے رُک کر پوچھنے لگی۔”آن! کیا وہ مجھے طلاق بھیج دے گا؟“

”میں نے بھائی جان سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔البتہ یہ ضرور کہہ دیا ہے کہ وہ اعزاز کی دوسری شادی کرنا چاہیں تو بے شک کر دیں۔“

”اُف نہیں آن! وہ تو دوسری لڑکی کا بھی ایسا ہی حشر کرے گا۔وہ انسان نہیں درندہ ہے۔“

اُسے دوسری لڑکی کی فکر لاحق ہو گئی تو آن اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھنسا کر پیار سے جھٹکا دیتی ہوئی بولیں۔

”سب تمہاری طرح تو نہیں ہیں۔کوئی درندے کو انسان بنانے والی بھی ہو سکتی ہے۔“

پھر کتنے دن گزر گئے۔وہ لاہور سے واپس آئی تو کچھ دن بعد ملتان سے بے بی باجی آ گئیں جن کی کمپنی میں وہ بہت حد تک بہل گئی تھی۔رات دیر تک بے بی باجی اُسے جانے کہاں کہاں کے قصے سناتیں جو اُس کے ہونٹوں پر کھلکھلاتی ہنسی لے آتے۔

”میں تمہاری بہت مشکور ہوں بے بی! تم نے سعدیہ کو پھر سے ہنسنا سکھا دیا۔“ اُس وقت آن بھی وہیں موجود تھیں۔اُسے ہنستے دیکھ کر بے بی سے بولیں۔

”اصل میں اکیلے رہ رہ کر یہ سب بھول گئی تھی۔یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُس کی ہنسی سارے میں کیسے پھول کھلا دیتی ہے۔“

”اُف بے بی باجی! اعزاز کو تو میری ہنسی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔“

”اعزاز، اعزاز مت نام لیا کرو اُس کا۔“ آن نے سلگ کر کہا تو اُس نے رُک کر آن کو دیکھا پھر کہنے لگی۔

”وہ بھی اسی طرح کہتا تھا، آن آن مت نام لیا کرو اُن کا۔“

”تم نے کہا نہیں کہ تم کیوں ابی ابی کرتے ہو۔خیر دفع کرو۔“ آن نے فوراً سر جھٹکا پھر اُٹھتی ہوئی بولیں۔”میں سونے جا رہی ہوں۔“

”فدا کو بھی لے جائیں خواہ مخواہ ہماری باتوں میں دخل دیتا ہے۔“ اُس نے خاموش بیٹھے فدا کو

چھیڑنے کی غرض سے کہا تو وہ اُچھل پڑا۔

”ہائیں! میں کب دخل دیتا ہوں۔“

”اچھا زیادہ اتراؤ نہیں۔جاؤ ٹیپ اُٹھا لاؤ اور وہ میری والی کیسٹ بھی لے آنا۔“

”تمہاری کون سی کیسٹ؟“

”وہ جس میں تم نے میری آواز ٹیپ کی تھی۔“ اُس نے یاد دلایا تو فدا اُٹھتے اُٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔

”وہ کیسٹ خود مجھے نہیں مل رہی۔پتا نہیں کہاں رکھ کے بھول گیا ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں تم سے جھوٹ بولنے کی۔کبھی فرصت میں تلاش کروں گا۔مل گئی تو دے دوں گا تمہیں۔“ وہ کچھ خفا سا ہو کر اُٹھ کر چلا گیا۔

پھر جتنے دن بے بی باجی رہیں وہ اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہی۔اس کے بعد اُسے ہنسنے کا تو کیا اپنے اکیلے پر رونے کا بھی موقع نہیں ملا۔کیونکہ اچانک اُس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ملتان نشتر ہسپتال میں ایڈمٹ ہو کر وہ اپنی زندگی کے دن گننے لگی۔گردے واش کرنے کے عمل سے گزرتے ہوئے اُس کی چیخوں سے آن کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔اُن کا بس نہیں چلتا تھا اُس کی ساری تکلیفیں اپنی جان پر لے لیں۔انتہائی بے بسی کے عالم میں وہ اُسے تڑپتے ہوئے دیکھتی رہتیں۔

”میں مر کیوں نہیں جاتی آن! مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔“

”بیٹا! کچھ دن، کچھ دن، آپریشن کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آن اُسے تسلی دیتیں۔

”کب ہو گا آپریشن؟“ اور یہ تو آن کو بھی معلوم نہیں تھا۔حالانکہ وہ اپنا گردہ اُسے دینے کو تیار بیٹھی تھیں اور ایک وہی نہیں سب اُس کے چاہنے والے۔جس پر آپی نے کہا تھا۔

”سعدیہ! اتنے گردوں کا کیا کرو گی۔“ اور جانے کیا بات تھی وہ ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔

پھر نشتر ہسپتال سے مایوس ہو کر آن اُسے لاہور لے جانے کو تیار ہو گئیں۔تب شاید بھائی جان کو اُس کی سیریس کنڈیشن کا احساس ہوا تو اپنی تمام اولادوں کے ساتھ اُسے دیکھنے چلے آئے۔اب تک غالباً وہ اُس کی بیماری کو محض پروپیگنڈا خیال کر رہے تھے لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو واقعی پریشان ہو گئے اور یہاں اُس معصوم لڑکی کا ظرف کمال کی حدوں کو چھو گیا جب آن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو اچانک رُک کر بولی تھی۔

”ابی! میں نے آپ کو معاف کیا۔آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔“ بے پناہ ندامتوں میں گھر کر

انہوں نے اُسے سینے سے لگانا چاہا تھا لیکن وہ ایک دم ثوبیہ کی طرف مڑ گئی۔

''باجی ثوبیہ! میں نے آپ کو معاف کیا۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔'' اور پھر ایک ایک کا نام لے کر وہ معاف کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

''یہ ہے میری بیٹی، جسے تم لوگ گندی نالی کا کیڑا کہتے تھے۔ تم اُونچے محلوں میں رہنے والے، ہے کسی میں اتنا ظرف۔''

آن کا دل چاہا چیخ چیخ کر پکاریں لیکن انہوں نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا، یا شاید اُن کی قوت گویائی جواب دے گئی تھی۔ پھر آگے کا سوچ رہی تھیں۔ ملتان میں تو انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی سب اپنے تھے اور اُن کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ دن میں بے بی اُن کے پاس آجاتی رات میں فریال پھر ندیم اور یحییٰ بھی ضرور چکر لگاتے تھے۔ یعنی کسی مقام پر انہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لاہور میں ایک صرف آصف تھے اور جانے وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال پائیں گے کہ نہیں۔ آن کو یہی فکر تھی لیکن بروقت ہمایوں نے آکر انہیں اس فکر سے نکال لیا۔

''دیکھا سعدیہ! سب کو تمہارا کتنا خیال ہے۔ اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر آرہے ہیں۔ اب تم بھی سب کا خیال کرو۔ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔'' آن اُسے محبتوں کا احساس دلاتے ہوئے بولیں۔ تو وہ افسردگی سے مسکرائی۔

''بھائی جان ہمایوں! بہت تنگ کر رہی ہوں نا میں آپ سب کو۔''

''نہیں۔ اپنے بارے میں میں یقین دلاتا ہوں کہ میں تنگ نہیں ہو رہا۔''

''پھر بھی آپ مجھے معاف کر دیں۔'' جانے اُس کے اندر کیسا احساس تھا جو ہر ایک کے سامنے اُس کی ہر بات کا اِختتام معافی پر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب سسٹر اُسے میڈیسن دینے آئی تو اُس کے سامنے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے معاف کر دو۔'' سسٹر نے حیران ہو کر آن کو دیکھا تو انہوں نے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

''سعدیہ! ویسے میں حیران بہت ہوں۔'' سسٹر کے جانے کے بعد آن اُسے حوصلہ دینے کی خاطر کہنے لگیں۔ ''کہ تم نے کس طرح اتنی بہادری سے بیماری کا مقابلہ کر لیا۔ اتنے ناز و نعم سے پلی ہوئی اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو پہلے ہی مقام پر ڈھے جاتی۔ لیکن تم بہت بہادر ہو۔''

''واقعی۔'' وہی سادہ معصوم انداز تھا۔ ''میں بہادر ہوں آن؟''

''ہاں بہت بہادر۔ آپریشن کے بعد جب تم چلنے پھرنے کے قابل ہو گی تب سب سے پہلے ہم

عمرہ کرنے جائیں گے۔ میں نے چودھری صاحب سے بھی کہہ دیا ہے۔''

''آن! آپ میرے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ اُدھر ابا جی اکیلے ہوتے ہوں گے۔'' اُسے اچانک نئی فکر نے گھیر لیا۔

''اکیلے کیوں؟ گھر میں ماشاء اللہ بیٹے بہویں سب اُن کے ساتھ ہیں اور سب خیال رکھنے والے ہیں۔'' آن نے کہا تو وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''پھر بھی آن! بیوی تو بیوی ہوتی ہے۔''

''اچھا اب تم آرام کرو، میں ذرا للّی کو فون کر آؤں۔'' آن اس نئی فکر سے اُس کا دھیان ہٹانے کی خاطر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''باجی للّی یہاں لاہور میں ہیں؟''

''نہیں پنڈی میں۔ ہمیں آپریشن کے لیے وہیں جانا ہے۔ اس لیے اُسے پہلے سے مطلع کر دوں۔'' آن کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں تو اُس نے پلکیں موند لیں۔ اُس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

''اے اللہ! مجھے معاف کر دے اے اللہ۔''

راولپنڈی میں آن کی دو بھتیجیاں للّی اور روبی موجود تھیں۔ روبی خود ڈاکٹر تھی۔ اس لیے آن کو کافی سہارا ہو گیا۔ سی ایم ایچ میں سعدیہ کے چیک اپ اور آپریشن کی ڈیٹ لے کر آن اُسے لے کر للّی کے ساتھ گھر آگئیں۔ کیونکہ روبی کی صورت ڈاکٹر گھر میں موجود تھی۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد اُس آخری مقام پر آن بہت تھک گئی تھیں۔

''دو سال سے گھن چکر بنی ہوئی ہوں۔ کبھی ملتان، کبھی لاہور، کبھی رحیم یار خان، اب پنڈی۔ دُعا کرو یہاں سے سعدیہ مکمل صحت یاب ہو کر گھر جائے۔'' آن بہت تھکے تھکے انداز میں للّی سے مخاطب تھیں۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور آن! آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ مجھے تو سعدیہ سے زیادہ آپ کو دیکھ کر تشویش ہو رہی ہے۔ کہیں آپ نہ بیمار ہو جائیں۔'' للّی آن کو دیکھ کر واقعی متوحش تھی۔

''مجھے اس لڑکی نے تھکا دیا ہے بیٹا!''

''چلیں آپ آرام کریں سعدیہ کی فکر نہیں کریں۔ اُس کے پاس روبی ہے۔'' للّی انہیں اُٹھا کر بیڈ روم میں لے آئی اور بس ذرا دیر کو انہوں نے تکیے پر سر رکھا تھا۔ فوراً اُٹھ کر سعدیہ کے پاس آ

گئیں۔ تو وہ انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

''آن! فدا نہیں آیا؟''

''آ جائے گا۔ میں نے ملتان سے چلتے ہوئے چودھری صاحب کو فون کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی آ جائیں۔''

''بہت لمبا سفر ہے۔ ابا جی تھک جائیں گے۔ آپ نے انہیں آنے سے منع نہیں کیا۔'' آن کچھ نہیں بولیں۔ قریب بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ تھپکنے لگیں۔ لیکن وہ بہت بے چین ہو رہی تھی۔

''میرے اندر آگ لگی ہے آن! میں آئس کریم کھاؤں گی۔''

''میں لے کر آتی ہوں۔'' روبی فوراً کھڑی ہو گئی اور اسی وقت گاڑی لے کر نکل گئی۔

''اتنی رات کو اب آئس کریم کہاں ملے گی؟'' آن نے اُسے دیکھا وہ آن کی آغوش میں سمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب انہوں نے اُسے بازوؤں میں بھر کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اُس کے بالوں پر دھیرے سے پیشانی لگائی تو جانے کیسا احساس تھا جو اُن کی پلکیں نم کر گیا۔ شاید اتنے قریب آ کر وہ دُور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگا جیسے آنے والے دنوں، مہینوں، سالوں میں وہ کہیں نہیں ہو گی۔ وہ اُن کی رگِ جاں اُن کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

''اس کے بغیر زندگی پتا نہیں کیسی ہو گی؟'' انہوں نے سوچا تھا کہ وہ کمزور آواز میں پکار کر بولی۔

''آن! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا۔''

''سنا للّی! تم نے۔ خود میرا ساتھ چھوڑے جا رہی ہے اور......'' دُکھ کی شدت سے آن کی آواز پھٹ گئی۔

''کچھ نہیں ہو گا آن! کوئی کسی کا ساتھ نہیں چھوڑ رہا۔ بس آپ دعا کریں۔ دیکھیے گا چند دنوں میں یہ ہنستی کھلکھلاتی اُٹھ کھڑی ہو گی۔'' للّی نے عقب سے آن کو کندھوں سے تھام لیا۔ تب ہی روبی آئس کریم لے کر آ گئی۔

''دیکھو سعدیہ! میں تمہارے لیے کتنی دور سے آئس کریم لائی ہوں۔''

''ہائے روبی باجی! آپ کتنی اچھی ہیں۔'' وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔

''روبی! آئس کریم نہیں کھانی؟''

''کھانے دیں آن!'' روبی کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو آن گم صم ہو کر اُسے دیکھنے لگیں جو اپنے اندر کی آگ کو آئس کریم سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور جانے کیسی آگ تھی جو

بجائے سرد ہونے کے بھڑکتی جا رہی تھی۔ اتنا بڑا پیک اُس نے پل میں اپنے اندر اُتار لیا پھر یوں دیکھنے لگی جیسے اور کی طلب ہو۔

''بس بیٹا! یہ بھی بہت تھی۔'' آن نے بے بسی سے کہا۔ تو وہ ایک دم بیڈ سے چھلانگ لگا کر اُتر گئی۔

''آپ کو نہیں پتا، کتنی آگ ہے۔ کتنی وحشت ہے اور اتنی گھٹن مجھے باہر نکالیں۔'' وہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں چلی گئی تو بے حد گھبرا کر آن چیخ کر روبی کو پکارتی ہوئی اُس کے پیچھے آئیں۔

وہ ٹھنڈے فرش پر لمبی لیٹ گئی تھی۔ روبی فوراً آ کر اُس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی اور حد سے تجاوز کرتے بلڈ پریشر کو دیکھ کر آن پریشان ہو کر بولیں۔

''اس کے اندر تو کچھ بھی نہیں ہے روبی! بالکل کھوکھلی ہو چکی ہے یہ۔ اب اتنا بلڈ پریشر کس چیز پر اٹیک کرے گا۔''

''دل!'' روبی کی آواز شاید اُس کے اپنے کانوں نے بھی نہیں سنی تھی اور سارے میں شور مچ گیا۔

''دل، دل، دل۔''

وہی دل جس میں محبتوں کا جہاں آباد تھا
جو اپنے پرائے سب کے دُکھ سمیٹ لینا چاہتا تھا
جس میں سوندھی سوندھی آرزوئیں تھیں
اور جو اوّل روز سے ظالموں کے نشانے پر تھا

روبی نے ایک بار پھر گاڑی نکالی اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اُسے ہسپتال لے گئی اور اُس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آن کی ٹانگیں ہسپتال کی طویل راہداری ہی میں جواب دے گئیں تو ستون کا سہارا لے کر انہوں نے رب کائنات کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ ہونٹوں سے دعاؤں کے ساتھ پلکوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے اور دُور آسمان پر سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

پھر جب اُسے آئی سی یو سے نکال کر کمرے میں لے جایا گیا اُس وقت فدا آ گیا اور آن کو سہارا دے کر اُس کے پاس لے آیا۔

''سعدی! تو نے واقعی سب کو پریشان کر دیا ہے۔ چل اب اُٹھ جا۔'' وہ اپنے اسی انداز میں اُسے مخاطب کر کے بولا جس پر وہ اُسے مارنے کو لپکتی تھی۔

''بہت دُکھ ہیں۔ سونے دو۔'' اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی پھر ذرا سی آنکھیں

کھولیں اور فدا کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی تو وہ فوراً اپنی جیب سے کیسٹ نکال کر اُس کے سامنے لہرا کر بولا۔

''مل گئی تمہاری کیسٹ، میں ٹیپ بھی لایا ہوں، ابھی سنواؤں گا تمہیں۔''

''اب نہیں۔'' اُس نے منع کیا لیکن فدا ان سنی کرتا چھوٹا سا ٹیپ ٹیبل پر رکھ کر اُس میں کیسٹ لگانے لگا تو اُسے پلکیں موندتے دیکھ کر آن کمرے سے نکل آئیں اور بنچ پر بیٹھی تھیں کہ اُس کی آواز آنے لگی۔

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو
تتلیوں کے، جگنوؤں کے

''الٰہی!'' آن نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ ''میری بیٹی کو..........''

''آن!'' معا روبی نے آ کر دھیرے سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اب آپ کو سعدیہ کی زندگی کی دعا نہیں کرنی وہ بہت اذیت میں ہے۔ دعا کریں اللہ اُسے اذیت سے نجات دے اور آپ کو بھی۔''

آن کا پورا وجود برف ہو گیا۔ خالی خالی آنکھوں سے روبی کو دیکھے گئیں۔ اُٹھے ہوئے ہاتھ کٹی ہوئی شاخ کی مانند آپ ہی آپ ڈھے گئے تھے اور سماعتوں میں مختلف آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں

''سعدیہ کی زندگی کی دعا نہیں کرنی۔''

ہمیں ماتھے پہ بوسہ

''دعا کریں اللہ اُسے نجات دے۔''

''اللہ!'' پکار میں بڑی شدت تھی۔ ''میں تیری امانت تجھے لوٹاتی ہوں۔ تو اسے ساری تکلیفوں، ساری اذیتوں اور سارے دُکھوں سے نجات دے۔''

پھر بھاگ کر کمرے میں آئیں تو اُس کے چہرے پر پھیلا ابدی سکون جیسے کہہ رہا تھا۔

''اللہ نے آپ کی سن لی آن! میری نجات ہو گئی۔''

اِس جہدِ مسلسل میں

آج چھٹی کا دن تھا اور یوں بھی اُس کا کسی دوست وغیرہ کے ساتھ بھی کوئی پروگرام نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے سوتا رہا۔ اماں نے ایک دو بار اُس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا لیکن اُٹھایا نہیں۔ جانتی تھیں کہ جو وقت وہ طے کر کے سویا ہو گا، اسی وقت پر خود ہی اُٹھ جائے گا، اور وہ گیارہ بجے اُٹھا۔ شاور لینے کے بعد آ کر برآمدے میں بیٹھا اور ابھی اخبار اُٹھا کر گھٹنوں پر پھیلایا ہی تھا کہ ندا آ گئی۔

''بعد سلام عرض ہے کہ یہ ساری خبریں باسی ہو چکی ہیں۔'' ندا اُس کے بائیں طرف کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا کر اُسے دیکھنے لگا۔

''ابھی اُٹھے ہو؟'' اُس نے ایسی ہی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تو وہ بھنویں اُچکا کر بولی۔

''بڑے نواب ہو گئے ہو؟''

''ہو گیا ہوں سے کیا مطلب؟ میں پیدائشی نواب ہوں۔'' وہ گردن اکڑا کر بولا۔ تو وہ ذرا سا ہنسی پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''خالہ جان کہاں ہیں؟''

''اماں۔'' اُس نے بتانے کے بجائے اماں کو پکار لیا تو کچن سے اُن کی آواز آئی۔

''آ رہی ہوں بیٹا! ناشتا لے کر آ رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟ خالہ جان خود ناشتا بنا رہی ہیں اور وہ بوا کہاں ہے؟''

''اماں آئیں تو انہی سے پوچھ لینا، مجھے کچھ خبر نہیں۔'' اُس کے جھنجھلا کر کہنے پر وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

''کمال ہے، ساری دنیا کی خبر رکھنے والا اپنے گھر سے اتنا بے خبر۔'' پھر معاً خیال آنے پر قدرے اُس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

''سنو، وہ تمہاری ڈاکومنٹری فلم کا کیا ہوا؟''

''خاموش، اماں آرہی ہیں۔'' وہ اُسی کے انداز میں کہہ کر پیچھے ہٹ گیا تب ہی اماں ناشتا لے کر آگئیں۔ تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''السلام علیکم خالہ جان!''

''جیتی رہو بیٹی! تم کب آئیں۔ امی کو بھی لے آتیں۔''

''آج تو ابو گھر پر ہیں امی کہاں آسکتی تھیں۔ پھر کسی دن لے کر آؤں گی۔'' اُس نے امی کے نہ آنے کی جو توجیح پیش کی، اس پر وہ پوچھنے لگا۔

''کیوں خالو جی منع کرتے ہیں کیا؟''

''نہیں بیٹا! اور کیوں منع کریں گے۔'' اُس کے بجائے اماں کہنے لگیں۔ ''اصل میں مرد گھر پر ہو تو بیوی اپنے آپ ہی پابند ہو جاتی ہے۔''

''سن لیا۔'' اُس نے کہا تو وہ لاپروائی سے بولا۔

''میرا تو سن لینا کافی ہے، البتہ تم گرہ میں باندھ لو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مجھے شوہر بننا ہے جب کہ تمہیں بیوی۔''

کبھی کبھی زبان یونہی پھسل جاتی ہے۔ حالانکہ اُس نے اپنے اور اُس کے حوالے سے نہیں کہا تھا نہ ہی اُس کے ذہن میں ایسی کوئی بات تھی۔ اُس کا مقصد صرف یہ جتانا تھا کہ میں مرد ہوں، تم عورت۔ لیکن جس نہج پر بات چل رہی تھی اسی حساب سے جملہ اُس کی زبان سے پھسلا اور احساس اُس وقت ہوا جب ندا کو نظریں چراتے اور اماں کو مسکراتے دیکھا۔ پہلے تو ذرا سا سٹپٹایا پھر فوراً اپنی بات کا اثر زائل کرنے کی غرض سے کہنے لگا۔

''اماں! خالہ جان سے کہیں اس کی شادی کر دیں تاکہ چھٹی کے دن یہ ہمیں تنگ کرنے کے بجائے اپنے گھر آرام سے بیٹھا کرے۔''

''ہائیں ہائیں۔'' اماں نے فوراً ٹوکا...... ''اس کے آنے سے تو رونق ہو جاتی ہے۔''

''اچھا......!'' وہ شریر انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''مجھے تو وحشت ٹپکتی نظر آرہی ہے۔''

''اور مجھے خباثت۔'' اُس کے چہرے کو دیکھ کر وہ جس برجستگی سے بولی، اس پر وہ بے ساختہ

ہنسا۔ پھر پوچھنے لگا۔

''ویسے صبح ہی صبح تمہاری آمد کس سلسلے میں ہوئی ہے۔''

''میں خالہ جان سے ملنے آئی تھی اور اب جا رہی ہوں۔'' وہ رُوٹھے لہجے میں کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو اماں نے پہلے اُسے روکا۔ پھر اس پر بگڑنے لگیں۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ ذرا دیر کو بچی آئی ہے تمہیں وہ بھی ناگوار گزرتا ہے۔ ارے احسان مانو اس کا، تم سے زیادہ خیال رکھتی ہے میرا۔ تم تو چار چار دن گھر سے غائب رہتے ہو۔''

''اماں! اماں......!'' وہ پریشان ہو گیا۔ ''میں مذاق کر رہا ہوں اس سے۔ آپ سچ مچ خفا ہونے لگیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے ایسا مذاق کرنے کی۔''

''اچھا میری توبہ! اور بی بی! تم بھی مجھے معاف کر دو۔''

وہ باقاعدہ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ اور وہ تو خود اس اچانک صورت حال سے پریشان ہو گئی تھی۔ فوراً ہنس پڑی۔ پھر دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آج تمہارا کہیں جانے دانے کا پروگرام نہیں ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ چلو تمہیں سمندر کی سیر کرا لاؤں۔''

اُس نے اچانک ہی پروگرام بنا لیا اور فوراً ہی کھڑا بھی ہو گیا۔ پھر اماں کہتی رہ گئیں کہ دوپہر کا کھانا کھا کر اطمینان سے جانا لیکن اُس پر دھن سوار ہو چکی تھی۔ ایک نہیں سنی۔ اُس کی کلائی تھام کر جس رفتار سے چلا تو اُس بے چاری کو بھاگنا پڑا تھا۔

چھٹی کے باعث ساحل پر بے حد رونق تھی لیکن وہ اُس سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے لوگوں کے ہجوم سے دُور اُسے ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا۔ تو وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

''یہاں بیٹھ کر کیا ہم اپنے آباؤ اجداد کو یاد کریں گے؟''

''یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہیں اُن کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔''

''نہیں، بس یاد کر لینا کافی ہے۔'' وہ اُس کا جواب سمجھ کر جلدی سے بولی۔

''اچھا دیکھو، اب ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔'' وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا اور اُسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گئی تب کہنے لگا۔ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں اور میری واپسی تک تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔''

"لگتا ہے اس بار کسی خاص مہم پہ جا رہے ہو۔" اُس نے فوراً قیاس آرائی کی۔ تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

"ہاں، کشمیر جا رہا ہوں۔"

"کیا؟" اُسے جیسے اپنی سماعتوں پر دھوکا ہوا اور وہ چڑ کر بولا۔

"اُونچا سننے لگی ہو کیا؟ کشمیر، جسے مقبوضہ کہتے ہوئے رگوں میں لہو یوں جوش مارتا ہے کہ سب کچھ تہس نہس کر دینے کو دل چاہتا ہے۔"

"خدا کے لیے عمر!" وہ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر چیخی۔ "اپنا نہیں تو خالہ جان کا خیال کرو، اگر انہیں معلوم ہو گیا تو۔"

"انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے، سمجھیں تم۔" وہ زور دے کر بولا۔

"میں تو سمجھ گئی لیکن تم جانتے ہو، زیادہ دن ہو جانے کی صورت میں خالہ جان خود تمہارے آفس فون کر کے معلوم کرتی ہیں کہ تم کہاں ہو؟ کب آؤ گے؟ وغیرہ وغیرہ۔"

اُس نے اپنی طرف سے اطمینان دلانے کے ساتھ ہی دوسرا خدشہ ظاہر کیا تو وہ کہنے لگا۔

"آفس میں میں سب کو منع کر دوں گا کہ اماں کو کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ میں کہاں ہوں۔ اس کے باوجود بھی میں سمجھتا ہوں کسی سے انجانے میں غلطی ہو سکتی ہے اسی لیے میں نے تمہیں بتایا ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ میری واپسی تک تم اماں کے پاس رہو۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ میں خالہ جان کو تمہارے آفس فون کرنے سے منع تو نہیں کر سکتی۔"

وہ اُس کی پوری بات سن کر بولی۔

"یار! تم اتنی کند ذہن، میڈیکل میں کیسے پہنچ گئیں۔"

"جناب! دو مہینے بعد میرا ہاؤس جاب شروع ہونے والا ہے۔"

اُس کے اترانے پر وہ زچ ہو کر بولا۔

"میں جانتا ہوں لیکن اس وقت خدا کے لیے تم میری بات سنجیدگی سے سنو۔"

"میں پوری سنجیدگی سے سن رہی تھی، تم ہی نے درمیان میں.........."

"اچھا چھوڑو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اماں کے پاس رہنا اور جب بھی وہ میرے آفس فون کرنے کا ارادہ ظاہر کریں تم فوراً اپنی خدمات پیش کر دینا بلکہ میرا خیال ہے وہ تم ہی سے کہیں گی کہ آفس فون کر کے معلوم کرو، میں کہاں ہوں، کب آؤں گا وغیرہ۔ اور تم اپنی طرف سے اماں کو کچھ بھی کہہ کر مطمئن کر دینا۔"

اس بار وہ روانی سے بولا تاکہ درمیان میں کوئی اور بات نہ ہو اور جب خاموش ہوا تو فوری طور پر وہ کچھ نہیں بولی۔ بلکہ لگ رہا تھا جیسے اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ قدرے توقف سے وہ پوچھنے لگا۔

"کیا اب بھی نہیں سمجھیں؟"

"سمجھ تو سب گئی ہوں اور سب سنبھال بھی لوں گی لیکن تم نے یہ نہیں بتایا، کس سلسلے میں جا رہے ہو؟"

"وہاں کے تازہ ترین حالات کی فلم بنانی ہے۔ اس کے بعد.........."

"میں جانتی ہوں۔" وہ فوراً ٹوک کر کہنے لگی "عالمی عدالتوں میں ظلم و بربریت کے مناظر دکھا کر اُن سے انصاف مانگا جائے گا۔ چھوڑ عمر! عالمی عدالتیں اندھی، بہری، گونگی تو نہیں ہیں۔ سب کچھ اُن کے علم میں ہوتا ہے۔"

"یقیناً ہوتا ہے اور اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم یہ سوچ کر خاموش بیٹھ رہیں کہ وہ سب جانتے ہیں۔ ہمیں اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانی ہے۔ ہمارا مقصد اُن مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑنا ہے اور کبھی تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔

اُس کے مایوس سے انداز پر وہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کشمیری بذاتِ خود بہت غیور قوم ہے لیکن اُن کی آواز کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں دیا جاتا اور بحیثیت مسلمان میں سمجھتا ہوں ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو کریں کہ اُن کی آواز عالمی منصفوں تک پہنچا دیں اور ہم دنیا کے منصفوں کو اُس وقت تک جھنجھوڑتے رہیں گے، جب تک کشمیریوں کو اُن کا حق خود ارادیت نہیں مل جاتا۔"

"لیکن عمر! وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ تم کیسے جاؤ گے۔" وہ اچانک پریشان نظر آنے لگی۔

"جیسے ایک بار پہلے گیا تھا۔" اُس کا انداز سرسری تھا پھر اُسے پریشان دیکھ کر کہنے لگا۔ "اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرا جانا اور وہاں رہنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی خوف کی پرچھائیں دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

"تمہارا دل تو اتنا چھوٹا سا ہے پھر تم ڈاکٹر کیسے بن گئیں؟"

"ایسے۔" اُس نے مٹھی میں گیلی ریت بھر کر اُس کے منہ پر دے ماری اور اس سے پہلے کہ وہ جوابی کارروائی کرتا، فوراً کھڑی ہو گئی۔ پھر مزید اُسے دھکا دے کر آگے چل پڑی۔ تو وہ رومال سے

ہاتھ منہ صاف کرتا ہوا اُس کے پیچھے آ کر بولا۔

''کسی دن تم سچ مچ میرے ہاتھ سے ضائع ہو جاؤ گی۔''

''اس سے پہلے تم مجھے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلا دو سخت بھوک لگی ہے۔''

''نہیں۔کھانا گھر پہ کھائیں گے۔اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔''

اُسے مجبوراً اُس کی بات رد کرنا پڑی، کیونکہ جانتا تھا کہ چھٹی کے دن اماں اُس کے لیے خاص اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی ہیں اور اگر اُس نے اِدھر اُدھر کھالیا تو وہ سخت ناراض ہوں گی۔

اماں کو اُس نے دو روز پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ آفس ٹور پر اسلام آباد جائے گا۔اور ابھی جب اُس کا جانا کنفرم ہو گیا تو وہ جنید سے ساری معلومات لے کر سب سے پہلے ندا کو لینے پہنچ گیا۔وہ اُسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ کس مقصد کے لیے آیا ہے اور بالکل بے اختیار ہو کر گنگنانے لگی:

ع مرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن

وہ سٹپٹایا اور اس بُری طرح اُسے گھورا کہ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

''تم پر اعتماد کر کے شاید میں نے غلطی کی ہے۔'' وہ قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔جس پر وہ تلملائی ضرور لیکن بولی آرام سے۔

''یہ تو وقت بتائے گا۔''

''بہرحال چل رہی ہو؟''

''تم کب جا رہے ہو؟''

''آج رات میں۔'' پھر خالہ کو آتے دیکھ کر کہنے لگا۔

''نہیں۔تم خاموش رہو۔خالہ سے میں خود ہی بات کروں گا۔السلام علیکم خالہ۔''

''وعلیکم السلام۔کیسے ہو بیٹا؟''

''دعا ہے آپ کی۔''

''کھڑے کیوں ہو، بیٹھو نا اور اماں کیسی ہیں۔کتنے دنوں سے میں سوچ رہی ہوں اُن کے پاس جانے کا۔'' خالہ عادت کے مطابق بات سے بات نکالتی گئیں۔''پہلے تمہارے خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اب حرا کو بخار آ گیا ہے۔آؤں گی کسی دن۔''

''جی ضرور۔'' وہ اپنی جگہ جز بز ہو کر بولا۔پھر ندا کو دیکھا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

''میں چائے لاتی ہوں۔''

''نہیں، چائے رہنے دو۔'' اُس نے منع کیا اور اس سے پہلے کہ خالہ سبب پوچھتیں اُن سے کہنے لگا۔

''میں ندا کو لینے آیا ہوں۔اگر آپ اجازت دیں تو ندا کچھ دن اماں کے پاس رہ لے کیونکہ میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔''

''اسلام آباد جا رہے ہو۔کیوں؟'' خالہ کو سوال ضرور کرنا تھا۔

''بس کچھ کام ہے۔پھر میں لے جاؤں ندا کو؟''

''ندا سے پوچھ لو۔جانا چاہے تو لے جاؤ۔''

گویا خالہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔وہ اُسے دیکھنے لگا تو وہ ''ہاں چلتی ہوں'' کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔کچھ دیر بعد جیسے ہی بیگ لے کر آئی، وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور خالہ سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔پھر راستے میں اُس سے کہنے لگا۔

''دیکھو! تمہیں جو بات پوچھنی ہو یہیں پوچھ لو۔اماں کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرنا جو انہیں شبے میں مبتلا کرے۔''

''میں صرف یہ پوچھنا چاہوں گی کہ اگر تم وہاں شہید ہو گئے تو یہاں ہمیں کیسے پتا چلے گا۔''

وہ ہرگز اتنی سادہ نہیں تھی جتنی سادہ بن کر پوچھ رہی تھی۔

''میں وہاں لڑنے مرنے نہیں جا رہا سمجھیں تم۔پھر بھی اگر میں مر مرا گیا تو فکر مت کرو، تم تک اطلاع پہنچ جائے گی۔'' اُس کے دانت پیسنے کے باوجود وہ مزید تنگ کرنے سے باز نہیں آئی۔

''صرف اطلاع۔میرا مطلب ہے تمہاری ڈیڈ باڈی۔''

اُس نے بیچ سڑک پر گاڑی روک دی اور اُسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کیا چاہتی ہو تم!''

''میں چاہتی ہوں کہ تم زندہ سلامت واپس آؤ۔'' اُس کے کڑے تیوروں سے گھبرا کر وہ فوراً بولی۔پھر پیچھے ٹریفک جام ہونے کا اشارہ کیا تو اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور بقیہ رستہ قصداً پیشانی پر بل ڈالے رکھے تاکہ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہے اور واقعی وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

گھر آ کر بھی وہ اُس سے کچھ دُور دُور رہا، البتہ رات کے کھانے پر اچھے موڈ میں اماں سے اور اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔اس کے بعد کمرے میں آ کر اپنا بیگ چیک کرنے لگا۔جنید نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک دس بجے اُسے لینے آئے گا۔اُس نے گھڑی دیکھی ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے اور

اماں تو عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جاتی تھیں۔ البتہ جب اُسے شہر سے باہر کہیں جانا ہوتا تو پھر اُسے رخصت کر کے ہی سوتی تھیں۔ لیکن آج وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے جانے تک وہ جاگتی رہیں۔ اس لیے جیسے ہی وہ نماز سے فارغ ہوئیں وہ اُن سے کہنے لگا۔

''اماں! اتنی دیر تک بیٹھ کر کیا کریں گی۔ آپ سو جائیں آرام سے۔ ندا ہے نا، مجھے کچھ ضرورت ہوگی تو اُس سے کہہ دوں گا۔''

''آؤ گے کب؟'' اماں نے اُس کی بات نظرانداز کر کے پوچھا۔

''آ جاؤں گا چار پانچ روز میں۔ اگر اس سے زیادہ دن لگ گئے تو فون کر دوں گا۔''

اُس نے انہیں اطمینان دلایا۔ پھر انہیں سونے کا کہہ کر برآمدے میں آیا تو ندا سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

''کیا واقعی چار پانچ روز میں آ جاؤ گے؟''

''نہیں۔ مجھے بہت زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔''

''پھر اماں سے جھوٹ کیوں بولا؟''

''اور کیا کہتا؟'' وہ اُسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر کہنے لگا ''میں نے فون کرنے کو بھی کہا ہے لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ اور اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے اماں کو کسی بھی طرح مطمئن کر دینا۔''

''اور مجھے کون مطمئن کرے گا'' اُس نے سوچا۔

''سمجھ رہی ہو نا؟''

''اب بس بھی کرو۔ کوئی اتنی ناداں نہیں ہوں میں۔'' وہ اپنی کیفیت چھپانے کی کوشش میں جھنجھلا سی گئی۔

''اچھا چلو، موڈ نہیں خراب کرو بلکہ ایسا کرو چائے بنا لاؤ اور اماں کو بھی دیکھ لینا سو گئی ہیں، یا نہیں۔''

وہ اُس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ جانے کیا تھا اُس کی نظروں میں کہ وہ اپنی بات دہراتے دہراتے رہ گیا تھا۔

بارہ مولا تک اُسے کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ایک بار پہلے یہاں تک آ چکا تھا اور راستوں سے واقفیت کی بنا پر وہ آرام سے عباد اللہ کے گھر پہنچ گیا۔ گھر

سے ملحق عباد اللہ کی ڈسپنسری تھی۔ اور پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو اسی ڈسپنسری میں اُس کی عباد سے جان پہچان ہوئی تھی۔ جو چند روزہ قیام کے دوران دوستی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ شروع میں عباد نے اُسے یہی بتایا تھا کہ وہ ہر قسم کی خانہ جنگی سے الگ تھلگ رہنے والا ایک عام سا بندہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور بس۔

پھر جب اُس نے اپنے بارے میں ایمان داری سے بتایا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے اور اُس کا تعلق کسی تنظیم سے نہیں بلکہ ایک ایسے ادارے سے ہے جو پُرامن طریقے سے کشمیریوں کی آواز دنیا بھر میں پہنچانا چاہتا ہے تب عباد نے اپنے بارے میں تو کچھ زیادہ نہیں بتایا البتہ اُس کی رہ نمائی کا وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُسے جب جس چیز کی ضرورت پڑے گی وہ اُسے فراہم کرے گا۔ اور اُس کی مدد سے اُس وقت وہ وہاں کے حالات فلم بند کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا اور ابھی بھی اسی مقصد سے اُس کے پاس آیا تھا۔

بہرحال عباد اُسے دیکھ کر خوش تو ہوا لیکن اُس کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو پچھلی بار وقتِ رُخصت اُس نے محسوس کی تھی۔ اور فوری طور پر تو وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک گیا تھا لیکن پھر عباد کی باتوں نے جہاں یہ سمجھایا کہ یہ اُس کا وہم نہیں ہے، وہاں اُس کی مجبوری بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ اب حالات پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں۔ ایک عام معصوم شہری پر بھی بھارتی شبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میری ڈسپنسری پر گزشتہ چھ ماہ سے اُن ہی کتوں کا قبضہ ہے۔ سوچو ذرا میرے بھائی زخموں سے تڑپتے ہیں اور یہ ذلیل مجھے اُن کی مرہم پٹی تک نہیں کرنے دیتے۔''

بولتے ہوئے عباد کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جیسے اُس کا بس نہ چل رہا ہو کیا کر ڈالے اور...... وہ اُس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن اُس کے پاس کہنے کے لیے تسلی کے دو بول بھی نہیں تھے۔ کتنی دیر بعد حالات کو سمجھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''میری یہاں آمد تمہارے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔ عباد! میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔''

عباد نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ باہر سے آتی آوازیں سننے میں لگ گیا تھا۔ اُس کی تقلید میں وہ بھی سننے کی کوشش کرنے لگا۔ تو قدرے توقف سے عباد نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر چٹائی پر تکیہ کھینچ کر لیٹا اور اپنی اگلی منزل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ اُس کے پاس دو تین

ملکوں کے سفارتی وصحافتی کارڈز موجود تھے جنہیں وہ ضرورت کے مطابق استعمال کرسکتا تھا۔ البتہ اُس کی یہاں موجودگی عباد کے لیے مسئلہ بن سکتی تھی اور ایسا وہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس وقت عباد آیا، وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''سو گئے کیا؟'' عباد نے قصداً آہستہ آواز میں پوچھا کہ اگر وہ سو رہا ہو تو اُس کی نیند خراب نہ ہو لیکن اُس نے آنکھیں کھول دیں اور ذرا سا اُونچا ہو کر دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ بس یونہی لیٹ گیا تھا۔'' پھر پوچھنے لگا ''کون لوگ تھے؟''

''وہی بھارتی فوج کے۔'' موٹی سی گالی دے کر کہنے لگا ''اُن کے ایک سپاہی کو گولی لگی تھی وہی نکلوانے آئے تھے۔''

''تم سے۔ میرا مطلب ہے تم......'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب تم اپنے لوگوں کے کام نہیں آسکتے تو اُن لوگوں کے لیے کیوں کرتے ہو۔ لیکن بات ابھی اُس کے ہونٹوں میں تھی کہ عباد سمجھ کر کہنے لگا۔

''کرنا پڑتا ہے یار! اس طرح ہمیں اُن کے بارے میں خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔''

''کیسی معلومات؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اُن کے پلان۔'' اکثر جب میں اُن کے زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہا ہوتا ہوں تو اُس وقت غصے کے عالم میں یہ لوگ اپنے اگلے اقدام کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔'' عباد کی مبہم سی مسکراہٹ سے وہ سمجھ کر بولا۔

''کیا انہیں تم پر شبہ نہیں ہوتا؟''

''ابھی تک تو نہیں ہوا۔ خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ پہلے میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں۔''

اچانک خیال آنے پر عباد اُٹھ کر جانے لگا کہ اُس نے روک دیا۔

''نہیں عباد! میرے پاس کھانے کا وقت نہیں ہے۔ اگر تم فارغ ہو تو مجھے سری نگر جانے والی بس میں بٹھا آؤ۔''

''اس وقت تم سری نگر جاؤ گے؟'' عباد نے پُرسوچ انداز میں کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں۔ میرا خیال ہے پہلے مجھے اپنا کام کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر موقع ملا تو تمہارے پاس آؤں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن........'' عباد کچھ اُلجھ کر اُس کے بیگ کی طرف دیکھنے لگا۔

''فکر مت کرو، میرے پاس ایسا کوئی سامان نہیں ہے جو راستے میں مجھے کسی مشکل میں ڈال

سکے۔'' وہ بیگ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''کیمرہ وغیرہ؟''

''نہیں۔ یہ سب چیزیں مجھے وہیں سری نگر میں مل جائیں گی۔''

اُس کا اطمینان دیکھتے ہوئے عباد نے مزید سوال کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ واپسی میں اُسے اپنے ہاں آنے کو ضرور کہا۔ اور وہ وعدہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے کوشش کا کہہ کر اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

جس وقت وہ سری نگر پہنچا، صبح کا اُجالا نمودار ہو رہا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس اُجالے میں وہ سرمستی نہیں تھی جو اُسے اپنے گھر کے آنگن میں اُترتے اُجالے میں محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ چڑیاں اسی طرح چہچہا رہی تھیں۔ پھولوں پر شبنم کے قطرے بھی چمک رہے تھے۔ اُس نے ایک عام سے ہوٹل میں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر جیب سے عبدالقادر کا ایڈریس نکال کر سواری کی تلاش میں نظر دوڑاتا ہوا روڈ کراس کر کے دوسری طرف آ کھڑا ہوا۔ چاروں اور عجیب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔ چہروں پر خوف، سہمی ہوئی نظریں۔

اُسے بے طرح گھٹن کا احساس ہوا۔ دل چاہا کسی منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنا شروع کر دے اور اس جنت نظیر وادی کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ جائے جہاں انسان اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔ معاً اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے اُس نے بے خیالی میں پلٹ کر دیکھا۔ دو تین لڑکیاں سیاہ برقعوں میں ملبوس البتہ چہرے کھلے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں کتابیں تھیں اُس سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ تو وہ اُن پر سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک بس آ کر رُکی تو وہ جلدی سے اُس میں سوار ہو گیا۔

عبدالقادر کو وہ ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ جنید نے اُسے اُس کا ایڈریس دینے کے ساتھ بتایا تھا کہ عبدالقادر ایک مقامی اخبار میں کام کرتا ہے اور وہی اُس کی مدد کرے گا۔ بہرحال جس وقت وہ عبدالقادر کے پاس پہنچا وہ اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ جس پر اُسے تعجب ہوا اور وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''آپ کو میرے آنے کی اطلاع تھی؟''

''ہاں۔'' جواب میں عبدالقادر نے اختصار سے کام لیا۔ پھر فوراً پوچھنے لگا ''راستے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی۔''

"نہیں۔" تبھی فون کی بیل پر عبدالقادر اُدھر متوجہ ہو گیا اور ریسیور اُٹھا کر سننے لگا۔ تو اُس نے ایک نظر میں اُس کے آفس کا جائزہ لے ڈالا۔ پھر جیسے ہی عبدالقادر کو دیکھا وہ بہت عجلت میں اُٹھتے ہوئے اُس سے بولا۔

"آؤ چلو۔" وہ پوچھنا چاہتا تھا کہاں۔ لیکن عبدالقادر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ تب اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ اُس کے پیچھے بھاگ آیا۔ بائیک اسٹارٹ کرنے سے پہلے عبدالقادر نے ایک بیگ اُسے تھما دیا۔ پھر اُسے پیچھے بٹھا کر اسپیڈ سے بائیک دوڑانے لگا۔

"خیریت تو ہے نا؟" بالآخر اُس سے صبر نہیں ہوا۔ اُس کا کندھا ہلا کر پوچھا۔ تو وہ کہنے لگا۔

"یہاں خیریت کا لفظ ناپید ہے۔ ہر حال ایک بھارتی میجر مارا گیا ہے اور بدلے میں اب اُن کے سپاہی شہریوں پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بتا کر کہنے لگا۔ "دیکھو تم اپنا خیال رکھنا اور اس بیگ میں مووی کیمرہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"نہیں میں۔" وہ اسی قدر کہہ سکا، یا شاید چیختی آوازوں میں اُس کی آواز دب گئی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ عورتیں مرد سب بھارتی ایجنڈے کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ عبدالقادر نے بائیک روک دی اور فوراً اُتر کر جیب سے چھوٹا سا کیمرہ نکالا اور اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ حالانکہ ان حالات کا سامنا کرنے کے لیے وہ پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھا اس کے باوجود فوراً عبدالقادر کے پیچھے قدم نہیں بڑھا سکا بلکہ بالکل غیرارادی طور پر پنجوں پر اُونچا ہو کر ہجوم سے آگے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا اور بس اتنی سی دیر میں عبدالقادر جانے کہاں سے کہاں نکل آیا۔

اُسے اُس وقت پتا چلا جب فائرنگ سے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ بھاگنا نہیں چاہتا تھا جب کہ یہاں رُکنا بھی خطرناک تھا۔ اپنے حواس پر مکمل کنٹرول کے باعث اُس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ بہت ہوشیاری سے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گلی میں جو پہلا دروازہ کھلا نظر آیا وہ بنا سوچے سمجھے پہلے اُس میں داخل ہو گیا۔ اتفاق سے آنگن میں کوئی موجود نہیں تھا اور اُس نے غور کیا تو اندر سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تب وہ بہت احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اُوپر آیا تو اُسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ چھت کے اطراف چار دیواری نہیں تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ وہیں آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا اور بیگ میں سے کیمرہ نکال کر سیٹ کرنے لگا۔

اس کام میں اُسے چند منٹ لگے۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ پچھلی بار وہ اس جنت نظیر وادی کے حسین و دلکش مناظر کی عکس بندی کے لیے آیا تھا اور اب اُس کے سامنے انسانی لاشیں تھیں۔ سڑک پر یہاں سے وہاں تک سرخ خون جیسے اُس کی رگوں

میں جوش مار رہا تھا اگر اُسے اپنے جذبات پر قابو نہ ہوتا تو وہ سب کچھ تہس نہس کر دینے کا عزم لے کر یہیں سے چھلانگ لگا دیتا۔ لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا ہر قسم کے حالات میں اُسے خود پر کنٹرول رہتا تھا۔

شاید اُس کی اِسی خوبی کے باعث اُس کے ادارے نے اُسے یہ ذمہ داری سونپی تھی لیکن بہرحال وہ انسان تھا۔ سامنے کے رُوح فرسا منظر نے بالآخر اُس کی آنکھیں دھندلا دیں اور ابھی کیمرہ نیچے رکھ کر وہ آنکھیں صاف کر ہی رہا تھا کہ عقب سے "کون ہو تم؟" اس آواز سے وہ یوں اُچھلا کہ بہت کوشش کے باوجود نہ تو وہ اپنی جگہ پر جم سکا نہ ہی خود کو گرنے سے بچا سکا۔ سر کے بل تقریباً چودہ پندرہ سیڑھیاں لڑھکتا ہوا نیچے آیا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر بھی اُس نے فوراً اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اگلے پل اُس کا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

جس وقت اُسے ہوش آیا وہ اِسی جگہ ننگی زمین پر سیدھا لیٹا تھا البتہ سر کے نیچے تکیہ اور بدن پر چادر تھی۔ کچھ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے آسمان کو تکتا رہا، کیونکہ فوری طور پر کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ پھر جب دھیرے دھیرے ذہن بیدار ہوا تو آپ ہی آپ اُس کی نظریں آسمان سے ہٹ کر سیڑھیوں پر جا ٹھہریں اور اپنے گرنے کا منظر یاد آتے ہی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر میں ایسی شدید ٹیسیں اُٹھیں کہ اُس نے بہت احتیاط سے اپنا سر دوبارہ تکیے پر رکھ دیا۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک طرح سے اپنی ہمتیں یک جا کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی اُسے اپنے قریب آہٹ محسوس ہوئی تو وہ چونکا ضرور لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ بلکہ خود کو اس نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگا۔

"اے!" معاً ایک خوب صورت آواز نے اُس کی سماعتوں کو چھوا تو اُس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ کون کہتا ہے کہ چاند صرف آسمان پر جگمگاتا ہے وہ تو اُسے بہت قریب دیکھ رہا تھا اتنا کہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔

"کون ہو تم؟" اُسے ایک ٹک دیکھتے پا کر وہ پیچھے ہٹ کر پوچھنے لگی۔ تو اپنی محویت پر وہ دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

"انسان ہوں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ یہاں سے آئے ہو؟"

"یہاں سے۔" وہ قصداً سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا "پتا نہیں؟"

”دیکھو! مجھے چکر دینے کی کوشش مت کرو۔“ اُس نے تنک کر وارننگ دی۔ تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

”میں تو خود چکر میں ہوں۔ تمھیں کیا چکر دوں گا۔“

”بھارتی ہو؟“ جس زہریلے انداز میں اُس نے پوچھا اس سے اُسے اطمینان ہوگیا کہ اُس کی حقیقت جان کر وہ اُس سے اچھا نہیں تو بُرا سلوک بھی نہیں کرے گی۔

”بتاتے کیوں نہیں بھارت سے آئے ہو کیا؟“ اُس کی پل بھر کی خاموشی پر اُس نے دانت پیس کر پوچھا۔

”نہیں۔ پاکستان سے۔“ وہ محض اُس کے تاثرات دیکھنے کی خاطر اُس پر نظریں جما کر بولا۔ تو وہ کچھ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر پہلے شش و پنج میں پڑی، اس کے بعد پوچھنے لگی۔

”یہاں کیسے آئے؟“

”میں تمھیں سب کچھ سچ بتاؤں گا لیکن پلیز پہلے مجھے یہاں سے اُٹھاؤ۔“

وہ ذرا سا نرم پڑی تھی کہ اُس نے فوراً احساس دلایا کہ اُس وقت سے وہ ننگی زمین پر لیٹا ہے۔ اور اُسے احساس تو ہوا لیکن معذرت کرتے ہوئے بولی۔

”سوری۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ اگر اُٹھ سکتے ہو تو خود ہی اُٹھ جاؤ اور اندر کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں۔“

”دودھ نہیں چاہئے۔“

اُس نے ٹوک کر کہا تو وہ خاموشی سے چلی گئی۔ تب وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر آہستہ آہستہ اُٹھا اور اسی طرح بمشکل خود کو گھسیٹتا ہوا اندر آ کر لیٹ گیا۔ پتا نہیں کہاں کہاں چوٹیں لگی تھیں۔ سر کے علاوہ ابھی چلتے ہوئے گھٹنے میں بھی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے بدن کو اِدھر اُدھر سے چھو کر دیکھنے لگا۔ تب ہی وہ چائے لے کر آ گئی اور اُسے اپنی چوٹوں کو سہلاتے دیکھ کر کہنے لگی۔

”شکر کرو زندہ بچ گئے ہو۔ زخموں کا کیا ہے بھر ہی جاتے ہیں۔ لیکن اگر جان چلی جائے تو......“

اُس کے دیکھنے پر ایک دم خاموش ہوگئی۔ پھر چائے کا کپ اُسے تھما کر دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اب تم فوراً اپنے بارے میں سچ سچ بتا دو ورنہ..........“

”ورنہ۔“ اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ورنہ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

”مثلاً؟“ وہ ہرگز اُسے نہیں چھیڑ رہا تھا بلکہ شاید اُس کا حوصلہ دیکھنا چاہتا تھا اور وہ غصے میں آ کر بولی۔

”مثلاً یہ کہ ایک تیز دھار خنجر تمہارے سینے میں اُتار کر تمہیں یہیں دفن کر دوں گی۔ سمجھے تم۔“

وہ بہت خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کے خاموش ہونے پر ذرا سی بھنویں اُچکائیں۔ گویا اُس کے حوصلے کو سراہا تھا۔ پھر چائے کے ایک دو سپ لینے کے بعد کہنے لگا۔

”میں واقعی پاکستان سے آیا ہوں اور گو کہ میں تمہارے حقوق کی باقاعدہ جنگ لڑنے نہیں آیا پھر بھی تم اسے جنگ کہہ سکتی ہو۔ ہمارا مقصد تمہارے حقوق کو دنیا سے تسلیم کروانا ہے۔“

پھر اُس کے مزید کسی سوال سے پہلے ہی پوچھنے لگا۔

”تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟“

”سب ہیں۔ ماں باپ بھائی۔ کیا تمہیں اُن کی آوازیں سنائی نہیں دے رہیں۔“ اُس نے کہا تو وہ ایک دم خاموش ہو کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ تب بھٹکتی ہوئی نظریں اُس پر جا ٹھہریں۔ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے وہ اپنے آپ بولنے لگی۔

”مجھے تو ہر پل اُن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی اماں پکارتی ہیں، کبھی بابا اور بھائی تو یوں بھی میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے۔“

اُس کی آنکھوں کے پیالے لبریز ہو کر چھلک رہے تھے اور وہ سناٹوں میں گھرا ایک ٹک اُسے دیکھے گیا۔

دھیرے دھیرے شام اُتر رہی تھی اور اب اُسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ یہاں سے کیسے جا سکے گا کیونکہ فی الحال چلنے سے معذور تھا اور باہر ایک قیامت گزرنے کے بعد اب بالکل سناٹا چھایا تھا، یعنی کسی سواری کا ملنا بھی ناممکن تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ اُس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ ٹرے اُس کے سامنے رکھ کر جانے لگی کہ وہ بے اِختیار پکار کر بولا۔

”سنو! میں کیا کروں؟“

”کیا مطلب؟“ میں جانا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں کا سوال اُٹھائے بغیر سہولت سے بولی۔

”ابھی تم کہیں نہیں جا سکتے کیونکہ کرفیو لگ چکا ہے۔“

''کیوں؟'' بلا ارادہ ہی اُس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر فوراً سر جھٹک کر پوچھنے لگا۔ ''کب تک رہے گا؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ اُس کی بے نیازی پر جز بز ہو کر رہ گیا۔ پھر کھانے پر نظر پڑی تو ایک دم سے بھوک بھی لگنے لگی لیکن اُس نے فوراً کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ کچھ عجیب سے احساس میں گھرنے لگا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔

''کھانا کھاؤ۔'' وہ جیسے اُس کی کیفیت بھانپ کر بولی۔ پھر فوراً کمرے سے نکل گئی۔ تب کچھ اُس کے کہنے سے اور زیادہ بھوک سے مجبور ہو کر وہ کھانے لگا۔

پھر جب وہ کھانے کے برتن اُٹھانے آئی تو اُسے آرام سے سونے کی تاکید کرتی گئی۔ لیکن کھانے کے بعد اب اُسے اپنے اندر کچھ توانائی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ لیٹا اور یکسوئی سے حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ اگر کوئی پریشانی کی بات تھی تو یہ کہ اگر کرفیو کا وقفہ طویل ہوا تو اُس کا یہاں سے نکلنا مشکل ہوگا۔ جب کہ وہ کم از کم اس گھر میں اپنے قیام کو طویل نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اکیلی لڑکی جانے اپنی زندگی کی گاڑی کو کیسے کھینچ رہی تھی۔ یہی سب سوچتے وہ سو گیا۔

صبح وہ معمول کے مطابق نہیں اُٹھا۔ اور پتا نہیں اُس نے بھی اُٹھایا کہ نہیں۔ اُس کی آنکھ اس وقت کھلی جب کھڑکی کے راستے سورج کی کرن براہ راست اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بند دروازے کے اُس طرف اُس کی آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر تک تو اُسے صرف اپنی سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر کمرے کا دروازہ باہر سے کھلنے کی آواز آئی تو وہ بے اختیار اُسی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ دروازہ کھول کر جانے کیوں دہلیز پر ہی رُک گئی۔ پھر وہی سے بولی۔

''منہ دھونے کے لیے تمہیں آنگن میں جانا پڑے گا۔ چل سکتے ہو؟''

وہ جواب دینے کے بجائے بے اختیار اپنے گھٹنے چھو کر دیکھنے لگا۔ پھر چارپائی سے اُتر کر کھڑا ہوا تو گھٹنے میں تکلیف ہونے لگی لیکن اُس نے ظاہر نہیں کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچا تو وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

''میں چل سکتا ہوں۔'' وہ کہتا ہوا نل پر آ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ پھر دوبارہ کمرے میں جانے کے بجائے برآمدے میں بیٹھ گیا تو کچھ دیر بعد وہ ناشتا لے آئی۔

''مجھے افسوس ہے، میں کل سے تمہیں پریشان کر رہا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر اسی احساس میں گھر

کر بولا۔

''نہیں۔ تم ہمارے مہمان ہو اور مہمانوں کی آمد سے ہم پریشان نہیں ہوتے بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میں ڈھنگ سے تمہاری خاطر مدارات نہیں کر سکتی۔'' اُس کے بے تاثر لہجے میں بھی محرومی کا احساس چھپا ہوا تھا۔

''ارے یہ کیا کم ہے کہ تم نے مجھے پناہ دی، میرا یقین کیا۔'' وہ ابھی مزید اُس کے احسان گنواتا کہ وہ ٹوک کر بولی۔

''ناشتا کرو۔''

''تم نے کر لیا؟''

''ہاں۔ میں بہت جلدی اُٹھنے کی عادی ہوں اور ناشتا بھی اُسی وقت کر لیتی ہوں۔'' پھر موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگی۔

''باہر بہت خاموشی ہے۔ پتا نہیں آج کسی وقت کرفیو کھلے گا کہ نہیں۔''

''میرے لیے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' وہ اُس کی بات سن کر پُرسوچ انداز میں بولا۔ تو قدرے توقف سے وہ پوچھنے لگی۔

''تم یہاں کس کے پاس آئے ہو؟''

''عبدالقادر۔'' اُس نے ابھی نام لیا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''وہ اخباری رپورٹر۔''

''تم جانتی ہو اُسے؟'' جواب میں اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر تک وہ انتظار میں بیٹھا رہا پھر یاد آنے پر پوچھنے لگا۔

''وہ میرا کیمرہ کہاں ہے۔ سلامت تو ہے نا؟''

''ہاں!'' اُس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی۔ پھر کچھ مایوسی سے بولی ''تمہارا میڈیا یہاں کے حالات دکھاتا تو ہے پر اس سے کیا ہوتا ہے، یا اب تک کیا ہوا ہے؟''

مایوسی اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ اسی قدر کہہ کر موضوع بدل گیا۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''آمنہ۔''

''اور میرا نام عمر ہے۔ ایک بار پہلے بھی میں یہاں آیا تھا۔ سری نگر تو نہیں البتہ کلغام اور بارہ مولا کے علاوہ کچھ دیہاتوں میں جانا ہوا تھا۔'' وہ ماحول میں رچی اداسی دُور کرنے کی غرض سے کچھ

ہلکے پھلکے انداز میں اپنے بارے میں بتانے لگا۔ تبھی فائرنگ کی آواز سنائی دی تو وہ ایک دم خاموش ہو کر اُسے یوں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کیا ہوا ہے۔ اور وہ نخوت سے بولی۔

”محض وحشت پھیلانے کے لیے سارا دن بھارتی کتے یہی کچھ کرتے رہیں گے ہونہہ۔“

”کیا میں اوپر جا کر دیکھ سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ ایسی غلطی مت کرنا۔“ اُس نے فوراً سختی سے منع کیا۔ پھر اُس کے سامنے سے ناشتے کے برتن اُٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”اور چائے پیئو گے؟“

”نہیں۔“ وہ منع کر کے کمرے میں آ گیا اور باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو ذرا سا کھول کر بہت احتیاط سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں تک اُس کی نظریں جا سکیں وہاں تک اُسے کوئی نظر نہیں آیا۔ بالآخر مایوس ہو کر کھڑکی بند کی اور جیسے ہی پلٹا اُس کی متاسف نظروں سے خائف سا ہو گیا۔

”آئی ایم سوری۔“

”تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مشکل میں ڈالو گے۔“ وہ کہتی ہوئی اُس کی چارپائی پر بچھا کھیس جھاڑنے میں لگ گئی۔ اور وہ واقعی نادم ہو کر خود کو ملامت کرنے لگا۔ جب وہ سیدھی کھڑی ہوئی تو اُس کی ندامت محسوس کر کے کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں تمہارے لیے یہ وقت کاٹنا بہت مشکل ہے۔ اتنی خاموشی، سناٹا۔ بھلا تم کہاں عادی ہو گے۔ شاید تمہیں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے کوئی اخبار وغیرہ لاتی ہوں۔“

وہ خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اسی خاموشی سے آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پرانے اخبار اُٹھا لائی اور اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”تم یہ دیکھو، میں جب تک کھانا بنا لوں۔“

وہ کچھ نہیں بولا اور اُس کے جاتے ہی اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ لیکن پھر بہت جلدی اُکتا کر سارے اخبار ایک طرف ڈال دیئے اور قدرے نیم دراز ہو کر پھر سے یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو اُٹھ کر اُس کے پیچھے آ گیا۔ کچن میں وہ پیڑھی پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ آہٹ پر ایک نظر اُس پر ڈال کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تو وہ پنجوں پر بیٹھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولا۔

”آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی۔“ پھر اُس سے پوچھنے لگا ”تمہیں اکیلے میں گھبراہٹ نہیں ہوتی۔“

”میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے میری طرح کے اور کتنے ہی لوگ ہیں۔ پھر میں تو

بہت کم یہاں رہتی ہوں۔“ وہ آٹے کا تسلا پرے کھسکاتے ہوئے بولی۔

”یہاں نہیں رہتیں تو کہاں رہتی ہو۔“

”ہاسٹل میں۔“

”پڑھتی ہو۔“

”ہوں، میڈیکل کے تیسرے سال میں ہوں۔“ اتنی بے نیازی سے اُس نے انکشاف کیا جب کہ وہ حیران رہ گیا۔ بے یقینی سے بولا۔

”واقعی۔“

”ہاں۔ لیکن مجھے اپنی تعلیم مکمل ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ حالات تم دیکھ رہے ہو۔ پتا نہیں کیا ہو گا؟“

”جب حالات ایسے ہیں تو تم یہاں کیوں آتی ہو۔ میرا مطلب ہے اپنی تعلیم مکمل ہونے تک وہیں ہاسٹل میں رہو۔“

”وہاں کون سا سکون ہے۔ اب تک تو مجھے میڈیکل سے فارغ ہو جانا چاہیے تھا۔ پانچ سال ہو گئے ہیں اور میں ابھی تیسرے سال میں ہوں، بلکہ میرے تمام ساتھی۔“ وہ کڑھتے ہوئے بولی۔ تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کہنے لگا۔

”ایسا کرو، میرے ساتھ پاکستان چلو۔“ اُس نے چونک کر دیکھا۔ تو فوراً وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب ہے تعلیم کے سلسلے میں۔ دو سال کی بات ہے پھر یہیں آ جانا۔“

”حماد بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن یہ صرف میرا نہیں یہاں کے ہر طالب علم کا مسئلہ ہے۔“

”حماد۔“

”حماد میرے چچا کا بیٹا ہے اور منگیتر بھی۔“ ذہین بھی تھی فوراً سمجھ کر بولی۔ تو اُس نے دل میں سراہتے ہوئے پوچھا۔

”کیا وہ بھی تمہارے ساتھ پڑھتا ہے۔“

”نہیں۔ وہ مجاہد ہے۔ آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ارے ہاں! تم یہاں سے جانے کے لیے پریشان ہو نا تو رات میں حماد آئے گا اُس کے ساتھ نکل جانا۔“ اُسے جیسے اچانک اُس کی پریشانی کا حل سوجھ گیا اور وہ اُس کی بات سمجھ کر بھی اُلجھن میں پڑ گیا۔

”ایسے حالات میں حماد کیسے آئے گا؟“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔“ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں بتائے

گی اور اُس نے بھی کرید نا مناسب نہیں سمجھا۔ اُٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے اگر حماد کو مجھے ساتھ لے جانے میں کوئی پریشانی نہ ہو تو اُسی کے ساتھ نکل جاؤں گا۔''

لیکن پھر یوں ہوا کہ اُسے رات کا انتظار نہیں کرنا پڑا سہ پہر تین بجے دو گھنٹے کے لیے کرفیو کھلا تو وہ اسی وقت جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''شکریہ آمنہ!'' میں شاید زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھول پاؤں گا۔'' وقت رُخصت اُس نے کہا۔ تو وہ کچھ خفگی سے بولی۔

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔''

''تم نہ کہو لیکن میں مانتا ہوں۔ بہرحال اس یقین کے ساتھ رُخصت چاہوں گا کہ کبھی اس حسین وادی میں میں تمہیں آزادی کی مبارک باد دینے آؤں گا۔''

''انشاء اللہ۔'' اس تصور سے ہی اُس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور وہ بس ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں دیکھ سکا۔ پھر فوراً خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

تیسرے دن حالات کچھ بہتر تھے۔ اُس نے دن کے آغاز پر ہی کچھ مقامی لوگوں کے انٹرویوز ریکارڈ کر لیے۔ اس کے بعد عبدالقادر کے آفس چلا آیا۔ اُس نے کہا تھا کہ گیارہ بجے وہ اُسے مجاہدین کے ایک لیڈر کے پاس لے جائے گا۔ عبدالقادر اس وقت بہت مصروف تھا۔ اُس نے بہت سکون سے بیٹھ کر اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کیا اور کیونکہ لیڈر سے وقت طے تھا اس لیے اِسی حساب سے عبدالقادر نے کام ختم کر کے اُسے چلنے کا اشارہ کیا، تو وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کر رہا۔''

''بالکل نہیں۔'' عبدالقادر نے دوستانہ انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے۔

مختلف سڑکوں پر بائیک دوڑاتا ہوا عبدالقادر کہیں کہیں کسی سمت اشارہ کر کے اُسے وہاں ہونے والے واقعات کے بارے میں بھی بتا رہا تھا اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا کہ اچانک بریک لگنے سے اُسے بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ اگر عبدالقادر کے کندھے پر اُس کی گرفت مضبوط نہ ہوتی تو یقیناً اُچھل کر گرتا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے پوچھا تو عبدالقادر بائیک سے اُترتے ہوئے بولا۔

''ایک فٹ آگے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

وہ فوراً اُدھر متوجہ ہوا۔ لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث وہ کچھ سمجھ نہیں سکا۔ اور صحیح صورت حال تو عبدالقادر بھی نہیں سمجھ سکا البتہ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے حالات ٹھیک نہیں ہیں جبھی اُس نے بائیک فوراً کچے پر اُتار دی۔ وہ بہت خاموشی سے اُس کے ساتھ چلنے لگا ایک پہاڑی کی اوٹ میں بائیک کھڑی کر کے وہ اُس سے کہنے لگا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ پھر دوسرے راستے سے نکل چلیں گے۔''

''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ وہاں رُکنے پر آمادہ نہیں ہوا اور عبدالقادر کے پیچھے پیچھے اُسی کے انداز میں بہت احتیاط سے کبھی درختوں اور کبھی پہاڑ کی اوٹ میں آگے بڑھنے لگا۔ پھر ایک جگہ عبدالقادر نے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا اور سامنے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد دھیمی آواز میں اُسے بتانے لگا۔

''بھارتی فوجی ایک بس کو روکے ہوئے ہیں۔ مجھے تو اس میں تمام اسٹوڈنٹ لگ رہے ہیں۔''

''اُن کو روکنے کا مقصد؟'' وہ سامنے جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''محض تنگ کرنا۔ دیکھو! کس طرح سب کی تلاشی لے رہے ہیں۔''

''یہ کام آرام سے بھی تو ہو سکتا ہے۔'' وہ بھارتیوں کے وحشی پن پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ تبھی اُس کی نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں، جب کہ سینے کے اندر دھڑکتے دل کو جیسے کسی نے زور سے مٹھی میں دبا دیا تھا۔

''آمنہ!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی اُسے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ کس قدر ظالمانہ طریقے سے اُس بھارتی نے اُسے کلائی سے کھینچ کر سب سے الگ کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد باقی سب کو اُس نے جانے کا اشارہ کیا تو سب لڑکے لڑکیاں بس میں سوار ہو گئے۔ آخر میں آمنہ بھی اُن کے پیچھے جانا چاہتی تھی لیکن اُس نے دیکھا اِدھر اُدھر سے تین چار فوجیوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔

اس کے بعد وہ اکیلی لڑکی جتنی زور سے چلا سکتی تھی چلا رہی تھی۔ اُن سب کو دھکیلتے ہوئے وہ انہیں گالیاں بھی دے رہی تھی لیکن ظاہر ہے وہ ایک نہیں چار مرد تھے بلکہ مرد نہیں وحشی بھیڑیے تھے۔ اُسے کھینچتے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ تب اچانک سناٹے سے نکل کر اُس نے عبدالقادر کا کندھا جھنجھوڑ ڈالا۔

''عبدالقادر! وہ لڑکی۔ کیا وہ اُسے مار ڈالیں گے۔''

جواب میں عبدالقادر نے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ نڈھال سا وہیں بیٹھ گیا۔ تو وہ اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہوا منت سے بولا۔

''پلیز عبدالقادر! کچھ کرو۔ وہ آمنہ ہے۔ آمنہ میری محسن۔ اُسے ان ظالموں کے چنگل سے نکالو۔ وہ اسے مار ڈالیں گے۔''

''نہیں ماریں گے۔'' انتہائی بے بسی کی تصویر بنا عبدالقادر دیکھے گیا۔ پھر دُکھ سے اُس کی آواز پھٹ گئی۔

''ان وحشیوں کی ہوس کا نشانہ بن کر کیا وہ زندہ رہے گی۔''

''چلو یہاں سے۔''

''نہیں۔'' وہ عبدالقادر کو چھوڑ کر دُور جا کھڑا ہوا۔ اُس کے اندر الاؤ دہک اُٹھا تھا۔ کاش وہ سچ مچ سب کچھ تہس نہس کر سکتا۔ اگر یہ یقین مل جائے کہ اُس کی جان کے عوض اُس لڑکی کی عصمت محفوظ رہے گی تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اُن بھارتی درندوں کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد بھی وہ اُسے اپنی ہوس کا نشانہ ضرور بنائیں گے۔

کیسی کڑی آزمائش تھی کہ ہر پل صدیوں پر محیط ہو رہا تھا۔ ہر سو ویرانی، سناٹا اور اندر کہیں اُس لڑکی کی سسکیاں دم توڑ رہی تھیں۔

اماں سے اُس نے چار پانچ روز کا کہا تھا اور ندا اسے اس سے کچھ زیادہ دن۔ لیکن پورے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اور گو کہ ندا نے جب بھی اُس کے آفس فون کیا اُس کے خیریت سے ہونے کی ہی اطلاع ملی اس کے باوجود وہ خاصی متوحش سی تھی۔ اور اب تو اُسے اماں کو سمجھانا اور بہلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ شاید ماں ہونے کے ناتے وہ ایک الہامی کیفیت میں مبتلا ہو کر اُس کے لیے بہت فکرمند تھیں۔ اُٹھتے بیٹھتے اُس کی خیریت کی دُعائیں مانگتیں۔ دن میں کتنی بار ندا کو پاس بٹھا کر کہتیں۔

''مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اللہ خیر کرے، میرا عمر خیریت سے ہو۔''

''ایسا غیر ذمہ دار تو کبھی نہیں تھا۔'' اس وقت اماں بہت تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔ ''چار پانچ روز کے لیے کہیں جانا تو درمیان میں دو بار فون کر لینا اور اب مہینے گزر گئے کوئی اطلاع نہیں۔''

''پریشانی کی بات نہیں ہے خالہ جان۔'' روزانہ کی طرح وہ پھر انہیں تسلی دینے بیٹھ گئی۔ ''دراصل اُس کا کام ہی ایسا ہے۔ میرا خیال ہے کہیں دیہاتوں میں نکل گیا ہوگا اور آپ کو پتا ہے دیہاتوں میں ٹیلی فون کی کتنی پرابلم ہوتی ہے۔''

''ارے تو خط لکھ دیتا۔ اُسے یہ توفیق بھی نہیں ہوئی۔''

اور اس بات پر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ تو قدرے توقف سے اُس سے کہنے لگیں۔

''جاؤ ذرا اُس کے دفتر فون کر کے معلوم کرو۔ کب آ رہا ہے۔'' اور وہ اسی بہانے اُن کے پاس سے اُٹھ گئی۔

ابھی کل ہی تو اُس نے اُس کے آفس فون کیا تھا جہاں سے جنید نے اُس کی طرف سے اطمینان تو دلایا لیکن اُس کی آمد کے بارے میں وہ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ اور اب بار بار فون کرنا اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے کچھ دیر یونہی لابی میں ٹہل کر دوبارہ اماں کے پاس آئی تو اپنی طرف سے کہہ دیا۔

''بس خالہ جان! ایک دو دن میں آ جائے گا۔''

اس کے بعد مزید اُن کے پاس نہیں رُکی۔ فوراً کچن کا رُخ کیا۔ اُس کا اپنا دل مطمئن نہیں تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ کبھی اُس پر بے حد غصہ آتا اور کبھی اسی قدر متفکر اور اس وقت تو ایسی بے چینی تھی کہ دل چاہ رہا تھا وہ اسی وقت سامنے آ جائے۔ جانے کتنے زمانے ہو گئے تھے اُسے دیکھے ہوئے اور اپنے ان احساسات کو وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔

رات میں اماں حسبِ معمول عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو گئیں تو کچھ دیر وہ یونہی اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر دھیمی آواز سے ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ اتفاق سے کشمیر پر ہی کوئی ڈرامہ آ رہا تھا اور اُس کا دھیان پہلے ہی اُس کی طرف تھا اب ہر ہر منظر میں جیسے وہی نظر آنے لگا۔ گھبرا کر اُس نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔

نیند بالکل نہیں آ رہی تھی اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے سے اُسے سخت چڑ تھی۔ وہ بستر پر جاتی ہی اُس وقت تھی جب اُسے یقین ہوتا کہ وہ لیٹتے ہی سو جائے گی اور ابھی تو دُور دُور تک ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اُس کے کمرے سے دو تین میگزین اُٹھا لائی اور انہیں ٹیبل پر رکھ کر پہلے اماں کے کمرے میں جھانکا پھر کچن کی لائٹ آف کی۔ اس کے بعد بیرونی گیٹ چیک کرنے کی غرض سے برآمدے تک آئی تھی کہ باہر گاڑی رُکنے کی آواز پر اُس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا اور ہر طرف خاموشی کے باعث وہ کچھ سہمی ہوئی نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز، اس کے بعد کال بیل پر وہ بھاگ کر گیٹ کے قریب آئی۔ لیکن پھر رُک کر پوچھا۔

''کون؟''

"میں ہوں عمر۔" اُس کے لہجے میں مسافتوں کی تھکن تھی جسے محسوس کر کے اُس نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کیونکہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ سیاہ چادر میں لپٹی وہ جو کوئی بھی تھی اس دنیا کی باسی نہیں لگ رہی تھی۔ جانے کس دیس سے راستہ بھٹک کر آئی تھی۔ وہ اُس کے حسن جہاں سوز میں یوں کھوئی کہ اخلاقی تقاضے نبھانے بھی بھول گئی۔ عمر نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر اُس ماہ کامل سے بولا۔

"آؤ آمنہ! اندر چلو۔" انداز ایسا تھا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہو۔ پھر دھیرے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل پڑا تو وہ ایک دم چونک کر اُن کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج میں آئی اور جب وہ اُسے صوفے پر بٹھا چکا۔ تب وہ اُسے مخاطب کر کے بولی۔

"کیسے ہو عمر؟ اتنے دن لگا دیئے۔"

"بس یار۔" بہت مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بس اسی قدر کہہ سکا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"اماں سو گئیں کیا؟"

"ہاں، اُٹھا دوں؟"

"نہیں۔ وہ بہت سوال کریں گی اور اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ویسے ٹھیک تو ہیں نا۔"

"ہاں۔" وہ مختصر جواب دے کر آمنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ تو وہ کہنے لگا۔

"اس کے بارے میں، میں فی الحال میں اتنا کہوں گا کہ یہ آمنہ ہے، ہماری مہمان۔ اگر ہو سکے تو اسے کچھ کھلا پلا دو۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"میں ابھی لاتی ہوں۔" آمنہ کی بے نیازی پر وہ کچھ حیران ہوتی ہوئی کچن میں آئی۔

فریج میں دوپہر کا سالن رکھا تھا۔ اُس نے وہ گرم کیا۔ پھر ڈبل روٹی کے سلائس گرم کرنے کے ساتھ چائے بھی بنالی۔ اس دوران اُس کا ذہن صرف آمنہ میں اُلجھا رہا اور فطری سی بات تھی۔ بہت سے سوال اُٹھ رہے تھے۔ لیکن وہ جانتی تھی اس وقت عمر اُس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ اس لیے اپنے تجسس پر قابو پا کر اُس نے ساری چیزیں ٹرے میں رکھیں اور لاؤنج میں آئی تو عمر خاصے ڈھیلے ڈھالے انداز میں دُور تک ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا جب کہ آمنہ ہنوز اسی انداز میں تھی۔

"اس وقت جو تھا میں لے آئی۔" وہ ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ تو چائے دیکھ کر عمر فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

"تھینک یو، چائے کی بڑی شدید خواہش تھی۔"

"پہلے کچھ کھا لو۔"

"بس۔ میں صرف چائے پیوں گا البتہ اسے ضرور کھلاؤ۔" وہ کہہ کر خود ہی اپنے مگ میں چائے ڈالنے لگا پھر مگ اُٹھا کر پیچھے ہٹا۔ تب اُس نے ٹرے آمنہ کے سامنے کھینچ دی اور اُسے مخاطب کر کے بولی۔

"چلو آمنہ! شروع کرو۔" اور آمنہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اُس کی اس قدر لاتعلقی پر وہ کچھ دیر بغور اُسے دیکھتی رہی۔ پھر عمر سے پوچھنے لگی۔

"کیا معاملہ ہے؟ یہ سنتی نہیں، یا............"

"یہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔" وہ اتنا بے حس تو نہیں تھا جتنی بے حسی کا مظاہرہ کر گیا تھا۔

"کیا؟" اُسے شدید دھچکا لگا اور وہ انتہائی تاسف سے اُس موہنی صورت کو دیکھنے لگی۔ تو شاید وہ اُس کے مزید کسی سوال سے بچنے کی خاطر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں سونے جا رہا ہوں ندا! تم اسے کھانے کے بعد سلا دینا۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اُس کے پیچھے چیخ کر کہتی کہ میں تمہارے باپ کی نوکر ہوں کیا۔ لیکن اس وقت وہ خود سناٹے میں تھی، بہت خاموش اور ایسی ہی متاسف نظروں سے اُسے اُس کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر تک یونہی گم صم بیٹھی رہی۔ پھر آمنہ کی طرف متوجہ ہوئی تو بے اختیار اُس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اچانک آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اُتر آیا۔ جانے اس لڑکی کی بے بسی، یا اس کی بے حسی پر، یا اپنے ہی کسی جذبے کے پامال ہونے کا دُکھ تھا۔ اور دُکھ تو دُکھ ہے، اپنا ہو، یا پرایا۔ حساس دل تو رونے کو بہانے مانگے۔

نیند کے عالم میں وہ جانے خود کو کہاں دیکھ رہا تھا کہ اماں کی آواز پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ لیکن فوری طور پر یقین نہیں آیا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ جب ہی کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

"اماں! آپ یہاں؟"

"کیوں کیا اب میں تمہارے کمرے میں بھی نہیں آ سکتی۔"

اماں نے بگڑ کر کہا تو اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر ایک دم اُن سے لپٹ گیا۔

"ہٹو پرے منہ دیکھے کی محبت جتاتے ہو۔ اتنے دن خیال نہیں آیا ماں کا۔ اور ہاں وہ لڑکی کون ہے؟"

ہلکی پھلکی ڈانٹ کے ساتھ اماں نے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے پوچھا تو گو کہ اُن کا سوال غیر متوقع نہیں تھا اور نہ ہی اُسے سچ بتانے میں کوئی عار تھا پھر بھی جانے کیوں وہ اصل صورت حال بتانے سے ہچکچا گیا اور قصداً انجان بن کر بولا۔

''کون لڑکی؟''

''ارے میں اُس کی بات کر رہی ہوں جو رات تمہارے ساتھ آئی ہے۔''

''اچھا وہ۔'' اُس نے یاد آنے کی ایکٹنگ کی۔ تبھی ندا چائے لے کر آ گئی تو وہ اُس سے پوچھنے لگا۔

''آمنہ اُٹھ گئی۔''

''ہاں وہ تو اذان کے وقت سے اُٹھی ہوئی ہے۔''

ندا کے بتانے پر اُس نے ذرا سے کندھے اُچکائے۔ پھر اماں کو منتظر دیکھ کر کہنے لگا۔

''اماں! یہ لڑکی کشمیر سے آئی ہے۔ بہت مظلوم ہے بے چاری۔ کوئی نہیں ہے اس کا۔ ماں باپ بھائی بہن سب شہید ہو گئے اور اس صدمے سے یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔''

''ہائے بدنصیب۔'' اماں اُس کے دُکھ پر آبدیدہ ہو گئیں۔ پھر پوچھنے لگیں۔ ''یہاں کیسے آئی اور تم......تم اسے کہاں سے لائے......''

''میں۔'' وہ ایک نظر خاموش کھڑی ندا کو دیکھ کر کہنے لگا ''اسلام آباد سے۔ اس کا ایک عزیز اسے وہاں جس کے پاس چھوڑ گیا تھا وہ میرا دوست ہے۔ خاصا پریشان تھا کیونکہ اُس کی بیوی اسے رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ یوں دوست کی منت سماجت سے مجبور ہو کر میں اسے لے آیا۔ اگر آپ اجازت دیں گی تو یہیں کسی کونے میں پڑی رہے گی ورنہ دارالامان چھوڑ آؤں گا۔''

آخر میں اُس نے قصداً ایسا انداز اختیار کیا جیسے اُس سے کوئی دل چسپی نہ ہو۔ اور اماں کا نرم دل تڑپ گیا۔ ٹوکتے ہوئے بولیں۔

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسی معصوم اور مظلوم بچی، جانے وہ لوگ کیسا سلوک کریں اس کے ساتھ۔ نہیں یہ یہیں رہے گی۔'' پھر اچنبھے سے پوچھنے لگیں ''بولتی نہیں ہے کیا؟ صبح سے چپ چاپ بیٹھی ہے۔''

''پتا نہیں اماں! شاید صدمے سے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہے۔''

پھر اچانک ندا سے پوچھنے لگا ''تم ڈاکٹر ہو، اس کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں، میرا مطلب ہے اس کے حالات جانے بغیر۔''

''یہ تو بتا سکتی ہو کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی، یا نہیں۔''

''اس بارے میں بھی فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے کسی سائیکلوجسٹ کو دکھا دینا شاید ٹھیک ہو جائے۔''

ندا نے دل چسپی ظاہر کرنے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ تو پُرسوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد وہ اماں سے کہنے لگا۔

''اماں! آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے بہت بے ضرر لڑکی ہے۔ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

''ارے جس کا اپنا اتنا نقصان ہو گیا ہو، وہ بے چاری کسی کو کیا نقصان پہنچائے گی۔''

اماں افسوس سے کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر جاتے جاتے اُسے جلدی منہ ہاتھ دھونے اور ناشتا کرنے کی تاکید کرتی گئیں۔ اور اُن کے جاتے ہی ندا اُس سے پوچھنے لگی۔

''پورے دو مہینے تم کشمیر میں رہے، یا کہیں اور چلے گئے تھے۔''

''وہیں تھا۔'' وہ مختصر جواب دے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا کہ وہ راستہ روک کر بولی۔

''سنو خالہ جان کو تم نے کہانی گھڑ کے سنائی اور انہوں نے یقین بھی کر لیا لیکن میں سچ سنوں گی۔''

''سچ تو تمہیں معلوم ہے۔ جانے سے پہلے ہی میں نے تمہیں سچ بتایا تھا کہ میں............''

''میں آمنہ کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ فوراً ٹوک کر بولی۔

''اس کے بارے میں ابھی میں نے جو کہا وہی سچ ہے۔''

وہ کہتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں اماں اور بوا دونوں آمنہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر اُسے دیکھا۔ پھر بوا کو ناشتا بنانے کا کہہ کر نہانے چلا گیا۔ اس وقت یوں بھی وہ بہت جلدی میں تھا۔

ندا کی بے چینی، جو اُس سے پورے دو مہینے کی رُوداد سننے کے سلسلے میں تھی، محسوس کرنے کے باوجود وہ اُسے بھی ٹال گیا اور اماں کو بھی آمنہ کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دے سکا۔ نہانے کے بعد بہت عُجلت میں ناشتا کیا اور آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔

گو کہ یہاں سے وہ آفس کے کام سے ہی گیا تھا اور وہ کام تو اُس کا ہفتے بھر میں ہی ہو گیا تھا، اس کے بعد کا سارا وقت وہ سری نگر اور بارہ مولا میں اپنی مرضی سے رُکا تھا۔ وہ بھی آمنہ کی وجہ

سے۔ لیکن آفس میں وہ یہ جواز پیش کر کے آمنہ کو موضوع نہیں بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوچتا ہے۔ اور اس بارے میں اُس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ کام کے دنوں کے علاوہ باقی ایام کی اُس نے آفس جاتے ہی چھٹی منظور کرالی۔ اس کے بعد جس کسی نے بھی اُس سے اتنے دنوں غیر حاضری کی وجہ پوچھنی چاہی اُس نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔ میں چھٹی پر تھا۔ البتہ جنید کو اُس نے ساری حقیقت کہہ سنائی۔ کیونکہ وہ اُس کا بہت قریبی دوست تھا۔ پھر اُسی سے مشورہ مانگا کہ وہ آمنہ کا کیا کرے۔ تو کتنی دیر سوچنے کے بعد جنید کہنے لگا۔

''دیکھو دوست! جب تم اُسے لے آئے ہو تو اب وہ سراسر تمہاری ذمہ داری ہے جو تمہیں پوری ایمان داری سے نبھانی ہے۔ اُس کا علاج کراؤ۔ ٹھیک ہو جائے تو کسی اچھی جگہ شادی کر دو۔''

''ہوں......'' بات اُس کی سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن یہ سب اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ جب ہی جنید سے اتفاق کرنے کے باوجود وہ اندر ہی اندر اُلجھتا رہا تھا۔

شام میں وہ گھر لوٹا تو معلوم ہوا ندا اپنے گھر جا چکی ہے۔ اور ظاہر ہے اُسے تو جانا ہی تھا لیکن اس وقت وہ بُری طرح جھنجھلا گیا کیونکہ اندر شدید گھٹن کے باعث وہ خاصا ڈیپریس تھا۔ اور ندا صرف کزن ہی نہیں بہت اچھی دوست بھی تھی، وہ اُس سے باتیں کر کے اپنی اندر کی گھٹن سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا جبھی اُس کے جانے کا سن کر جھنجھلا گیا۔

پھر خیال آیا شاید اُس سے خفا ہو کر گئی ہے کیونکہ وہ رات سے مسلسل اُس کے فطری تجسس کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اور وہ بھی کیا کرتا ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ تھا کہ ابھی تک خود اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حالات اُسے کس موڑ پر لے آئے ہیں۔

''کھانا کھاؤ۔'' بوا جانے کب اُس کے سامنے کھانا رکھ گئی تھیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اماں نے ٹوکا تو چونک کر دیکھنے لگا۔ پھر نظر اُن کے پاس بیٹھی آمنہ پر پڑی۔ ویسی ہی بے نیاز اور لاتعلق جیسی وہ گزشتہ ڈیڑھ مہینے سے دیکھ رہا تھا۔ اگر اس سے پہلے وہ اُس سے نہ ملا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے پیدائشی گونگی بہری۔ لیکن وہ اُس کی آواز سن چکا تھا جو ابھی بھی اُس کی سماعتوں میں محفوظ تھی۔

''شکر کرو، زندہ بچ گئے ہو۔ زخموں کا کیا ہے بھر ہی جاتے ہیں۔ لیکن اگر جان چلی جائے تو۔''

''اور جو زخم اُسے لگائے گئے ہیں وہ تو بھرنے والے نہیں ہیں۔''

اس سوچ کے ساتھ ہی وہ کھانا کھائے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تو اماں نے تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا۔

''کیا بات ہے۔ کھانا تو کھالو۔''

''بس اماں! بھوک نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے کہہ کر لابی میں آ گیا اور ندا کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف خالہ تھیں۔ اُس کی آواز سنتے ہی یوں شروع ہوئیں کہ حسب عادت بات سے بات نکالتی گئیں۔

''ہائیں! اس بار تم نے اتنے دن لگا دیئے اسلام آباد میں، پیچھے اماں کا خیال بھی نہیں آیا۔ اب تم شادی کر لو تاکہ تمہاری اماں کو بھی آرام ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔''

وہ بس جی جی کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئیں کہنے لگا۔

''خالہ! ذرا ندا سے بات کرا دیں۔''

اور شکر کہ انہیں کوئی کام یاد آ گیا جو فوراً ندا کو بلا کر ریسیور اُس کے حوالے کر کے چلی گئیں۔ اور وہ ندا کی آواز سنتے ہی پوچھنے لگا۔

''سنو خفا ہو کیا؟''

''یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟'' وہ اُلٹا اُس سے پوچھنے لگی۔

''گھر جو چلی گئیں۔''

''کیا اب بھی نہ آتی۔ میرا مطلب ہے گھر تو مجھے آنا تھا اور اس سے میری خفگی تو ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر تم نے کیسے سوچ لیا۔''

وہ اُس کے ٹوکنے پر گہری سانس کھینچ کر بولا۔

''بس یونہی خیال آیا تھا۔''

''اچھا خیر یہ بتاؤ۔ آمنہ کیسی ہے؟''

''اتنی سی دیر میں اُس میں کیا تبدیلی آ سکتی ہے۔''

''ہاں دھیرے دھیرے ہی نارمل ہو گی۔ پھر بھی تم اُسے فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

ندا کی بات سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

''سنو! تم کب آؤ گی؟''

''کیوں؟ پھر کہیں جا رہے ہو کیا۔''

''نہیں۔'' وہ اُس کی بات پر جز بز ہو کر بولا۔ جس پر وہ ذرا سا ہنسی پھر کہنے لگی۔

''ابھی نہیں آ سکتی کیونکہ میری سارے دن کی ڈیوٹی ہے۔''

''جاب کر [illegible] سے؟'' اُس نے تعجب سے پوچھا۔

''ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ سول ہاسپٹل میں ہوں۔ خالہ جان نے نہیں بتایا تمہیں۔''

''کب بتاتیں۔ صبح تمہارے سامنے ہی آفس چلا گیا تھا۔ ابھی لوٹا ہوں اور تمہیں نہ پا کر پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں تم خفا ہو کر تو نہیں چلی گئیں۔''

''اگر میں سچ مچ خفا ہو کر آتی تو تم کیا کرتے؟''

''کیا کرتا؟ دل پر ایک اور بوجھ آن گرتا۔''

''اور...... بوجھ۔'' وہ پوچھ رہی تھی۔ لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن بے انتہا مصروفیت میں گزر گئے۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے باعث آفس میں اتنا کام جمع ہو گیا تھا وہ صبح کا گیا رات میں لوٹتا۔ اماں خصوصاً آمنہ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتیں، یا اُس کے علاج کی طرف اُس کی توجہ دلانا چاہتیں تو وہ یہ کہہ کر ٹال جاتا کہ کچھ دن صبر کریں، میں دفتری کام نمٹا لوں پھر اطمینان سے اُسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ اور اماں نے زیادہ زور یوں نہیں دیا کہ ایک تو انہیں اُس بے ضرر لڑکی کی طرف سے کسی پریشانی، یا دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ دوسرے اُس کی مصروفیت بھی دیکھ رہی تھیں کہ صبح کا گیا رات میں لوٹتا ہے۔

اس وقت بھی وہ تھکا ہارا آ کر لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ نیچے فرش پر بیٹھی آمنہ کو دیکھ کر ایک پل کو اُس کا پورا وجود سن ہو کر رہ گیا۔ پھر جیسے خود کو سہارا دے کر اُٹھا اور اُس کے قریب آ کر پنجوں پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آمنہ! یہاں کیوں بیٹھی ہو۔'' جواب میں اُس نے کوئی حرکت نہیں کی بلکہ جیسے اُس کی آواز سنی ہی نہیں۔ تب اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھا پھر مٹھی میں لے کر دھیرے سے دبایا تو وہ بہت خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگی اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ بھی چپ چاپ اُس کی آنکھوں میں دیکھے گیا۔ لانبی پلکوں کے اندر کس قدر گہرائی تھی اور وقت کا جانے کون سا لمحہ تھا کہ وہ ان گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔

''عمر!'' اماں پکارتی ہوئی شاید اُسی طرف آ رہی تھیں۔ تب وہ چونک کر اُس طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اُس کا ہاتھ ابھی بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اماں آئیں تو اُسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''بیٹا! یہ صبح سے یہیں بیٹھی ہے۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ اس طرح تو یہ مر جائے گی۔ اگر تم اس کا

علاج نہیں کرا سکتے تو پھر چھوڑ آؤ دارالامان۔''

''نہیں اماں بس کل، کل چھٹی کا دن ہے۔ میں لے جاؤں گا اسے ڈاکٹر کے پاس۔'' وہ اپنی بدلتی کیفیت کے سبب کچھ رُک رُک کر بول سکا۔

''اچھا ابھی تو اسے کچھ کھلاؤ۔''

''جی میں ذرا چینج کر لوں۔'' وہ کہتا ہوا اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

پھر اماں کے ساتھ مل کر وہ بہت مشکل سے اُسے تھوڑا سا کھانا کھلا سکا۔ کچھ سنتی بھی تو نہیں تھی بلکہ سن کر بھی اُس کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اپنے آپ پتا نہیں کیا سوچتی تھی، یا شاید اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں ہی مفقود ہو گئی تھیں۔

اس رات وہ کتنی دیر تک خود کو ملامت کرتا رہا کہ اس طرح کیسے اُس نے اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لڑکی اگر اُسے اپنے گھر میں پناہ نہ دیتی تب بھی انسانیت کے ناتے اُس کا فرض تھا اور فرض سے غفلت کے احساس نے اچانک اُسے بہت بے چین کر دیا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد ہی اُس نے سوچا وہ پہلے خود ڈاکٹر سے مل کر وقت لے کر آئے اس کے بعد اُسے ساتھ لے جائے گا۔ اور ابھی وہ تیار ہو رہا تھا کہ ندا آ گئی۔ اُسے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

''مجھے ابھی ابھی تمہارا خیال آیا تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔''

''خیریت۔'' اُس نے پوچھا۔ پھر فوراً خود ہی کہنے لگی ''نہیں خیریت نہیں ہو سکتی، کیونکہ خیریت میں تمہیں میرا خیال نہیں آتا۔''

''ایسی بات تو نہیں کرو یار۔''

''اچھا چھوڑو، کام بتاؤ۔'' وہ اُس کی خجالت نظر انداز کر گئی۔

''آمنہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے، اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو۔ میرا مطلب ہے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں سائیکلوجسٹ، یا پہلے جنرل فزیشن کو دکھاؤں۔''

اُس نے سنجیدگی سے مشورہ طلب کیا۔ تو فوراً جواب دینے کے بجائے ندا کچھ تعجب سے اُسے دیکھے گئی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔'' اُس کے ٹوکنے پر وہ اسی تعجب سے بولی۔

''یعنی ابھی تک تم نے اُسے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔''

''اب تم مجھے ملامت کرنے بیٹھ جاؤ۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے۔'' اُس کے جھنجلانے پر وہ بھی خفگی سے بولی۔ پھر اُٹھتے ہوئے پوچھا

"کہاں ہے آمنہ؟"

"اماں کے کمرے میں ہے۔ رات اُسے کچھ حرارت ہوگئی تھی۔ ابھی پتا نہیں.........."

وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے کمرے سے نکل گئی اور وہ بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اماں کے کمرے میں وہ چپ چاپ لیٹی تھی اور اماں اُس کا ماتھا چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ ندا نے سلام کرنے کے ساتھ ہی پوچھا۔

"کیا ابھی بھی اسے بخار ہے۔"

"ہاں مجھے تو تیز لگ رہا ہے۔ تم دیکھو۔" اماں تشویش سے کہتی ہوئی پیچھے ہٹیں تو ندا نے آگے بڑھ کر اُس کی کلائی تھام لی۔ بخار تو تھا ہی اس کے بعد نبض پر ہاتھ رکھتے ہی ندا کچھ ٹھٹھک سی گئی۔ پھر فوراً اُسے مختلف زاویوں سے چیک کرنے لگی۔ اُس کے انداز میں کچھ ایسی عجلت تھی جیسے ایک پل میں اُس کے اندر اُتر جانا چاہتی ہو۔ پھر جیسے ہی اُسے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوئی وہ کچھ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ! کوئی نئی بیماری دریافت ہوئی۔"

جواب میں اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔ پھر اماں سے کہنے لگی۔

"خالہ جان! اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر کپڑا رکھیں، بخار اُتر جائے گا۔ باقی میں دوا لکھ دیتی ہوں۔"

اماں اُس کی بات سنتے ہی کمرے سے نکل گئیں تو اس بار وہ بھی تشویش سے پوچھنے لگا۔

"کیا بخار تیز ہے؟"

"بخار اتنا تیز نہیں ہے۔" ندا جیسے اپنے آپ سے بولی اور اس کے اس انداز پر وہ بُری طرح اُلجھ کر چیخا۔

"پھر......؟"

"شی از پریگ ننٹ۔" ندا کے متاسف لہجے میں اور جانے کیا تھا کہ ایک پل کو اُسے اپنے وجود کے پرخچے اُڑتے محسوس ہوئے۔ یہاں وہاں ہر طرف جیسے بگولے اُٹھ رہے تھے۔ ندا کی تیز کاٹتی ہوئی نظریں، اُف اُس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اب وہ اس لڑکی کے سامنے صفائیاں پیش کرے گا۔ اس خیال سے ہی اُس کی پیشانی تر ہوگئی۔ ندا کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر وہ ایک دم سناٹے سے نکل کر اُس کے پیچھے کھسکا۔ آگے اماں ٹھنڈے پانی سے بھرا کٹورا لیے آ رہی تھیں۔ وہ اُن سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"یہ تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ واقعی بوکھلا گیا۔ پھر ایک دم سنبھل کر کہنے لگا۔

"کوئی تشویش کی بات نہیں ہے اماں! آمنہ کا بخار ابھی اُتر جائے گا۔ آپ جب تک ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں، میں ندا کے ساتھ ڈاکٹر سے ٹائم لے کر آتا ہوں اور ہاں اس کی دوا بھی لیتا آؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" اماں کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ ندا کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ چپ چاپ اُس کے پیچھے چلی آئی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اب وہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ پھر اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہی کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے عمر! فی الحال آمنہ کو کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے؟" وہ بہت حد تک خود پر قابو پا چکا تھا اور اب اُس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔

"ڈیلیوری تک۔" ندا نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا۔ تو وہ ہوں کہہ کر جانے کس سوچ میں گم ہوگیا۔ کتنی دیر گزر گئی تب اُس کی خاموشی سے ندا کو اُلجھن ہونے لگی۔ چاہتی تھی وہ خود سے ہی کوئی اعتراف کرے لیکن اُسے آمادہ نہ دیکھ کر بالآخر خود ہی افسوس سے بولی۔

"تمہیں کم از کم مجھ سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔"

"کیا.....!" اُس نے اپنے خیال سے چونک کر دیکھا۔ تو وہ ذرا سے کندھے اُچکا کر بولی۔

"یہی کہ تم آمنہ سے شادی کر چکے ہو؟" اور جانے کیسے وہ اتنے ضبط کا مظاہرہ کر گیا۔ اُس کی بات کا فوری کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں ہوا نہ ہی کچھ بولا۔ لیکن جب ایک ریسٹورنٹ کے پُرسکون گوشے میں اُس کے سامنے بیٹھا تو اُس بات کے جواب میں کہنے لگا۔

"کاش! یہی سچ ہوتا اور اس سچ کو میں پہلے ہی مرحلے پر بہت خوشی سے بیان کرتا کہ میں آمنہ سے شادی کر چکا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ اُلجھ کر دیکھنے لگی تو قدرے رُک کر اُس نے آمنہ کے ساتھ ہونے والا بھارتی فوج کے ظالمانہ سلوک کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

"اُس روز سری نگر میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ عبدالقادر نے بہت کہا کہ میں واپس چلا جاؤں، کیونکہ کشمیر کی بیٹیوں کے ساتھ یہ مظالم کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور یہ تو میں بھی جانتا تھا اس کے

باوجود میرا دل کسی طرح بھی آمنہ کو یوں بے آسرا چھوڑ آنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اور سچ پوچھو تو میرا ارادہ اُسے اپنے ساتھ لانے کا بھی نہیں تھا اسی لیے کشمیر میں میرا قیام طویل ہو گیا۔ بس وہیں اس کوشش میں لگا رہا کہ یہ کسی طرح نارمل ہو جائے۔ اگر ذرا سا بھی یہ اپنے حواسوں میں آجاتی تو میں اُسے چھوڑ کر آجاتا لیکن۔''

وہ خاموش ہو کر کتنی دیر تک نفی میں سر ہلاتا رہا۔ پھر گہری سانس کھینچ کر بولا۔

''بہت ظلم ہے۔ اب بتاؤ وہ لڑکی جسے اپنا ہوش نہیں وہ۔''

وہ اُس کی بات سمجھ کر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔ پتا نہیں دُور دُور تک ایسی ہی ویرانی تھی، یا اُسے محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی دیر بعد اُس کے سگریٹ سلگانے پر وہ چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی تو اسی قدر کہہ سکی۔

''چلیں۔''

''پہلے اس مسئلے کو تو حل کرو۔''

''کون سے مسئلے کو۔'' وہ واقعی نہیں سمجھی۔ جس سے وہ جزبز ہو کر بولا۔

''آمنہ۔ میں آمنہ کی بات کر رہا ہوں۔ اُسے اس مصیبت سے چھٹکارا دلاؤ۔''

ایک لمحہ کو اُسے اپنے اندر سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ بمشکل اُس نے خود کو جھرجھری لینے سے روکا اور نظریں چرا کر بولی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں...... کیوں ممکن نہیں ہے۔ تم ڈاکٹر ہو۔'' اُس کے تیز لہجے پر وہ بھی چیخ کر بولی۔

''ڈاکٹر ہوں اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ اب یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ پانچ ماہ کی حاملہ ہے اور اب ایسی کوئی بھی کوشش آمنہ کی جان لے سکتی ہے۔''

''مائی گاڈ'' اُس نے اپنا سر تھام لیا۔ تو قدرے توقف سے وہ اُسے الزام دیتے ہوئے بولی۔

''یہ سب تمہاری غفلت کا نتیجہ ہے۔ اس سے اچھا تھا تم اُسے وہیں چھوڑ آتے۔'' اُس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر کہنے لگی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ اب کیا ہر ایک کے سامنے اُس کی بے آبروئی کی داستان دہراؤ گے۔ نہیں، عمر میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

اچانک اُس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اُتر آیا۔ جسے روکنے کی خاطر اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ جب کہ وہ حیران سا ہو کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور خود

پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

''ایسے واقعات کی تشہیر نہیں کی جاتی عمر! بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جاتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن جو واقعہ خود اپنے ہونے کا اعلان کر رہا ہو اُسے ہم کیسے چھپا سکتے ہیں۔''

اُس کا اشارہ بچے کی طرف تھا۔

وہ سمجھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر ایک حل سوچنے پر اُسے دیکھ کر بولی۔

''نو پرابلم، اب تمہیں یہ کہنا ہے کہ آمنہ میرڈ تھی اور باقی گھر والوں کے ساتھ اُس کا شوہر بھی شہید ہو چکا ہے۔''

وہ اُس کی بات سن کر پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے ذرا سا مسکرایا تھا۔

اماں اس انکشاف پر کہ آمنہ شادی شدہ بلکہ بیوہ اور مزید بچے کی ماں بھی بننے والی ہے، اُسے بُری طرح لتاڑنے لگیں کہ اُس نے انہیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یعنی انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ اس یتیم اور بیوہ کے ساتھ اُن سے انجانے میں کوئی زیادتی تو نہیں ہو گئی، جس کے لیے انہیں خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے۔ جب ہی اُس پر بگڑ رہی تھی کہ اگر وہ انہیں پہلے ہی بتا دیتا تو وہ اسی حساب سے اُس کا خیال رکھتیں۔

''ہائے بچی بے چاری کچھ بولتی نہیں۔ پتا نہیں اس کا کب کیا کھانے کو دل چاہتا ہوں گا۔ ایسی حالت میں تو کچھ اچھا بھی نہیں لگتا۔''

وہ چپ چاپ اُن کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا کیونکہ یہ اطمینان جو ہو گیا تھا کہ اماں نے بغیر کوئی شبہ ظاہر کیے اُس کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ پھر اُن کے خاموش ہونے پر کچھ صفائی پیش کرنے کا خیال آیا تو کہنے لگا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا اماں کہ اس کے ماں باپ بھائی شوہر سب شہید ہو گئے۔ آپ نے شاید ٹھیک سے سنا نہیں ہو گا۔''

''ہاں......!'' اماں اُس کے دُکھ کو نئے سرے سے محسوس کرتے ہوئے کڑھنے لگیں۔ ''کتنی معصوم بچی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اتنے پہاڑ جیسے دُکھ جھولی میں آن گرے۔''

''اور شاید یہ بھی اچھا ہے کہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے ورنہ دیواروں سے سر ٹکراتی مر جاتی۔''

رب تعالیٰ کی مصلحت جانتے ہوئے اُس نے سوچا اور بے حد خاموش نظروں سے دُور بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔

پھر کتنے دن گزر گئے۔ فی الحال آمنہ کی طرف سے قصداً لاپروا ہو گیا۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے، لانے کی ذمہ داری ندا کو سونپ دی۔ ویسے وہ خود ڈاکٹر تھی، زیادہ تر خود ہی اُسے چیک کر لیتی۔ باقی اُس کا خیال رکھنے کو اماں موجود تھیں بلکہ انہیں تو جیسے مصروفیت ہاتھ آ گئی تھی سارا دن اُس کے ساتھ لگی رہتیں اور وہ ان چار مہینوں میں بہت حد تک اماں سے مانوس ہو گئی تھی۔ اُن کی باتیں غور سے سنتی اور جو وہ کہتیں اس پر عمل کرتی لیکن ابھی تک اُس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ جس پر پہلے اُسے شبہ اور اب یقین ہو چلا تھا کہ وہ قوت گویائی سے محروم ہو چکی ہے ورنہ کسی وقت تو وہ بے اختیار ہو کر کچھ بول سکتی تھی۔ جب ہی اس طرف سے تقریباً مایوس ہو کر وہ سوچتا تھا کہ شاید ڈاکٹر بھی اُس کی گویائی واپس نہیں لا سکیں گے اور یہ تھی تو تشویش کی بات لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔

اور ان دنوں تو وہ یوں بھی اُس سے خائف رہنے لگا تھا۔ جانے کیوں اُسے دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا۔ اُس کی پہلی کوشش یہی ہوتی کہ اُس سے سامنا نہ ہو لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا، سامنا ہوتا اور وہ فوراً نظریں چرا لیتا۔ ابھی تک وہ خود نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ کس بات سے خائف ہے۔

اس وقت کھانے کے بعد گو کہ اُس کا دل چاہ رہا تھا کوئی ہلکی پھلکی مووی دیکھے لیکن اُس کی وجہ سے اپنے کمرے میں چلا آیا اور ابھی پڑھنے کے لیے کوئی کتاب منتخب کر رہا تھا کہ اماں نے پکار لیا۔ وہ اُن کے کمرے میں آیا تو پہلی نظر اُسی پر پڑی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ یوں بیٹھی تھی جیسے اُس کی آمد سے پہلے اماں کے ساتھ دنیا جہان کی باتیں کرتی رہی ہو۔ جب ہی اُس نے کچھ ٹھٹک کر اُسے دیکھا پھر اپنے گمان کی تصدیق کی خاطر اماں سے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے اماں۔ کچھ کہہ رہی ہے آمنہ۔''

''آمنہ!'' اماں نے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ پھر گہری سانس کے ساتھ بولیں۔ ''یہ بے چاری کیا کہے گی۔ تم بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''جی!'' وہ قدرے تکلف سے اماں کے پاس بیٹھا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ تو اماں بغیر کسی تمہید کے کہنے لگیں۔

''دیکھو! میں اس انتظار میں تھی کہ ندا پڑھائی سے فارغ ہو لے۔ اب تم ہامی بھرو تو میں بات چھیڑوں۔''

''کیا بات؟'' وہ سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔ جس پر اماں بگڑ کر بولیں۔

''کوئی اتنے نا سمجھ نہیں ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔''

اُس نے اب خاموشی اختیار کر لی تو اماں ندا کی خوبیاں گنوانے لگیں۔

''ندا پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہے۔ ماشاءاللہ خوب صورت بھی ہے۔ پھر گھر کی دیکھی بھالی لڑکی ہے۔ عادت کی بھی اچھی ہے۔''

''مجھے ان ساری باتوں سے انکار نہیں ہے اماں۔'' اماں سانس لینے کو رکی تھیں کہ وہ بول پڑا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ندا واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''پھر میں بات چھیڑوں نا۔'' اماں کی بے صبری پر وہ جز بز ہو کر بولا۔

''نہیں۔''

''کیوں نہیں۔''

''بس ابھی مجھے شادی نہیں کرنی۔''

''ابھی نہیں تو کیا بڈھے ہو کر کرو گے؟'' اماں پہلے بگڑیں پھر ایک دم نرم پڑ کر کہنے لگیں۔

''میں کون سا فوراً شادی کی بات کر رہی ہوں۔ تیاری میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ البتہ بات ابھی پکی کر لیتے ہیں کیونکہ اُس روز تمہاری خالہ بتا رہی تھیں ندا کے لیے دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہارے خالو کہیں ہامی بھر لیں۔''

''تو بھرنے دیں انہیں ہامی۔'' اُس کے اطمینان سے کہنے پر اماں بُری طرح تپ گئیں۔

''وہ کہیں اور ہامی بھر لیں اور تم۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا، یعنی اس ساری دنیا میں ایک ندا ہی ہے اور کوئی لڑکی نہیں ملے گی آپ کو۔''

''لڑکیاں بہت لیکن میں ندا کو بہو بنانا چاہتی ہوں۔'' اماں نے حتمی انداز میں جتایا تو وہ سر جھکا کر بولا۔

''اگر آپ صرف اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہیں تو آپ کی مرضی۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب چاہیں اُسے بہو بنا کر لے آئیں۔''

اماں اُس کی بات پر خاموش ہو گئیں۔ پھر آمنہ کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

''چلو بیٹی! اب سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔'' اور وہ جو اُس وقت سے اُسے نظر انداز کیے بیٹھا تھا، بالکل غیر ارادی طور پر اُسے اماں کی بات پر فوری عمل کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ خاموشی سے اُٹھی اور اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گئی۔ تب وہ بھی اُٹھ کر باہر آ گیا۔ اماں کے حساب سے بہت رات ہو گئی تھی جب کہ ابھی دس بھی نہیں بجے تھے۔

وہ لاؤنج میں آیا اور ہلکی آواز میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ اماں نے ابھی جو موضوع چھیڑا تھا، وہ اُس طرف سے دھیان ہٹانا چاہتا تھا۔ اور اُدھر سے دھیان ہٹا تو اسکرین پر نظر آنے والے مناظر میں اُلجھ گیا۔ غالباً کشمیر میگزین دکھایا جا رہا تھا۔ وہی سب جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور جب بیک گراؤنڈ میں مغنیہ کی فریاد کرتی آواز گونجی ''اے دنیا کے منصفو!'' تو اُس نے اُٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

اور جیسے ہی پلٹا، آمنہ کو کھڑے دیکھ کر ایک پل کو وہ اپنی جگہ سن ہو گیا۔ جانے کب وہ اُس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں۔ فوراً سنبھلتے ہوئے اُس نے سوچا دوبارہ ٹی وی آن کر دے شاید اپنے لوگوں کو دیکھ کر اُس کے سوئے ہوئے اعصاب جاگ جائیں۔ لیکن اپنی سوچ کی نفی کرتا ہوا وہ اُس کے قریب چلا آیا۔

''کیا بات ہے آمنہ! نیند نہیں آ رہی؟''

جواب میں اُس نے اپنی نظریں اُس کی آنکھوں میں اُتار دیں تو وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایسے ہی لمحوں سے وہ خائف رہتا تھا جب اچانک وہ اُس کے لیے آزمائش بن جاتی تھی۔

''جاؤ، تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔'' وہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے بعد کتنی دیر تک وہ اُس کی آہٹیں سنتا رہا تھا۔

اگلے روز آفس سے جلدی نکل کر سیدھا ندا کے ہاسپٹل پہنچ گیا اور اُسے ساتھ لے کر گھر آیا۔ راستے میں وہ پوچھتی رہ گئی کہ ایسی کیا بات ہے لیکن وہ ٹال گیا، البتہ گھر آتے ہی کہنے لگا۔

''میں تمہیں آمنہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں۔ رات میں نے ایک بات نوٹ کی۔''

''کیا......؟''

''رات ٹی وی پر کشمیر میگزین آ رہا تھا، آمنہ بہت غور سے دیکھ رہی تھی لیکن اُس وقت مجھے پتا نہیں چلا اور میں نے فوراً ٹی وی بند کر دیا۔ پھر بعد میں خیال آیا شاید اپنے لوگوں کو دیکھ کر اُس کے اعصاب بیدار ہو جائیں، کیا ایسا ممکن ہے؟''

آخر میں اُس نے سوال اُٹھایا تو ندا ذرا سے کندھے اُچکا کر بولی۔

''ہو سکتا ہے لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے۔''

''کیا......؟''

''ابھی تو تم دیکھ رہے ہو، اُسے کسی بات کا ہوش نہیں لیکن جب سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گی تو

اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر مسلسل ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گی اور ایسی حالت میں اُسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' ندا ڈاکٹری نقطۂ نظر سے بات کر رہی تھی۔ اور وہ سمجھ کر کہنے لگا۔

''چلو دو تین مہینے کی بات ہے، اس کے بعد ہم خود اُسے وہ فلم دکھائیں گے جو میں نے بنائی ہے۔''

ندا نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں خالہ جان سے مل لوں۔''

''بوا سے چائے کا بھی کہہ دینا۔'' وہ سامنے ٹیبل پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ تو ندا اُسے گھورتی ہوئی چلی گئی۔ کتنی دیر انتظار کے بعد وہ اماں کے کمرے میں آیا تو ندا اطمینان سے بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وہ تپ کر بولا۔

''کمال ہے۔ میں وہاں چائے کے انتظار میں تھا اور تم......!''

''سوری، خالہ جان سے باتوں میں میں بھول ہی گئی۔''

اُس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بھولی نہیں تھی اور اماں کا خیال کر کے وہ خاموش ہو رہا۔ پھر وہیں سے بوا کو پکار کر چائے کا کہتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ لباس تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ندا چائے لے کر آ گئی۔

''تم کیوں لائی ہو؟'' اُس نے یونہی کہہ دیا۔

''تمہیں خدا حافظ کہنے آ رہی تھی، چائے بھی لیتی آئی۔''

''کیا مطلب ابھی کیوں جا رہی ہو۔ بیٹھو آرام سے، میں چھوڑ آؤں گا۔''

وہ چائے کا کپ لے کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔ پھر دیر ہو جائے گی۔ چلنا ہے تو ابھی چلو''

''چائے تو پی لوں۔''

''ہاں چائے پی لو۔'' وہ اتنی دیر رُکنے پر آمادہ ہو کر اُس کے ریک کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اُس میں رکھی کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ چائے کا سپ لے کر اُس کی طرف متوجہ ہوا تو چھیڑ کر بولا۔

''سنا ہے آج کل تمہارے ہاں پتھر بہت آ رہے ہیں۔''

''پتھر۔'' وہ چونک کر نا سمجھی کے عالم میں دیکھنے لگی۔ تو وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ہاں پتھر، وہ جس گھر میں بیری ہوتی ہے۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''رات اماں بتا رہی تھیں اور انہیں یقیناً خالہ نے بتایا ہو گا۔ اب تم یہ بتاؤ تمہیں کوئی پتھر پسند

بھی آیا، یا نہیں؟''

''پسند کا سوال جب اُٹھانا جب میں اس سلسلے میں سنجیدہ ہوں۔ فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔''

وہ بڑے آرام سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ تو چائے کا آخری گھونٹ لیتا ہوا وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

پھر رات میں وہ جتنی دیر لاؤنج میں بیٹھا اُس نے محسوس کیا آمنہ وقفے وقفے سے آ کر اُس کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ عجیب سی بے قراری اُس کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اُس کی طرف متوجہ ہوا کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ چند لمحے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے رکھتی پھر پلٹ جاتی۔ وہ سمجھ گیا رات کشمیر میگزین کی ایک جھلک نے اُسے بے چین کر دیا ہے۔ اور اس وقت وہ محض اُس کا ردِعمل دیکھنے کی خاطر اپنے کمرے سے اپنی بنائی ہوئی فلم اُٹھا لایا۔ حالانکہ ندا کی بات اُسے یاد تھی کہ ابھی اس میں آمنہ کے لیے خطرہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اُس نے یہ کہہ کر خود کو بہلایا کہ کچھ نہیں ہوگا اور وہ وی سی آر پر فلم سیٹ کر رہا تھا کہ اماں آ کر آمنہ سے کہنے لگیں۔

''چلو بیٹی! سونا نہیں ہے۔''

''ایک منٹ اماں۔'' وہ روکتا ہوا بولا ''آیئے کچھ دیر یہاں بیٹھیں۔ آمنہ کو بھی اپنے ساتھ بٹھائیں۔''

''کیا بات ہے؟''

اماں سمجھیں وہ اُن سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ آگے آ کر صوفے پر بیٹھ گئیں جب کہ آمنہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ وہ مووی سیٹ کر کے پلٹا تو بس ایک نظر آمنہ پر ڈالی۔ پھر قصداً انجان بن کر بیٹھ گیا۔ تو اماں اُسے دیکھ کر بولیں۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں اماں! میں آپ کو یہ فلم دکھانا چاہ رہا تھا۔''

''لو اب میں فلم دیکھوں گی۔'' اماں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''یہ وہ فلم نہیں ہے۔ دیکھیں تو۔''

اُس نے زور دے کر اماں کو اسکرین کی طرف متوجہ کیا۔ پھر آمنہ کی طرف دیکھنا چاہا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ تب وہ سیدھا ہو بیٹھا کیونکہ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ جس طرح اُس کے آس پاس منڈلا رہی تھی اس سے اُسے یقین تھا کہ وہ ابھی بھی ضرور آئے گی۔ اور واقعی کچھ دیر بعد ہی اُسے

اپنے پیچھے اُس کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اماں کے پاس جا بیٹھی تو کن اکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس کا ذہن بھٹک گیا۔ جب وہ یہ فلم بنانے میں اس قدر مگن تھا کہ عقب سے اُس کی آواز سن کر یوں توازن بگڑا کہ کسی طرح وہ خود کو نہیں سنبھال پایا تھا۔ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا گرا تھا۔ اس کے دھیان کے پردوں میں وہ ایک ایک لمحہ تھرکنے لگا جو اُس نے اُس کے گھر میں گزارا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اُسے وہ اُس کے گھر سے باہر ہونے والے مظاہرے دکھا رہا تھا اور خود اُس کی چار دیواری کے اندر بھٹک رہا تھا۔

یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ اُسے کس مقصد کے لیے یہ فلم دکھا رہا ہے۔ نہ ہی اُسے اماں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو بھارتی فوجیوں کے مظالم دیکھ کر مسلسل انہیں کوس رہی تھیں اور عین اس وقت جب وہ اُس کے گھر سے رُخصت کے لمحات سوچ رہا تھا کہ اچانک اُس کی آواز نے در و دیوار ہلا دیئے۔

''دیکھنا ایک دن خدا کا قہر ٹوٹے گا ان وحشی کتوں پر۔''

وہ اپنی جگہ چونکا۔ اماں اپنی جگہ اُچھل کر اُسے دیکھنے لگیں اور وہ دونوں سے بے نیاز انتہائی طیش کے عالم میں کھڑی ہوئی اور گل دان اُٹھا کر ٹی وی پر مارنا چاہتی تھی کہ اُس نے پھرتی سے اُٹھ کر اُس کی کلائی تھام لی جس سے وہ مزید بھپر کر چیخنے لگی۔

''چھوڑو مجھے۔ میں ان بزدلوں، کمینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''آمنہ......آمنہ، ریلیکس آمنہ۔''

وہ اُسے سنبھالنے کی کوشش میں پریشان ہو گیا اور وہ تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ اُس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی سعی میں اُسے نوچنے کے ساتھ مسلسل چیخ چلا بھی رہی تھی جب کہ اماں ڈر کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ اُس کی چیخیں سن کر بوا بھاگی آئیں تو وہ بھی اماں کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

ان دونوں خواتین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوا ہے اور جانے اُس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اُس سے سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ وہ چھ فٹ کا جوان پریشان ہو گیا تو بالآخر آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر دے مارا اور جیسے اچانک ساری کائنات تھم گئی کہ وہ اُس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ اُس نے بہت احتیاط سے اُسے اُٹھا کر وہیں صوفے پر لٹا دیا پھر خود دوسرے صوفے پر گرتے ہی سر تھام لیا۔ حقیقتاً صورت حال بہت پریشان کن تھی۔ مزید اماں اُس پر بگڑنے لگیں۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ مارا کیوں؟ دیکھو تو بچی بے ہوش ہو گئی ہے۔'' پھر بوا سے کہنے لگیں۔ ''بوا!! ذرا پانی لاؤ تو۔''

''نہیں بوا۔'' وہ ایک دم چیخ پڑا۔ ''خدا کے لیے اماں آپ اسے چھیڑنے کی کوشش نہ کریں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ ایسے ہی اسے پڑا رہنے دوں۔''

''ہاں ابھی اسے ایسے ہی چھوڑ دیں۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہوش آنے پر جانے کیا کر ڈالے۔''

اُس کے سمجھانے پر بات اماں کی سمجھ میں آ گئی اور ایک طرف بیٹھ کر اب وہ اُس کی حالت پر افسوس کرنے لگیں۔ اور اماں کو تو اُس نے سمجھا دیا لیکن خود اندر سے متوحش تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد گھڑی دیکھتا ہوا اُٹھ کر لابی میں آیا اور ندا کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اتفاق ہی تھا کہ دوسری طرف اُس نے ریسیور اُٹھایا اور اُس کی آواز سنتے ہی بولی۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے عمر! خود سکون سے رہتے ہو نہ مجھے رہنے دیتے ہو، آخر اتنی رات کو............''

''بکومت۔ ساڑھے دس بجے اتنی رات نہیں ہوتی۔'' وہ اُس کے ٹائم بتانے پر ہنستے ہوئے بولی۔

''اچھا تو تمہارے پاس گھڑی ہے۔''

''دیکھو ندا! میں سخت پریشان ہوں، کوئی مذاق افورڈ نہیں کر سکتا۔ اگر تم میری مدد کر سکتی ہو تو بتاؤ ورنہ............''

اُس کے سخت لہجے پر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''پریشانی بتاؤ۔'' اور اُس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ سنائی۔ آخر میں پوچھنے لگا۔

''اب بتاؤ، میں کیا کروں؟''

اور ندا کا دل تو چاہا اُسے بے نقط سنائے لیکن آمنہ کی حالت کے پیش نظر وہ ایسی باتوں میں وقت ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ بس چند لمحے سوچنے میں صرف کیے اس کے بعد کہنے لگی۔

''ایسا کرو عمر! آمنہ کو لے کر فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ میں اُسے ڈاکٹر جبین کے کلینک لے جاؤں گی۔ اسی وقت، دیر نہیں کرو۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

ندا نے اپنی بات ختم کرتے ہی فون بند کر دیا جس سے وہ مزید تشویش میں مبتلا ہو کر لاؤنج میں آیا۔ کھڑے کھڑے اماں کو بتایا کہ وہ اُسے ہاسپٹل لے جا رہا ہے اور کچھ دیر بعد وہ گاڑی اسپیڈ سے بھگا رہا تھا۔

راہ داری میں بنچ پر بیٹھا وہ خود کو ملامت کرنے کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر آمنہ کو کچھ ہو گیا تو وہ کبھی خود کو معاف نہیں کرے گا۔ تب ہی ندا آ کر اُس کے پاس چپ چاپ بیٹھ گئی اور کتنی دیر بعد اُسے اُس کی موجودگی کا احساس ہوا تو چونک کر بولا۔

''تم......آمنہ کیسی ہے؟''

''اُسے سکون کا انجکشن لگایا ہے۔ صبح تک ہوش میں آئے گی۔''

اُس نے جتنی بے قراری سے پوچھا تھا، ندا نے اسی قدر سرسری انداز میں بتایا۔ پھر کہنے لگی۔

''تم چاہو تو گھر جا سکتے ہو۔ آمنہ کی فکر نہیں کرو۔ اس کے پاس میں ہوں۔''

''نہیں، میں گھر نہیں جا سکتا۔''

''کیوں......؟''

''اس لیے کہ میں بہت گلٹی فیل (پشیمانی) کر رہا ہوں۔'' اُس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ پھر بے تابی سے پوچھنے لگا ''وہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔''

''ابھی بھی وہ ٹھیک ہے۔ البتہ اُس کی ذہنی حالت کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔''

پھر کچھ رُک کر کہنے لگی۔

''تم دو تین مہینے انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی کیا ضرورت تھی اُسے جھنجوڑنے کی۔''

''تمہیں کیا پتا، وہ کس بے قراری سے میرے اطراف منڈلا رہی تھی۔''

''اچھا خیر اب تم گھر جاؤ۔ خالہ جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی میں مزید کچھ کہتا وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اماں کو فون کر دیتا ہوں۔''

''پھر بھی تم یہاں نہیں رُک سکتے کیونکہ یہاں مردوں کو زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

وہ اُس کی بات سن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا، شاید کسی اور مرد کی تلاش میں۔ جب کوئی نظر نہیں آیا تو اُٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا پھر میں صبح آؤں گا اور سنو تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔''

''نہیں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

وہ فوراً منع کر کے دوسری راہ داری میں مڑ گئی۔ تب وہ خاصا جز بز سا ہو کر باہر آ گیا۔

گھر آیا تو اماں اور بوا اُس کے انتظار میں پریشان بیٹھی تھیں۔ اُس نے اپنی طرف سے انہیں

پورا اطمینان دلایا اور انہیں سونے کی تاکید کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ اس وقت ہر بات بھلا کر فوراً سو جانا چاہتا تھا لیکن یہ آگاہیوں کی رات تھی۔ وہ صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک پل کو بھی نیند نہیں آئی تھی اور صبح وہ خود حیران تھا کہ وہ لڑکی آمنہ جس سے اپنے طور پر وہ مسلسل لاتعلقی ظاہر کرتا رہا تھا وہ اُس کے اتنے قریب تھی کہ اُس کے نہ ہونے کو وہ شدت سے محسوس کرتا رہا تھا۔

صبح جس وقت اماں نماز کے لیے کھڑی ہو رہی تھیں، وہ اُسی وقت گھر سے نکل آیا۔ ابھی اُجالا ہونے میں کچھ دیر تھی لیکن گھر کے سونے پن نے اُسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ جبھی اُس نے اُجالا ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا لیکن اس وقت وہ ندا کے پاس بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اس لیے مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ برائے نام ٹریفک کے باعث فضا خاصی پُرسکون تھی۔ پھر جب ہر طرف زندگی رواں ہونے لگی تب اُس نے گاڑی کلینک کی طرف موڑ دی اور ندا کا سامنا ہونے پر خیال آیا کہ اُس کے لیے کم از کم ناشتا تو لانا چاہیے تھا۔ دل ہی دل میں ندامت کے ساتھ خود کو سرزنش کرتا ہوا اُس سے بولا۔

''سنو، تمہارے لیے ناشتے میں کیا لاؤں؟''

''عجیب آدمی ہو۔ پہلے پوچھنے آئے ہو پھر اب لینے جاؤ گے گھر۔''

اُس نے تعجب سے ٹوکتے ہوئے منع بھی کر دیا۔

''نہیں۔ میں لے آتا ہوں، بس پانچ منٹ میں۔''

''نہیں۔ اب گھر چل کر ہی ناشتا کروں گی۔ تم یہیں رُکو۔ میں آمنہ کو لے کر آتی ہوں۔''

ندا اپنی بات کہہ کر جانے لگی کہ اُس نے بے اختیار پکار لیا۔

''سنو، آمنہ ٹھیک تو ہے نا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی اُس سے زیادہ سوال جواب نہیں کرنا۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں پہچان لے گی۔''

ندا نے اُسے دیکھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا۔ تو وہ چونک کر بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب پھر سمجھاؤں گی۔ ابھی میں اُسے لے آؤں۔''

اور ندا کو مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلکہ وہ خود ہی سمجھ گیا جب آمنہ نے اُسے دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''عمر! تم، کیا مجھے یہاں لے کر آئے ہو۔ یہ کون سی جگہ ہے اور میں...... میں تو وہاں بس میں۔''

غالباً اُن مظالم کے خیال نے اُسے ایک دم خاموش کر دیا جب کہ ضبط کی شدت سے اُس کا چہرہ سرخ اور آنکھوں میں کرب اُتر آیا تھا۔ وہ گھبرا کر ندا کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے اشارے پر نرمی سے بولا۔

''آؤ گھر چلیں۔''

''گھر۔ کون سے گھر؟''

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ جبھی اُلجھ کر پوچھا۔ تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''میرے گھر...... چلو نا، آخر میں بھی تو تمہارا مہمان رہا ہوں۔''

وہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ ایسی ہی اُلجھتی ہوئی نظروں سے ندا کو دیکھا۔ پھر سوچتی ہوئی اُس کے ساتھ چل پڑی۔ راستے بھر خاصی پریشان رہی اور اماں اور بوا جن سے خاصی مانوس ہو گئی تھی، انہیں سرے سے پہچانا ہی نہیں بلکہ اماں کی بے اختیاری پر (جو انہوں نے اُسے دیکھتے ہی بڑھ کر گلے سے لگایا) وہ حیران ہو کر عمر کو دیکھنے لگی۔ اور یہاں وہ بھی نہیں سمجھا۔ تب ندا نے آگے بڑھ کر یوں تعارف کرایا کہ اماں کو بھی محسوس نہ ہو کہ وہ انہیں نہیں پہچان رہی۔

''دیکھا آمنہ! اماں کو تم سے کتنا پیار ہے اور بوا بھی تمہارے لیے اتنی پریشان رہیں۔''

پھر بوا کو مخاطب کر کے پوچھنے لگی ''بوا! ناشتا ملے گا؟''

''کیوں نہیں بیٹا! ابھی لاتی ہوں۔''

بوا فوراً کچن میں چلی آئیں تو ندا اُسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولی۔

''ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ زیادہ ذہن پر بوجھ نہیں ڈالنا، پریشان ہو جاؤ گی۔''

''میں ابھی بھی پریشان ہو رہی ہوں کہ میں یہاں کیسے آئی۔''

وہ خود سے اُلجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تمہیں عمر اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور یہ چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔''

ندا نے بہت رسان سے بتایا اور اُس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔

''چار پانچ ماہ۔'' پھر ایک دم عمر کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

''پلیز، ان باتوں میں مت اُلجھو کہ کب آئی ہو، کیسے آئی ہو، وغیرہ وغیرہ۔ بس اپنا خیال رکھو۔''

آخر میں اُس کے لہجے میں اچانک ہی اپنے کسی جذبے کا رنگ شامل ہو گیا تو ندا نے چونک کر اُسے دیکھا تھا۔ پھر ناشتے کے بعد ندا کے کہنے پر وہ اُسے اُس کے گھر چھوڑ کر واپس آیا تو آمنہ سو رہی تھی۔ غالباً رات کے انجکشن کا اثر ابھی باقی تھا اُس نے موقع غنیمت جان کر اماں کو اُس کی ذہنی

کیفیت کے بارے میں تفصیل سے سمجھا دیا تاکہ اماں اُس کے اجنبی رویے کو محسوس نہ کریں۔ اس کے بعد وہ خود بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ حالانکہ سونے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ آفس جانا تھا لیکن رات جو نیند رُوٹھی تھی، وہ یوں مہربان ہوئی کہ پورا دن وہ سوتا رہا۔

شام میں بھی ندا نے آ کر اُٹھایا بلکہ جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔

''کہا جاتا ہے مردوں سے شرط باندھ کر سونا۔ لیکن میں یہ پوچھوں گی کہ کیا آمنہ سے شرط لگا کر سوئے تھے۔''

ندا نے اُس کی خوابیدہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''مطلب یہ کہ فوراً اُٹھ جاؤ۔ بے چاری خالہ جان صبح سے پریشان پھر رہی ہیں۔ اُدھر آمنہ گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے اِدھر تم اور اُس کا سونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ تم کس خوشی میں۔''

''بس خاموش ہو جاؤ۔'' وہ اُس کے روانی سے بولنے پر ہاتھ اُٹھا کر چیخا۔ پھر بستر چھوڑتے ہوئے بولا۔

''تم چلو میں نہا کر آتا ہوں۔''

''جلدی آنا۔ بوا چائے بنا چکی ہیں۔''

وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور وہ جلدی سے اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

نہا کر نکلا تو خاصا فریش اور انداز میں غیر معمولی شوخی جھلک رہی تھی۔ سیٹی پر خوب صورت دُھن بجاتا ہوا کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تو ندا چائے کے ساتھ منتظر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی بولی۔

''جلدی آؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''اماں کہاں ہیں اور وہ۔''

''وہ کون؟'' ندا سمجھ تو گئی تھی پھر بھی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں آمنہ کا پوچھ رہا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟''

''خالہ جان کے ساتھ نماز پڑھ رہی ہے۔''

''گڈ۔'' اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اس کا مطلب ہے اب وہ بہت بہتر ہے۔''

''ہاں کافی بہتر ہے۔''

ندا نے کہا۔ تبھی اماں اُسے ساتھ لے کر کمرے سے نکلیں تو وہ ایک دم اُس کی طرف متوجہ ہو

گیا۔ بڑے سے دوپٹے میں اپنا آپ چھپائے وہ کسی سوچ میں ڈوبی نظر آئی۔ اُس کے قریب آنے پر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اخلاقی حرکت اُس سے بالکل غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی تھی اور قابلِ قبول اس لیے نہیں تھی کہ گزشتہ چار پانچ ماہ سے تو وہ اُسے کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا اور اب اس اچانک پذیرائی کو ندا اور اماں نے پتا نہیں محسوس کیا، یا نہیں، البتہ وہ خود ہی سٹپٹا گیا اور خجالت چھپانے کو فوراً کرسی اماں کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔

''آیئے اماں بیٹھیں۔''

''تم بیٹھو۔ میں یہاں آمنہ کے ساتھ بیٹھوں گی۔''

اماں اُس کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئیں تو اُس نے دوبارہ اپنی کرسی کھینچ لی۔ بیٹھا تو اماں پوچھنے لگیں۔

''تم آج سارا دن سوتے رہے، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''بس اماں! رات دیر سے سویا تھا۔''

اُس نے اِسی قدر کہہ کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ جب تک وہ اپنے جذبوں سے آگاہ نہیں تھا، ہر بات معمول کے مطابق تھی۔ اب اچانک وہ خود کو بہت پابند محسوس کرنے لگا تھا۔ اماں کی موجودگی کا خیال، پھر سامنے ندا تھی۔

وہ چاہنے کے باوجود آمنہ کو مخاطب نہیں کر سکا۔ تو چائے ختم کرتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور اماں سے ضروری کام کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

رات دس بجے تک اِدھر اُدھر وقت گزار کر جب وہ واپس آیا تو دروازہ آمنہ نے کھولا۔ پہلے مرحلے پر وہ خاموشی سے اُس کے قریب سے نکل آیا لیکن جب اُسے اپنے پیچھے پیچھے کچن تک آتے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

''تم سوئیں نہیں۔''

''نیند نہیں آ رہی۔''

اُس نے سادگی سے کہا۔ پھر اُسے چولہا جلاتے دیکھ کر بولی۔

''کھانا کھاؤ گے؟ لاؤ میں گرم کر دوں۔''

''نہیں، میں کر لوں گا۔ تم جاؤ آرام کرو۔'' وہ اُس کی بات اَن سنی کر کے فریج میں سے سالن نکال لائی اور گرم کرنے لگی۔ تو وہ مزید ٹوکنے کا ارادہ ترک کر کے وہیں اسٹول پر بیٹھ گیا اور جیسے ہی اُس نے سالن پلیٹ میں نکالا، وہ ہاٹ پاٹ میں سے روٹی نکال کر کھانے لگا۔

”چائے بھی پیو گے۔“ وہ پوچھنے لگی۔

”اگر تمہیں پینی ہے تو بنا لو۔ ورنہ رہنے دو۔“

وہ اُس کی بات سن کر چائے بنانے میں لگ گئی۔ پھر ادھر اُس نے کھانا ختم کیا اُس نے چائے کا مگ سامنے رکھ دیا۔ جسے لے کر وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

”چلو لاؤنج میں بیٹھتے ہیں اور ہاں اماں سو گئیں کیا؟“

”ابھی سوئی ہیں۔“ وہ اپنا مگ لے کر اُس کے پیچھے چلی آئی۔ پھر بیٹھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ”کتنا وقت گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔“

”کہاں ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔“

”میں اس وقت کی نہیں گزرے وقت کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے کتنے مہینے ہو گئے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگی۔ ”بہت سہارا دیا تم نے مجھے اور تمہاری اماں نے۔ یہ احسان تو میں کبھی اُتار ہی نہیں سکتی۔“

”ہم نے کوئی احسان نہیں کیا۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھے افسوس ہوگا۔“ اُس نے ٹوکتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ تاخیر سے پوچھنے لگی۔

”سنو وہ لڑکی ندا، وہ تمہاری عزیز ہے؟“

”کزن ہے، میری خالہ کی بیٹی۔ کیوں؟“

”ڈاکٹر ہے؟“ وہ اُس کا ”کیوں“ نظر انداز کر گئی۔

”ہاں۔ ہاؤس جاب کر رہی ہے اور شام میں اُسی کلینک میں ڈاکٹر جبین کے ساتھ بھی بیٹھتی ہے۔“

وہ ندا کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں حسرت دیکھ کر ایک دم خاموش ہوگیا۔ معاً یاد آیا کہ وہ بھی میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی اور غالباً اُسے اپنی تعلیم اُدھوری رہ جانے کا دُکھ ہو رہا تھا اور دُکھ کی بات تو تھی۔ قدرے توقف سے وہ اُس کا دُکھ کم کرنے کی غرض سے کہنے لگا۔

”تم یہاں پڑھ سکتی ہو۔ چند مہینے بعد نیا سال شروع ہوگا تو تم فورتھ ایئر میں ایڈمیشن لے لینا۔ ایک سال گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا پھر تم ندا کی طرح۔“

اُس کی بات ابھی جاری تھی کہ وہ اُٹھ کر چلی گئی جس پر وہ پہلے حیران ہوا پھر سوچنے لگا کہ اُس نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے جو وہ چلی گئی۔ لیکن وہ اُس کا اُٹھ کر جانا سمجھ نہ سکا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ندا غالباً مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ پا رہی تھی۔ پھر بھی ہر دوسرے دن صبح ہاسپٹل جاتے ہوئے وہ کھڑے کھڑے آمنہ کو ضرور دیکھ جاتی تھی۔ اس کے باوجود اُس نے محسوس کیا آمنہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کی سفید رنگت پر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ کچھ اُکتائی ہوئی اور بیزار بھی لگتی تھی۔ وہ اماں سے کہتا اُس کا خیال رکھیں اور اماں خود پریشان تھیں کہ اُن کی بہت منت سماجت کے بعد وہ کھانا بھی بس زہر مار کرتی۔

ندا، دوا کے ساتھ خصوصاً اُسے پھل کھلانے کی تاکید کر کے جاتی تھی لیکن وہ نہ تو دوا لیتی نہ کسی پھل کو ہاتھ لگاتی۔ جانے وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ اُس روز اماں نے اُسے ساری صورت حال کہہ سنائی تو وہ اس پر بگڑنے لگا۔

”کیوں خود سے غفلت برت رہی ہو۔ تم اپنا نہیں تو..........“

وہ کہنے جا رہا تھا کہ بچے کا خیال کرو۔ لیکن جس تیزی سے اُس کے چہرے نے رنگ بدلا، الفاظ اُس کے حلق میں ہی اٹک گئے۔ پھر قدرے توقف سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

”تمہیں اماں کا خیال کرنا چاہیے وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ تمہاری کمزوری انہیں پریشان کر رہی ہے۔“

”میں کیا کروں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

وہ بے اختیار رو دی جس سے وہ نرم پڑ کر اُس کے قریب چلا آیا۔ دھیرے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھایا۔ پھر ایسی ہی نرمی سے بولا۔

”پلیز روؤ مت۔ مجھے تمہارے رونے سے بہت دُکھ ہو رہا ہے۔“

”میں تم سب کو دُکھ نہیں دینا چاہتی۔“ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

”فضا اچانک بہت بوجھل ہوگئی تھی کہ وہ مسلسل آنکھیں رگڑ رہی تھی لیکن آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔

تبھی ندا آ گئی تو وہ اشارے سے اُسے چپ کرانے کا کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج میں اماں کے ساتھ کسی خاتون کو بیٹھے دیکھ کر وہ وہیں سے کچن میں آ گیا۔ بوا کو چائے کا کہا اور گلاس میں پانی لے کر دوبارہ کمرے کی طرف آیا تو اندر سے آتی اُس کی آواز نے دروازے ہی پر اُس کے قدم روک دیئے۔ وہ اسی طرح روتی ہوئی ندا سے کہہ رہی تھی۔

”کاش! میں اپنے پیٹ میں چھرا گھونپ سکتی۔ جانتی ہو، میرے اندر پرورش پانے والا کون ہے۔“

ندا کی خاموشی اُس نے محسوس کی کیونکہ وہ خود اچانک خاموشیوں کی زد میں آ گیا تھا اور اُس کی سسکتی ہوئی آواز دل چیرنے لگی۔

''گھن آتی ہے مجھے اپنے وجود سے اور جب تک میں اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتی، مجھے چین نہیں آئے گا۔ تم......تم......ڈاکٹر ہو، اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالو ورنہ میں مار ڈالوں گی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہی بھارتی کتوں کے آگے جا ڈالوں گی۔''

''میرے خدا۔'' وہ اس تصور سے ہی کانپ گیا جب کہ اُس کے سامنے بیٹھی ندا جھرجھری لے کر بولی۔

''خدا کے لیے آمنہ! بس کرو۔ خاموش ہو جاؤ۔''

اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔ کچھ دیر ندا نے اُس کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔ پھر عاجزی سے بولی۔

''پلیز آمنہ! اس طرح خود کو ہلکان مت کرو۔ تمہاری حالت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا ہے مجھے، زندہ ہوں۔''

''اور ابھی تمہیں زندہ رہنا ہے۔'' ندا زور دے کر بولی۔ ''ماضی میں نہیں حال میں اور مستقبل سے اچھی اُمیدیں وابستہ رکھو۔ کون جانے آنے والے کل میں تمہارے لیے کتنی خوشیاں ہوں۔''

''میں خود کو فریب نہیں دے سکتی ڈاکٹر ندا، کیونکہ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا حال اور مستقبل دونوں میرے ماضی سے جڑے ہیں۔''

وہ اچانک بہت تلخ ہو کر بولنے لگی۔

''اور ماضی سے نظریں چرانا بھی میرے نزدیک گناہ ہے کہ ظلمت کے اندھیروں میں ڈوبا ماضی ہی ہمیں ہمارے ارادوں میں اٹل کرتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔''

ندا کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے، یا شاید اُس کی تیز نظروں نے گڑبڑا دیا تھا۔ قدرے رُک کر بات ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

''بہرحال تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ خالہ جان بتا رہی تھیں کہ تم میڈیسن بھی نہیں لے رہیں اور نہ ٹھیک سے کھانا کھاتی ہو۔''

''فکر مت کرو، بہت سخت جان ہوں میں۔'' وہ خود پر ہنسی۔ تبھی وہ اندر چلا آیا اور یوں جیسے کچھ سنا ہی نہیں، بس اُس کی آخری بات اور اس پر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''کون سخت جان ہے؟''

''میں۔'' اُس سے پہلے ندا بول پڑی۔ ''ابھی میں آمنہ کو وہ ایکسیڈنٹ والا واقعہ سنا رہی تھی جس میں مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔''

''اچھا وہ۔ لیکن اس سے تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم سخت جان ہو۔''

پھر آمنہ کو اُٹھتے دیکھ کر فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کہاں جا رہی ہو آمنہ! بیٹھو نا، لو پانی پیو۔''

''نہیں بس۔'' وہ کمرے سے نکل گئی تو کچھ دیر اُس کے پیچھے نظریں جمائے رکھنے کے بعد وہ ندا کو دیکھتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا خیال ہے تمہارا، جتنی خوفناک باتیں وہ کر رہی تھی ان پر عمل بھی کر سکتی ہے۔''

''اُس سے بھی بعید نہیں۔''

گہری سانس کے ساتھ کہتے ہوئے ندا نے اپنا سر کرسی کی بیک سے ٹکا لیا اور سامنے دیوار پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''بہت زہر بھرا ہے اس کے اندر۔ اسی لیے میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ابھی اسے مت چھیڑو۔ بہرحال اب تمہیں اس کا بہت خیال رکھنا ہے ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''مثلاً'' اُس کے ہونٹوں نے اس لفظ کو چھوا تھا کہ ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔

''مثلاً، یہ کہ تمہارے سینے میں خنجر اُتار کر میں تمہیں وہیں دفن کر دوں گی۔''

اُس نے کہا تھا تبھی اُس نے دل ہی دل میں اُس کے حوصلے کو سراہا تھا اور ابھی ندا نے جانے کیا کہا، اپنے خیال میں وہ سن نہیں سکا اور نہ ہی جاننے کی کوشش کی کیونکہ اپنے سوال کا جواب اُسے مل گیا تھا۔ وہ کشمیر کی بیٹی اپنے ارادوں کو اٹل رکھنے کی خاطر ماضی کی دوڑ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی، اس کے لیے اپنے پیٹ میں خنجر گھونپنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

وہ جتنی دیر آفس میں ہوتا اُس کا دھیان آمنہ کی طرف رہتا۔ دن میں دو تین بار گھر فون کر کے اماں سے باتوں باتوں میں اُس کے بارے میں پوچھتا کہ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود بھی جب تک گھر آ کر اُسے دیکھ نہ لیتا اُسے اطمینان نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ مسلسل اس اندیشے میں گھرا ہوا تھا کہ کہیں وہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔

اور ندا بھی محض اُس کا دھیان بٹانے کی خاطر ہر شام اُس کے پاس آنے لگی تھی اور زیادہ اُس کی

توجہ اس کی طرف دلاتی کہ میڈیکل میں اُس کا ایک سال باقی ہے، بہتر ہے وہ مکمل کر لے۔ اس کے بعد زندگی اُس کے لیے آسان ہو جائے گی۔

اور وہ ساری باتیں بس خاموشی سے سن لیتی تھی۔ نہ انکار کرتی نہ اقرار۔ جس سے اس رات وہ پھر اُس سے اُلجھ گیا۔

''یوں لگتا ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں، آخر تم بولتی کیوں نہیں۔ کچھ تو کہو۔''

''مجھے ابھی خاموش ہی رہنے دو عمر! کچھ کہوں گی تو تم ناراض ہو گے۔''

سادگی کے ساتھ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا جسے اپنے جوش میں اُس نے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ فوراً بولا۔

''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کہو وہ جو تمہارے دل میں ہے۔''

''دل میں تو جانے کیا کچھ ہے۔''

ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے وہ کھوسی گئی۔ اور ایک بار پہلے بھی اُس نے اُسے ایسے ہی عالم میں دیکھا تھا اُس وقت اُس کی آنکھوں کے پیالے چھلک رہے تھے اور اب آنکھوں میں جانے کس خیال کی پرچھائیں تھی۔ وہ دھیرے سے بولا۔

''سب کہہ ڈالو۔''

''تم ناراض..........''

''نہیں ہوں گا۔ وعدہ لے لو۔'' وہ فوراً بولا۔ تو وہ اپنے خیال سے چونک کر دیکھنے لگی۔

''وعدہ۔''

''ہاں وعدہ کر رہا ہوں، ناراض نہیں ہوں گا۔'' وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی پھر اُس پر سے نظریں ہٹا کر بولی۔

''میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ تم بس مجھے سرحد پر چھوڑ آؤ۔''

''آ......'' اُس کے ہونٹ نیم وا ہو کر رہ گئے۔ یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی واپسی کی بات بھی کرے گی جب ہی آرام سے وعدہ کر گیا اور اب اپنے ہی وعدے کی دیوار راہ میں حائل تھی۔ قدرے توقف سے وہ کہنے لگی۔

''یہاں تمہارے گھر میں مجھے بہت آرام ملا، بلکہ اپنی اب تک کی زندگی میں میں کبھی اتنے آرام سے نہیں رہی۔ اور عمر! اس سے پہلے کہ یہ آرام مجھے میرے مقاصد سے غافل کر دے، مجھے جانے دو۔''

وہ خاموش ہوئی تو ہر سو سناٹا چھا گیا۔ لمحے بھی بنا آہٹ کے گزرنے لگے تھے۔ کتنی دیر بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

''میں جانتی ہوں، اماں میرے جانے کا سن کر پریشان ہو جائیں گی کیونکہ وہ مجھ سے بہت پیار کرنے لگی ہیں اور تم..........''

وہ قدرے جھجکی۔ پھر اعتماد سے بولی۔

''تمہاری محبت بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حیران مت ہو۔ صحرا کے پیاسے کو ایک قطرہ بھی دُور سے نظر آتا ہے۔''

''اور وہ اس قطرے کی طرف لپکتا ہے، منہ موڑ کر نہیں چل دیتا۔'' وہ ایک دم بول پڑا۔

''تمہاری بات اس پر صادق آتی ہے جو اپنی زندگی صرف اپنے لیے جیتا ہے جب کہ میں تو بہت پہلے اپنی زندگی وقف کر چکی ہوں۔''

''لیکن آمنہ۔''

''پلیز عمر۔'' اُس نے عاجزی سے ٹوک دیا۔ ''میں تمہیں دُکھ نہیں دینا چاہتی، اس لیے اس بات کو یہیں ختم کر دو کیونکہ یہ طے ہے کہ مجھے واپس جانا ہے۔ میرے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور اب تو میں اور نڈر ہو کر کام کروں گی کہ کچھ کھونے کا اندیشہ نہیں رہا۔ ماں، باپ، بھائی اور اپنا آپ، سب کچھ تو کھو چکی ہوں اور اتنا کچھ کھو کر اگر کچھ پانے کی آرزو ہے تو صرف کشمیر کی آزادی اور بس۔''

''بس۔'' اُس کے سینے میں دبی گہری سانس خارج ہوئی پھر اُسے دیکھ کر بولا۔ ''میں تمہیں روک نہیں سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی جانے کی بات مت کرو۔''

''کیوں؟'' اُس نے بے دھیانی میں پوچھا لیکن پھر فوراً سمجھ گئی کہ اُس کا اشارہ بچے کی طرف ہے اور سمجھتے ہی اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔ تو اپنی بے اختیاری کے بعد اب بے بسی کو وہ شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

پھر جیسے جیسے اُس کی ڈیلیوری کے دن قریب آ رہے تھے، وہ اُسے خود سے دُور ہوتی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اُسی روز سے وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جہاں اُس کے جانے کا خیال آتا وہ اندر سے ٹوٹنے لگتا۔

ان دنوں وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھا۔ نہ آفس میں کوئی کام ڈھنگ سے کر پاتا نہ گھر میں اماں کی باتیں سمجھ میں آتیں۔ ندا الگ اُس کی غائب دماغی پر جھنجھلاتی اور اس وقت تو وہ اُس کے سر

پر کھڑی چیخ رہی تھی۔

''سنا نہیں تم نے۔ گاڑی نکالو، آمنہ کو ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔''

''آمنہ...... ہاسپٹل۔''

وہ جب سمجھا تو فوراً باہر بھاگا۔ جب تک گاڑی نکالی ندا اور ساتھ میں اماں بھی آمنہ کو لے کر آ گئیں اور اُن کے بیٹھتے ہی وہ اسپیڈ سے گاڑی بھگا کر منٹوں میں ڈاکٹر جبیں کے کلینک پہنچ گیا۔ اماں اور ندا آمنہ کو سہارا دے کر اندر لے گئیں تو وہ اچانک اس ماحول سے متنفر ہو کر پھر گاڑی اسپیڈ سے دوڑانے لگا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہاں جا رہا ہے۔

کوئی گھنٹے بھر بعد گاڑی روکی تو خود کو کلینک کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر آمنہ کا خیال آیا تو اندر چلا آیا۔

اماں راہ داری میں بنچ پر بیٹھی مل گئیں۔ وہ چپ چاپ اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ ندا بوجھل قدموں سے اماں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اماں کے ساتھ اُس نے بھی چونک کر دیکھا لیکن وہ اماں سے بولی۔

''خالہ جان! آپ آمنہ کے پاس چلی جائیں۔'' اماں فوراً اُٹھ کر چلی گئیں تو وہ اُن کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے دُکھ سے بولی۔

''بیٹا تھا۔''

''تھا؟'' اُس نے چونک کر ندا کو دیکھا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

اماں اور ندا کے لیے یہ اچانک انکشاف تھا کہ آمنہ واپس جا رہی ہے۔ ندا کو یقین نہیں آیا جب کہ اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ اور وہ بڑے آرام سے انکشاف کر کے باہر نکل گیا تھا۔ کتنی دیر بعد واپس آیا تو اماں اور ندا اُسے گھیرے بیٹھی تھیں اور وہ جانے روئی تھی، یا آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں آنکھیں سرخ کیے بیٹھی تھی۔ وہ دُور ہی سے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد ندا اُس کے پیچھے آ گئی اور شاکی لہجے میں بولی۔

''سنو، تم آمنہ کو روکتے کیوں نہیں؟''

''میں۔ میں کیسے روکوں؟''

اپنے تئیں اُس نے لاتعلقی کا مظاہرہ کیا لیکن ندا نے ایک دم اُس کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اپنی محبت کا واسطہ دے کر۔'' وہ ایک پل کو سناٹے میں آیا۔ پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

''تمہیں کس نے کہا کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔''

جواب میں ندا نے کندھے اُچکائے گویا فی الحال اس موضوع کو ٹالا۔ پھر پوچھنے لگی۔

''تم چھوڑنے جاؤ گے؟''

''ظاہر ہے۔''

''کہاں سری نگر؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے اُس کے گھر تک جاؤں، یا شاید اس سے پہلے لوٹ آؤں۔''

اُس کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی اور اسی خاموشی سے جانے لگی کہ وہ پکار کر بولا۔

''سنو۔ تم اماں کے پاس رُک جانا۔'' وہ ذرا سا سر ہلا کر بولا۔ تو وہ چلی گئی۔

پھر لاکھ ضبط کے باوجود آمنہ وقت رُخصت اماں کے ساتھ مل کر رو رہی تھی۔ وہ اس منظر سے نظریں چرا کر باہر نکل آیا۔ کتنی دیر بعد وہ ندا کے ساتھ باہر نکلی تو دروازے پر رُک کر اُس سے باتیں کرنے لگی۔ بالآخر اُسے ٹوکنا پڑا تھا۔

دورانِ سفر وہ یوں خاموش تھا جیسے اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔ اس کے برعکس وہ مسلسل بولتی رہی تھی۔ اپنے گھر، ماں باپ، بھائیوں کی باتیں، حماد کا ذکر جو آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ پھر اُس کی اماں، اُن کی محبت اور شفقت اور جس طرح انہوں نے اُس کا خیال رکھا تھا۔ وہ بہت ممنونیت سے دہراتی رہی۔

''میں کبھی نہیں بھولوں گی جب کشمیر آزاد ہو جائے گا تب تم اماں کو لے کر میرے گھر ضرور آنا۔ اُس وقت میں تمہاری بہت خاطر مدارت کروں گی اور ہاں ندا کو بھی ضرور لانا، میں اُسے اپنے ہاتھ سے کڑھا ہوا کرتا دوں گی۔ اُس پر بہت سجے گا۔''

کیسا خوش آئند تصور تھا جس نے اُس کی آنکھوں میں ستارے بھر دیئے تھے۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھے گیا۔ تب وہ اپنے پیچھے نظر ڈال کر بولی۔

''بس عمر! یہاں سے تم واپس لوٹ جاؤ۔''

''کیا مطلب! تم اکیلی اتنی دُور کیسے جاؤ گی۔'' وہ ایک دم چونک کر بولا۔

''مجھے زیادہ دُور نہیں جانا۔ اس پہاڑی سے اُتر کر کچھ آگے مجاہدین کا ڈیرا ہے۔ حماد بھی یہیں ہوتا ہے اور اب میں بھی یہیں رہوں گی۔''

پتا نہیں وہ اندر سے بھی اتنی پُرسکون تھی، جتنے آرام سے بات کر رہی تھی۔ وہ بہرحال اُس کے اطمینان پر حیران تھا، پھر اُس کے پیچھے دُور تک نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ راستے میرے دیکھے ہوئے ہیں بس اب تم جاؤ۔''

''نہیں، جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ تم اپنے صحیح مقام پر پہنچ چکی ہو تب تک میں نہیں جاؤں گا۔'' وہ باقاعدہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ادھر دیکھو جہاں وہ پگ ڈنڈی ختم ہوتی ہے اُس کے دائیں طرف پہاڑ کے دامن میں مجھے جانا ہے۔ جب میں پگ ڈنڈی پار کر جاؤں تو سمجھ لینا میں اپنے مقام پر پہنچ چکی ہوں۔''

اُس نے بہت جلدی میں بتایا۔ پھر خدا حافظ کہنے کے لیے اُس کی طرف مڑی۔ تو کچھ رُک گئی۔ بس ایک پل اور اس ایک پل میں جانے کس خیال نے اُس کی آنکھیں نم کر دیں۔ پھر بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''عمر! تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو نا۔''

اور وہ بولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ تب اُس کے ہاتھ کی پشت آنکھوں سے لگا کر وہ تیزی سے مڑ گئی۔ وہ چپ چاپ اُسے ڈھلوان اُترتے دیکھ رہا تھا پھر دُور پگ ڈنڈی تک نظریں اُس کے ساتھ ساتھ گئیں۔

دائیں جانب مڑنے سے پہلے اُس نے آخری بار ہاتھ ہلایا تھا اور وہ نظروں سے اُوجھل ہوئی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر دھندلا گیا۔

واپسی کا سفر بہت مشکل تھا لیکن اُسے معلوم تھا کہ ندا اُس کی منتظر ہے۔ اور وہ بہت تھکا ہوا بھی ہے۔

چراغِ دل روشن ہے

''یہ آپ کا اپنا کمرہ۔'' ازہر شیرازی نے اُس کے نازک اور مہکتے وجود کو سہارا دے کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا تو اُس کی پلکیں ذرا سی اُوپر اُٹھی تھیں۔

''یوں تو سارا گھر ہی آپ کا ہے۔ یہاں کی ہر چیز مجھ سمیت اور..........'' وہ جانے اُس کی ملکیت میں اور کیا کچھ دینے جا رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی سے اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ایکسکیوزمی!'' وہ موبائل کان سے لگا کر اُس کی طرف سے پیٹھ موڑ گیا تو وہ اپنے ہاتھوں کی پشت پر مہندی کے نقش و نگار دیکھنے لگی۔ کلائی سے آگے تک ٹیڑھی میڑھی لکیریں جیسے بھول بھلیاں اور ابھی اُس کی نظریں ان بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھیں کہ وہ بہت عجلت میں موبائل بیڈ پر پھینک کر بولا۔

''شامہ! میں ابھی آتا ہوں۔ آپ اگر چاہیں تو چینج کر لیں بلکہ نہیں، میں بس ابھی آ رہا ہوں۔''

پھر دھیرے سے اُس کا ہاتھ دبا کر کمرے سے نکل گیا تو اس پہلی جسارت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے بیک سے ٹیک لگا لی۔ اُس کی نظروں کے سامنے دیوار گیر ریک میں ٹی وی، وی سی آر اور ڈش ریسیور بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ قیمتی ڈیکوریشن پیسز جنہیں وہ بہت اشتیاق سے دیکھ رہی تھی کہ موبائل کی بزر نے اُس کی توجہ کھینچ لی۔ لیکن اُس نے فوراً اُسے نہیں اُٹھایا بلکہ انتظار کرنے لگی کہ آواز سن کر وہ خود آئے گا۔ اور وہ نہیں آیا تو مجبوراً اُس نے اُٹھا لیا اور دوسری طرف جیسے کوئی بہت عجلت میں تھا، یا شاید اُسے یقین تھا کہ ریسیو کرنے والا ازہر شیرازی ہی ہو گا جب ہی فوراً بولنا شروع ہو گیا۔ تو وہ پہلے چونکی پھر ٹھٹکی اور پھر اپنے کانپتے ہونٹوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر اپنے حلق تک آئی ہر آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسی پل ازہر شیرازی بڑے موڈ میں اندر داخل ہوا۔ لیکن جب اُس کے ہاتھ میں موبائل دیکھا تو ساری مصلحتیں چھوڑ کر چیل کی طرح اُس کے ہاتھ سے موبائل

جھپٹ کر کان سے لگا لیا تو وہ جو گم صم سی ہو گئی تھی۔ بے حد سہم کر اُسے دیکھنے لگی جس کے پاس اب چھپانے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ پھر بھی اُس کی طرف سے رُخ موڑ کر بہت احتیاط سے گفتگو کر رہا تھا۔ پھر موبائل بند کر کے اُس کی طرف پلٹا تو اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے نکلتے شراروں سے اُسے اپنا وجود راکھ ہوتا لگا۔ بمشکل تھوک نگل کر اُس کے حلق سے ذرا سی آواز نکلی تھی۔

''مم۔ میں۔''

''ہاں تم۔'' وہ ایک ہی جست میں اُس کے پاس آ بیٹھا اور اتنی سختی سے اُس کے کندھوں کو تھاما کہ اُنگلیوں کی چبھن نے اُس کی آنکھیں نم کر دیں۔ لیکن اس پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

''ہاں تم۔ بتاؤ۔ کیا سنا ہے تم نے۔ بتاؤ؟'' اُس نے انتہائی بے بسی سے زور سے نفی میں سر ہلایا تو وہ اپنی گرفت مزید سخت کرتا ہوا بولا۔

''کچھ نہیں سنا تم نے۔ کچھ نہیں سنا۔ سمجھیں تم، کیا کہا میں نے؟''

''کچھ نہیں سنا۔'' اُس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ہاں تم بہری ہو اور گونگی بھی۔'' وہ اُس کے کندھے چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا تو اُس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ پانیوں سے لبریز آنکھیں چھلکنے کو تھیں لیکن وہ اچانک اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرنے سے ڈر رہی تھی۔

''جاؤ چینج کر لو۔'' ازہر شیرازی نے قیمتی سگار سلگانے کے بعد کہا۔ تو وہ سکت نہ ہونے کے باوجود بھی یوں کھڑی ہوئی جیسے اُس کا حکم نہ مان کر کسی سخت سزا کی مستحق ٹھہرے گی۔

''میرے خدا!'' ڈریسنگ روم کا دروازہ بند کرتے ہی اُس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔ اُس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ اُس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا اور اس وقت اُس سے زیادہ، یا اُس کے علاوہ سوچنا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔ روتے ہوئے بھی یہ خوف تھا کہ وہ پکار نہ لے، اس لیے بہت جلدی اُس نے اپنے آنسو صاف کر لیے اور اپنے کانوں، گلے اور ہاتھوں میں سے زیور نوچ نوچ کر نیچے کارپٹ پر پھینکنے لگی۔ پھر لباس تبدیل کر کے بہت احتیاط سے دروازہ کھولا تو کمرے میں ٹیوب لائٹ کے بجائے مدھم نیلگوں روشنی میں وہ بیڈ پر دراز نظر آیا۔ اُس کی بند آنکھوں کے اندر جانے کون سا محاذ تھا جس پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ کر مسکرا رہا تھا۔ اگر کچھ دیر پہلے وہ اُس کا گھناؤنا روپ نہ دیکھ چکی ہوتی تو دھیرے سے جا کر اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ لیکن کیا ستم تھا کہ قربتوں کی آشنائی سے پہلے ہی وہ نہ صرف اُس سے متنفر ہو چکی تھی بلکہ دل یہ چاہ رہا تھا کہ اُس سے دُور چلی جائے۔ اور اسی ارادے سے اُس نے

کمرے کے بند دروازے کو دیکھا پھر دبے پاؤں اُس کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ازہر شیرازی نے لیٹے لیٹے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور بہت محبت سے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

''اب اور کتنا انتظار کراؤ گی؟''

''ازہر پلیز۔'' وہ بہت عاجزی سے بولی۔ ''مجھے چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں......''

''ہاں ہاں کہو۔'' وہ اُس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے یوں بولا جیسے وہ خوب صورت جذبوں کا اظہار کرنے جا رہی ہو۔

''نہیں، آپ وعدہ کریں۔'' وہ اُس کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

''آج کی شب کوئی وعدہ نہیں ہو گا، تمہاری طرف سے نہ میری طرف سے۔ یہ زنجیریں پہننے کے لیے عمر پڑی ہے لیکن یہ شب پھر نہیں آئے گی۔ اسے آنسوؤں میں مت گنواؤ۔'' وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ اُس کے لہجے میں محبتوں کی شدتیں تھیں جو اُس کے آنسوؤں پر بند باندھنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔

اُس نے بہت احتیاط سے خود کو ازہر شیرازی کے شکنجے سے نکالا تھا۔ پھر ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ آسمان پر سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ فوراً پردہ چھوڑ کر واش روم میں بند ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شاور لے کر نکلی تب بھی وہ اسی طرح بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔

کل تک وہ کتنی خوش تھی کہ زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ اُس پر مہربان ہو رہی تھی۔ تمام عزیز رشتہ دار اُس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور وہ خود بھی نازاں تھی۔ اماں آخر وقت تک اُس کی نذر اُتارتی رہی تھیں پھر بھی جانے کس کی نظر لگ گئی تھی کہ اس خوب صورت طلسم کدے میں آتے ہی سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔

''کیوں؟'' اُس نے دُکھ سے سوچا۔ ''میری خوشیوں کی عمر اتنی تھوڑی کیوں تھی۔ کچھ دن بے خبری میں بھی تو گزر سکتے تھے۔ کیا ضروری تھا کہ اولین لمحوں میں ہی..........''

''شام!'' ازہر شیرازی نے اُسے پکارا تو اُس نے اپنی پیشانی چھو کر سر کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ پھر اُسے دیکھا تو وہ فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس چلا آیا۔

''کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔'' وہ حیرت زدہ تھی کہ وہ ظاہر ہو کر بھی شرمندہ نہیں تھا اور نہ خائف۔

''بیٹھ جاؤ۔ میں شاور لے لوں پھر ناشتا کریں گے۔ او کے۔'' وہ اُس کے گیلے بالوں کو ہلکا سا

جھٹکا دے کر واش روم میں چلا گیا تو وہ بیٹھنے کے بجائے ڈریسنگ روم میں آ کر اپنے بال سلجھانے کے ساتھ سوچنے لگی کہ ازہر شیرازی کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اُسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ محبت یا جنگ۔ اور پہلا ہتھیار محبت ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے چہرے پر چھائی مردنی دُور کر کے اُس کے ساتھ دلی وابستگی کا اظہار کرے جو کہ اس وقت بہت مشکل تھا کیونکہ وہ اندر سے ابھی بھی بہت خوفزدہ تھی۔ پھر بھی کسی حد تک ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو کر ڈریسنگ روم سے نکلی تو وہ پہلے سے کمرے میں موجود تھا۔ اور بہت لاپروائی سے اپنے گھنے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا ہوا پوچھنے لگا۔

''ڈائننگ میں چلو گی، یا یہیں ناشتا منگوا لوں؟''

''جیسے آپ چاہیں لیکن اس سے پہلے میں اپنی رُونمائی لوں گی جو رات آپ دینا بھول گئے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے ایک وعدہ۔''

وہ اپنی کلائی میں پڑی سرخ سبز کانچ کی چوڑیوں پر نظریں جما کر بولی۔ تو وہ جو اُس کی پہلی بات پر خوش ہوا تھا، وعدے کا سن کر اُس کی پیشانی پر ناگواری کی لکیر کھینچ گئی۔

''میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا شامہ! اب نہ آئندہ کبھی۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ رات تم نے جو کچھ سنا، اُسے بھول جاؤ۔''

''میں واقعی بھول جاؤں گی لیکن............''

''نو لیکن۔'' وہ ٹوک کر ریک کی طرف بڑھ گیا اور اُس کی دراز میں سے مخملیں ڈبہ نکال کر کھولتے ہوئے اُس کے قریب آ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے کر کے بولا۔ ''آئی ایم سوری۔ یہ مجھے رات ہی تمہاری نذر کرنے چاہیے تھے۔ لاؤ اب پہنا دوں۔''

''نہیں!'' اُس نے بے اختیار اپنے دونوں بازو پیچھے کر لیے۔ ''میری کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں ہیں۔ ان پر یہ کنگن سجا کر میں اپنے سہاگ کی سلامتی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ پلیز انہیں دُور کریں مجھ سے۔''

''تم بہت زیادہ پریکٹیکل ہو رہی ہو اور یہ تمہارے اپنے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ یہ میں تمہیں پہلی اور آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ تم زندگی اور اس کی ساری خوب صورتیوں کو اس طرح دیکھو اور محسوس کرو جیسے تم چاہتی ہو۔ میری ذات میں زیادہ مت اُلجھو۔ مجھے صرف اپنے حوالے سے دیکھو اور وہاں گرفت کرو، جہاں میری محبت میں ذرا سی بھی کمی پاؤ۔ میں تمہیں اپنی ہر شے دان کرتا ہوں اپنے آپ سمیت۔ بس میری ذات کا ایک پہلو مخفی رہنے دو۔ اس کے بارے میں کبھی سوچو نہ بات کرو۔''

وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اسی سمت گردن موڑ کر بولا۔

''لیس!''

''سر! بیگم صاحبہ کے گھر سے کچھ لوگ آئے ہیں۔'' ملازم نے دروازہ کھول کر کہا۔

''کون؟'' وہ بے اختیار ہو کر بھاگنے لگی تھی کہ بالکل غیر محسوس طریقے سے وہ اُس کے سامنے آ کر راستہ روک گیا اور ملازم سے مخاطب ہوا۔

''اُن سے کہو۔ بیگم صاحبہ آرام کر رہی ہیں۔ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔'' پھر اُسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''اوں ہوں۔'' اُس نے نرمی سے اُس کی کلائیاں تھام کر ہاتھ نیچے کیے تو اُس کی بھیگی آنکھوں میں دُکھ اور تاسف سمٹ آیا تھا۔

''ہر شے مجھے دان کر کے آپ گھاٹے میں نہیں رہے کہ سارے اختیار تو آپ کے پاس ہیں۔''

''صرف اُس وقت تک جب تک میں اپنے لیے تمہاری ایسی ہی بے اختیاری نہ دیکھ لوں جیسی ابھی تمہارے اپنوں کے آنے پر ظاہر ہوئی تھی۔'' وہ اُس کی بات پر اپنا ردِّعمل چھپانے کی خاطر سر جھکا کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر سنبھل کر اُسے دیکھا اور ہٹ کر ہاتھ رکھتی ہوئی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''کیا یہ بھی طے ہے کہ اُس وقت تک مجھے بھوکا پیاسا رہنا پڑے گا۔''

''اد نو کم آن۔'' اچانک فضا بدل گئی تھی۔ وہ اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈائننگ میں لے آیا اور اُس کی بھوک تو اُسی وقت مر گئی تھی جب اُس کے گھر والوں کو اُس نے یونہی لوٹا دیا تھا۔ مزید ٹیبل پر اتنے لوازمات دیکھ کر دل بھی اچاٹ ہو گیا۔ لیکن وہ پھر اُس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے دل نہ چاہتے ہوئے بھی ناشتے میں اُس کا ساتھ دینے لگی۔ البتہ ذہن کو مکمل طور پر حاضر نہیں رکھ پا رہی تھی۔

''پتا ہے شام! تمہیں دیکھتے ہی مجھے لگا تھا جیسے میں ہمیشہ سے تمہاری تلاش میں ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اُس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا تھا وہ بھی بھول گیا اور میں تمہارا تعاقب کرنے لگا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر تم بھیڑ میں کہیں کھو گئیں تو پھر شاید میری بقیہ ساری زندگی تمہیں ڈھونڈنے میں گزر جائے گی۔''

وہ بند مٹھی ٹھوڑی پر جما کر غالباً انہیں لمحوں میں کھو گیا تھا۔

وہ بے حد خاموش نظروں سے اُسے دیکھتی ہوئی اندر ہی اندر کڑھنے لگی کہ یہ محبتیں اس کے حصے

میں اس طرح کیوں آئیں کہ اس کا دل بجائے سرشار ہونے کے ڈوبتا جارہا ہے۔

''اور تمہیں یاد ہے، دوسرے ہی دن میں نے تمہیں راستے میں روک لیا تھا۔'' اُس نے یک لخت اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ گہری سانس سینے کے اندر روک کر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''ہوں، کوئی بہت زیادہ دن تو نہیں گزرے۔ اور گزر بھی جائیں تو یہ بھولنے والی بات تو نہیں ہے۔'' آخر میں وہ قصداً مسکرائی۔

''ہاں۔ جو باتیں زندگی کا رُخ موڑ دیں، وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ تم اس پہلی ملاقات کو کون سی یادوں میں شمار کرو گی۔''

''خوب صورت۔'' اب وہ کھوگئی تھی۔ ''کیسی تپتی دوپہر تھی اور اُس وقت جب میں بہت مایوس ہوکر سوچ رہی تھی کہ میں ساری زندگی شاید اس طرح دھوپ میں جھلتی رہوں گی، تب آپ نے مجھے پرکیف چھاؤں کا احساس بخشا تھا۔''

پھر اگلے سارے دن مجھ پر ایک خواب کا عالم طاری رہا۔ دل کو بھی ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا کہ میری سمت آنے والے بہاروں کے قافلے کہیں اپنا رُخ نہ موڑ لیں۔''

''اسی لیے تو میں آناً فاناً تمہیں لے آیا۔'' وہ چونک کر پوچھنے لگا۔ ''اب تو کوئی دھڑکا نہیں ہے نا؟''

''نہیں۔'' وہ نظریں چرا گئی تھی۔

وہ اپنے گھر میں دوسرے نمبر پر تھی۔ اُس سے بڑے سجاد بھائی جنہیں بی ایس سی کیے ہوئے چار سال ہوگئے تھے اور ابھی تک انہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی۔ جب کہ اُس سے چھوٹا نور انٹر سے فارغ ہوا تھا اور اُس سے چھوٹی کرن میٹرک سے۔ کوئی زیادہ بڑا کنبہ نہیں تھا۔ اماں، ابا کو ملا کر کل چھ افراد تھے۔ لیکن کمر توڑ مہنگائی میں صرف ابا کی آمدنی میں گزارہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اپنے طور پر ابا نے سجاد بھائی کو کمانے کے قابل بنا دیا تھا لیکن آگے سفارش کے بغیر کہیں شنوائی نہیں تھی، یا پھر رشوت اور ابا جیسے ایمان دار آدمی کے پاس اگر کوئی جمع پونجی ہوتی تھی تو وہ سجاد بھائی کے لیے اچھی نوکری کی اُمید میں بھی اُسے رشوت کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ساری زندگی حق حلال کمایا اور بچوں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ لیکن چار سال دھکے کھا کر اب سجاد بھائی چڑنے لگے تھے۔

''حق حلال۔ کیا بنا لیا ابا نے حق حلال سے؟ آج اگر کہیں شامہ کی نسبت طے ہوجائے تو اُس

کی شادی کرنے جوگے پیسے نہیں ہیں۔ ہم لڑکوں کو چھوڑیں لیکن ان دو لڑکیوں کے بارے میں تو سوچا ہوتا، یا ساری زندگی انہیں ایسے ہی بٹھائے رکھیں گے۔''

''کیوں بٹھائے رکھیں گے۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ کوئی ذریعہ پیدا کردے گا۔''

اماں کو اُن کی آخری بات سخت ناگوار گزرتی تھی۔ جب کہ وہ سجاد بھائی کی مایوسی پر کڑھتی تھی۔ اُسے افسوس ہوتا کہ وہ ڈھنگ کی نوکری کے چکر میں جو ملتی تھی اُسے بھی لات مار آتے تھے۔ جانے انہوں نے اپنے لیے کیا سوچ رکھا تھا جو کم پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ کم سے بھی ابا کو کچھ سہارا مل سکتا تھا لیکن انہیں شاید احساس نہیں تھا اور اُس نے احساس کر کے ہی خود کو جاب کرنے پر تیار کیا تھا۔ ورنہ اُسے کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن اُس کی قسمت میں جاب تھی ہی نہیں کہ ایک مہینے میں وہ تقریباً دس جگہ انٹرویو دینے گئی اور ہر جگہ سے مایوس لوٹی تھی۔ صرف گریجویشن نہ کوئی تجربہ نہ کوئی اضافی کورس اور جو صرف اُسے دیکھ کر نوکری دینے پر آمادہ تھے وہاں سے وہ ایسے نکلی کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اُس روز وہ اپنی زندگی کا گیارھواں انٹرویو دے کر نکلی تھی اور گزشتہ کی طرح بے حد مایوس جب ازہر شیرازی گاڑی سے اُتر کر اچانک اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

''مجھے ازہر کہتے ہیں۔ ازہر شیرازی۔'' اور وہ جو اُس کے سامنے آنے پر کچھ پریشان سی ہوگئی تھی نا سمجھنے والے انداز میں بولی۔

''پھر؟''

''آپ یہاں جاب کرتی ہیں؟'' اُس نے پھر نظر انداز کر کے اُس کے عقب میں اشارہ کر کے پوچھا۔ تو وہ مایوسی سے بولی تھی۔

''جاب ملی ہی نہیں۔''

''مل بھی جاتی تو آپ نہیں کر سکتی تھیں۔'' اُس کی مسکراہٹ سے وہ سلگ گئی تھی۔

''کیوں۔ کیوں نہیں کر سکتی۔ مجھ میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ گو کہ میں نے کوئی اضافی کورس نہیں کیا لیکن میں ہر بات جلدی سمجھ لیتی ہوں۔''

''تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ میں آپ کو جاب نہیں کرنے دوں گا۔''

''کیوں؟ آپ کون؟'' اُس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ جانے اُس کی گہری مسکراہٹ نے سمجھایا تھا، یا وہ ازخود سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہوتا ہے۔

''او کے۔ بہت جلد ملاقات ہوگی۔'' وہ تپتی دھوپ میں اُس پر بادلوں کا احساس چھوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ حیران کھڑی تھی۔

گھر آ کر اُس کی حیرت مزید سوا ہوگئی جب اماں نے اُس سے کہا کہ ابھی کچھ دن وہ نوکری کا چکر چھوڑ دے کیونکہ اُس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ ہوسکتا ہے بات بن جائے۔

''لیکن اماں! بات بن بھی گئی تو میرا مطلب ہے۔'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ اُس کی شادی کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں ہے لیکن کہہ نہیں سکی اور اماں سمجھ کر بولی تھیں۔

''اللہ مالک ہے۔ جہاں اتنا اچھا رشتہ بھیج دیا، وہاں انتظام بھی کر دے گا۔''

''اچھا رشتہ! کون آیا تھا؟''

''دو عورتیں تھیں۔ بڑے گھر کی لگ رہی تھیں اور بتا رہی تھیں لڑکا بہت بڑا آدمی ہے۔ ساری دنیا میں کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ یہ پتا دے گئی ہیں۔''

اماں نے دوپٹے کے پلو سے گرہ کھول کر کارڈ نکالا اور اُسے تھما کر کہنے لگیں۔

''کہہ رہی تھیں جو لڑکے کی چھان بین کرنی ہو کرلیں۔ اس پتے پر اُس کا دفتر ہے۔ تمہارے ابا کو دوں گی، وہی اپنی تسلی کریں گے۔''

''ازہر شیرازی!'' اُس کی نظریں اس کے نام پر جمی تھیں۔ بلکہ ذہن میں پہلے ہی اُن کی بات گردش کر رہی تھی۔

''تو پھر یہ بھی سمجھ لیں۔ میں آپ کو جاب نہیں کرنے دوں گا۔''

اور بس جو وقت ابا کو اپنی تسلی کرنے میں لگا اُس کے بعد ازہر شیرازی نے تیاری کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ اُس کا یہ کہنا ٹھیک تھا کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ابا کو کچھ تو کرنا ہی تھا اور اُس نے وہ بھی نہیں کرنے دیا تھا۔ اس دوران وہ پہلے تو حیران ہوتی رہی تھی۔ پھر بار بار اماں کے کہنے پر کہ وہ قسمت کی دھنی ہے اُسے خود پر رشک آنے لگا تھا۔ اور اب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی قسمت کی دھنی ہے، یا اُس کی قسمت میں کوئی بڑا امتحان لکھا گیا ہے کہ اوّلین شب قربتوں سے پہلے ہی فاصلوں کا سامان ہوگیا تھا۔ ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ بہت عرصہ تک بے خبر رہتی جیسے ابا مکمل چھان بین کے باوجود اُس کی ذات کا مخفی پہلو نہیں دیکھ پائے تھے جب ہی تو وہ یہاں تک آ گئی تھی۔ ورنہ ساری دنیا کی دولت کے عوض بھی ابا اُس کا ہاتھ ازہر شیرازی کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے تھے۔

اس طلسم کدے کی دوسری شب اُس کی آنکھوں سے نیند چرا لے گئی تھی۔ وہ بار بار اُسے دیکھتی جو اُس پر محبتیں نچھاور کر کے بے خبر سو رہا تھا۔ جانے وہ اتنا پُرسکون کیسے تھا۔ اُس نے تو یہی سنا تھا کہ

ایسے لوگ کبھی پُرسکون نیند نہیں سوتے۔ انہیں ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے لیکن یہاں اُلٹا معاملہ تھا۔ سارے دھڑکے اُس کے حصے میں آ گئے تھے۔ باہر درختوں میں سرسراتی ہوا بھی اس کا دل دہلائے دے رہی تھی۔ اس طرف سے دھیان ہٹانے کو وہ اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگی جو اب اُس کا میکہ تھا۔ اماں، ابا، سجاد بھائی، انور، کرن سب اُس کی شادی پر کتنے خوش تھے۔ کرن پہلے ہی ابا کے ساتھ ازہر شیرازی کو دیکھنے کے ساتھ یہ گھر بھی دیکھ گئی تھی اور اُس روز سے بار بار اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی۔

''آپی! میں تمہارے گھر آؤں گی تو بہت سارے دن رہوں گی۔''

اور کل پہلے ہی دن ازہر نے سب کو مایوس لوٹا دیا تھا۔ پتا نہیں کون کون آیا تھا۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا اور جانے گھر جا کر سب نے کیا سوچا ہوگا۔ اُسے اپنے گھر والوں کی کم مائیگی اور اس پر توہین رلا گئی۔

دل چاہا اس شخص کو جھنجوڑ کر اُٹھا دے۔ پھر پوچھے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا اور اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے وہ اُسے اُٹھانا چاہتی تھی کہ اسی پل موبائل کی گھنٹی سے گھبرا کر اُس نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔ اور وہ جتنی بے خبری کی نیند سو رہا تھا اس کے حساب سے اُسے اُٹھنے میں وقت لگنا تھا۔ لیکن وہ پہلی ہی گھنٹی پر اُٹھ بیٹھا اور موبائل لے کر بیڈ سے اُتر گیا۔ تو وہ چاہنے کے باوجود اُس کی کوئی ایک بات نہیں سن سکی کیونکہ اُس کا اپنا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ پھر یہ خوف بھی تھا کہ موبائل رکھ کر وہ اُسے ضرور چیک کرے گا کہ کہیں وہ سن تو نہیں رہی۔ لیکن وہ بڑی عجلت میں کمرے سے نکل گیا اور اس سے کتنی دیر بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولی تھیں۔ جانے وہ گھر میں کہیں موجود تھا، یا باہر چلا گیا تھا۔ وہ صبح تک اُس کے انتظار میں نہ صرف جاگتی رہی بلکہ اندیشوں نے تقریباً اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔

''بہت مشکل ہے۔'' جب ہر سو اُجالا پھیل گیا تب بستر چھوڑتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ ''ایسے خوفزدہ ماحول میں تو میں مر جاؤں گی اور میں کیوں اتنی خائف ہوں۔ میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے ازہر سے صاف بات کرنی چاہیے۔ بہت نڈر ہو کر اور پھر میں ابا کو بھی بتاؤں گی کہ یہ کیسا شخص ہے۔ مجھے چھپانا نہیں چاہیے۔''

تمام ضروریات سے فارغ ہونے تک وہ یہی سب سوچتی رہی۔ پھر کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم تک آتے ہوئے اُس نے ہر سمت نظر دوڑائی تھی۔

''صاحب کہاں ہیں؟'' ناشتا شروع کرنے سے پہلے اُس نے دیوار کے ساتھ کھڑے باوردی

ملازم کو سرسری نظر دیکھ کر پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ناشتے میں مصروف ہو گئی۔ شاید اُسے یقین تھا کہ وہ کوئی جواب نہیں دے سکے گا لیکن وہ روبوٹ کی طرح شروع ہو گیا۔

''صاحب باہر گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا آپ ناشتے پر اُن کا انتظار نہ کریں۔ البتہ دوپہر کا کھانا وہ آپ کے ساتھ کھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔''

''سوری میڈم! صاحب کی اجازت کے بغیر میں یہاں سے نہیں ہل سکتا۔'' اُس کے جواب سے خاصی بددل ہو کر وہ خود ہی وہاں سے اُٹھ کر لاؤنج میں آ بیٹھی اور گلاس وال سے لان کی خوب صورتی دیکھتے ہوئے اُسے پھر کرن کی بات یاد آئی۔ ''میں تمہارے گھر آؤں گی تو بہت سارے دن رہوں گی۔''

''بہت سارے دن۔'' اُس نے سر جھٹکا۔ پھر ٹیلی فون کے پاس آ کر پڑوس کے نمبر سوچنے لگی۔ کیونکہ ابا کے گھر فون نہیں تھا اور ابھی اُس نے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے تھے کہ عقب سے ازہر شیرازی کی آواز پر اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

''صبح ہی صبح کسے فون کیا جا رہا ہے۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا اور بہت سنبھل کر اُس کی طرف پلٹ کر بولی۔

''پریشان کر کے رکھ دیا آپ نے۔ کہاں چلے گئے تھے۔ کم از کم بتا کر تو جاتے اور ہاں، یہ میں اماں سے بات کرنے کے لیے اُن کے پڑوس کا نمبر ملا رہی تھی۔ اس پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' اُس نے بڑی جان دار مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ تو وہ اُس کے پاس آ کر بولی۔

''فون پر صرف اماں سے بات ہو گی۔ جب کہ میں سب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''میں نے منع تو نہیں کیا۔ جب چاہو۔ ابھی چلو گی۔'' وہ اُس کی مہربانی پر کھل اُٹھی۔

''ہاں۔ لیکن ابھی تو آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ چلیں شام میں۔''

''نہیں۔ ابھی میں بس شاور لوں گا۔ اس کے بعد ایک کپ چائے مجھے فریش کر دے گی۔ اور ہاں، تم نے ناشتا کر لیا۔'' اُس نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔ تو وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

''کر لیا۔''

''کیا ہوا۔ کیا ناشتے میں کوئی کمی تھی؟''

''کمی نہیں زیادتی، وہ بھی جیتی جاگتی۔ سوری۔ میں ملازم کی موجودگی میں اکیلی ٹیبل پر نہیں بیٹھ

سکتی۔'' اُس نے پہلا اعتراض اُٹھایا۔

''ارے، تو تم اشارہ کرتیں۔ وہ چلا جاتا۔''

''جناب! میں نے کہا تھا اُس سے۔ لیکن اُس نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یعنی وہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔'' وہ چلتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی تھی۔

''اور میں تمہارے حکم کا۔ کہو تو شوٹ کر دوں اُسے۔'' اُس کی محبت اور لہجے میں ذرا بناوٹ نہیں تھی۔

''نہیں۔ صرف وارننگ کافی ہو گی۔'' وہ مسکرائی۔

''او کے۔ میں اُسے بلکہ سب کو وارن کر دوں گا کہ اس گھر میں صرف تمہارا حکم چلے گا۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ کیونکہ مجھے شاور لینے میں صرف پانچ منٹ لگیں گے۔''

''وہ کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا تو اُس نے فوراً ڈریسنگ روم کا رُخ کیا۔

نو بج رہے تھے جب وہ اماں کے گھر میں داخل ہوئی۔ ابا اسی وقت آفس کے لیے نکل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر رُک گئے اور وہیں سے پکار کر اماں کو اطلاع دی تو اُن سے پہلے کرن بھاگی آئی۔ اُس کے پیچھے انور پھر سجاد بھائی بھی نکل کر آ گئے اور اُس سے زیادہ ازہر شیرازی کو پذیرائی ملنے لگی۔ اُس نے دیکھا ابا بھی بوکھلا گئے تھے اور اُسے بٹھانے کے لیے انہیں کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ خود ہی ایک جگہ بیٹھ گیا تو یک دم ساری افراتفری تھم گئی۔ جیسے بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ پھر جب وہ ابا اور سجاد بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا تب اماں کے اشارے پر وہ اُٹھ کر اُن کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

''شام تک رُکو گی نا، ناشتے۔ کھانے میں کیا بناؤں؟'' اماں نے پوچھا۔ تو اُس سے پہلے عقب سے کرن بول پڑی۔

''بڑے لوگوں کے لیے بڑا اہتمام کرنا پڑے گا اماں؟''

''نہیں اماں! کوئی اہتمام نہیں۔ بس صرف چائے۔ کیونکہ ناشتا ہم کر کے آئے ہیں اور دوپہر کے کھانے تک رُکیں گے نہیں۔'' اُس نے سہولت سے منع کر دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ پہلی بار آئی ہو اور''

''پہلی بار آئی ہوں۔ آخری بار تو نہیں۔'' وہ اماں کے گلے لگ گئی۔

''بار بار آؤ۔ خوشی سے آؤ۔ اللہ سکھی رکھے تمہیں۔'' اماں نے اُس کی پیشانی چومی۔ ''تمہارے جیسے نصیب سب کے ہوں۔''

''آمین۔'' کرن نے فوراً دعائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھائے تو اُسے دیکھ کر وہ کچھ چپ سی ہوگئی۔

''بہت خوش ہیں تمہارے ابا۔ سجاد سے کہہ رہے تھے تم ہمیشہ بڑھ بڑھ کر بولتے تھے کہ بیٹیوں کے لیے بھی کچھ جمع نہیں کیا۔ ساری زندگی بٹھائے رکھیں گے انہیں۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسا تھا۔ دیکھ لو کیسے نصیب کھولے اللہ نے میری بیٹی کے۔''

اماں خوش ہو کر بتا رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخن دیکھتی رہی جب کہ اندر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ بس مدھم مدھم دھڑکنیں تھیں۔ شاید سب کی خوشیوں کے سامنے اُن کا احتجاج دم توڑ رہا تھا۔

''اور پتا ہے آپی! کل صبح جب سجاد بھائی تمہارے گھر سے آئے تو بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ کہنے لگے بہت بڑی آدمی ہوگئی ہے شامہ۔ اب اُس سے ملنے کے لیے پہلے سے اپائنمنٹ لینا پڑے گا۔ لیکن میں کوئی اپائنمنٹ نہیں لوں گی کیونکہ میں ازہر بھائی کی اکلوتی سالی ہوں۔'' کرن اپنے سینے پر ہاتھ مار کر اترائی۔

''چل اب بہن کو بیٹھنے دے۔'' اماں نے غالباً اُس کی خاموشی محسوس کر کے کرن کو ٹوکا۔ پھر اُس سے بولیں۔ ''جاؤ بیٹی! اندر جا کر بیٹھو اور انور کو بھیج دو۔ اُس سے کچھ منگوا لوں۔ خالی چائے رکھنے پر تمہارے ابا ناراض ہوں گے۔''

''زیادہ کچھ نہیں منگوایئے گا اماں! ازہر نہیں کھائیں گے۔'' وہ کہتی ہوئی اندر آ گئی اور خاموشی سے ازہر کو سننے لگی جو ملکی حالات پر تبصرے کے ساتھ تشویش کا اظہار کر رہا تھا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ سب مفاد پرست ہیں۔ اس ملک کے لیے کوئی نہیں سوچتا۔ سب اسے لوٹنے کے چکر میں آتے ہیں۔ کوئی جذبہ نہیں ورنہ پچاس سال کم نہیں ہوتے۔ ہم بہت ترقی کر سکتے تھے۔ اگر ترقی کی ہے تو چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں نے۔ محنتی، ایمان دار آدمی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ ساری زندگی مسائل سے لڑتے لڑتے گزر جاتی ہے اُس کی۔'' وہ اُس پر سے نظریں ہٹا کر ابا کو دیکھنے لگی جو داماد کی تقریر غور سے سننے کے ساتھ خوش بھی ہو رہے تھے۔

''سراسر بے ایمانی ہے۔ دھوکا اور ناانصافی، غریبوں کا حق مارا جا رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ معاً اُس پر نظر پڑی تو ایک لحظہ رُک کر بولا۔ ''چلیں؟''

''چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔'' اُس نے چونک کر کہا۔

''صرف چائے کیوں؟ کھانا وغیرہ کھا کر جانا۔'' ابا نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''اپنا گھر ہے۔ کھانا پھر کسی وقت کھا لیں گے۔ ابھی ذرا کچھ کام ہے۔'' اُس نے اپنائیت کے

اظہار کے ساتھ منع کیا۔ پھر چائے کے دوران سجاد بھائی سے اُن کی تعلیم اور جاب کے لیے کی گئی اب تک کی کوششوں کے بارے میں پوچھتا رہا اور آخر میں کہنے لگا کہ اس سلسلے میں اُس کی مدد کی ضرورت ہو تو اُن کے کام آ کر اُسے خوشی ہوگی۔ جس پر سجاد بھائی نے ابا کو دیکھا تو انہوں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''تمہارے گھر والے بہت سادہ ہیں۔'' واپسی میں وہ اُس سے کہنے لگا۔ ''آج کے دور میں ایسے لوگوں کا گزارہ بہت مشکل ہے اور تم نے مجھے بتایا نہیں کہ سجاد صاحب چار سالوں سے جاب کے لیے پریشان ہیں۔''

''اُن کی اپنی غلطی ہے۔ وہ کم پر راضی نہیں ہوتے۔ ورنہ اب تک دھکے کھانے کے بجائے چار سالہ تجربے کی بنیاد پر اچھی جاب مل جاتی۔'' اُس نے صاف گوئی سے سجاد بھائی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ اور وہ بے نیازی سے بولا۔

''نو پرابلم۔ ابھی بھی انہیں اچھی جاب مل جائے گی۔''

''میری طرح۔'' وہ محض اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر قدرے شرارت سے مسکرائی۔ تو وہ اُسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کیا تم خوش نہیں ہو؟''

''کیوں نہیں، میں بہت خوش ہوں۔ اس سے زیادہ اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا تھا۔''

اُس نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ازہر شیرازی کی ذات میں اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اُس کے مقابلے میں وہ بہت کمزور اور مجبور ہے۔ اس لیے اُس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ بقول اُس کے اُسے اپنے حوالے سے دیکھے اور سوچے اور خود کو اس بات کا پابند کر کے وہ زندگی اور اس کی خوب صورتیوں کو اسی طرح محسوس کرنے لگی تھی جیسا وہ ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنا بڑا گھر جس میں اُس کی دل بستگی کی ہر شے موجود تھی۔ اس پر اُس کی محبتوں کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھی اور ان خوب صورت حقیقتوں کے سامنے ایک تلخ حقیقت اُس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لیے اُس نے اس نہج پر سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس جنت میں اُس کے لیے ممنوعہ شجر اُس کا ذاتی موبائل ہے جسے وہ اوّلین شب انجانے میں چھونے کی غلطی کر گئی تھی اور دوبارہ ایسی غلطی سرزد ہونے پر وہ اگر جنت سے نہ بھی نکالی جاتی تب بھی اُس کے لیے زندگی تنگ ہو سکتی تھی اور اُس کے خیال میں خود پر زندگی تنگ کر کے بھی وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس لیے اُس کے تاریک پہلو

سے سمجھوتا کرنے میں اُس نے خود کو حق بجانب بھی سمجھ لیا تھا۔ گو کہ وہ کوئی نادان، ناسمجھ نہیں تھی لیکن آسائشوں کی چکاچوند اچھے اچھوں کے ایمان خطرے میں ڈال دیتی ہے پھر وہ تو عام سی لڑکی تھی۔ جو پہلے مقام پر جذباتی ہو گئی تھی اور اب قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کے ساتھ خوش تھی۔ ایک مہینے میں ہی اُس کے انداز بدل گئے تھے۔

صبح اپنی مرضی سے دس گیارہ بجے سو کر اُٹھتی۔ پھر کمرے سے نکلتی تو یہاں سے وہاں تک ملازم اُس کے ایک اشارے کے منتظر ہوتے اور وہ خاصی بے نیازی دکھاتی۔ ناشتے کے بعد جتنی دیر ازہر گھر پر ہوتا وہ اُس کے ساتھ مصروف رہتی۔ یہ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی موجودگی میں اُس کی توجہ صرف اپنی طرف رکھنا چاہتا تھا۔ پھر اُس کے جانے کے بعد وہ اپنے موڈ کے مطابق چلتی تھی۔ کسی دن اُس کی لائبریری میں جا بیٹھتی۔ کبھی ڈش آن کر کے مسلسل ریموٹ کے بٹن دباتی رہتی اور کبھی اپنی نگرانی میں صفائی کروانے کھڑی ہو جاتی تو ملازموں کی شامت آ جاتی تھی۔ اور شام میں روزانہ ازہر اُسے کہیں نہ کہیں گھمانے ضرور لے جاتا۔ اس لیے اُس کے آنے سے پہلے اُس کا تیار ہونا لازمی تھا۔

اُس وقت وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکل کر آئی تھی کہ آگے ازہر کے ساتھ سجاد بھائی کو دیکھ کر جہاں اُسے خوشی ہوئی وہاں یہ خیال بھی آیا کہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے اماں کے گھر نہیں گئی۔

''کیسے ہیں سجاد بھائی آپ اور گھر میں سب؟'' وہ اُن سے مل کر بیٹھی تو ایک ایک کا پوچھنے لگی۔

''سب ٹھیک ہیں۔ اتنے دنوں سے تم لوگ آئے نہیں تو میں نے سوچا میں ہی مل آؤں۔''

''بس وہ ازہر اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ......'' اُس کے عذر پر ازہر شیرازی نے فوراً ٹوک دیا۔

''میری مصروفیت کو الزام مت دو۔ صاف کہو۔ تمہیں خیال نہیں آیا۔''

''جی نہیں۔ مجھے خیال آیا تھا۔ میں ایک دو دن میں آؤں گی سجاد بھائی! اماں سے کہہ دیجیے گا۔'' وہ ملازم کو چائے لانے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''اور جاب تو نہیں ملی ہو گی آپ کو؟'' ازہر نے سجاد بھائی کو اپنی طرف متوجہ کر کے پوچھا۔ تو وہ مایوسی سے بولے۔

''جی نہیں۔''

''جاب ہی کیوں تلاش کر رہے ہیں آپ؟ آئی مین کوئی بزنس کیوں نہیں کر لیتے۔'' اُس نے جانے پوچھا، یا مشورہ دیا۔ وہ بہرحال کچھ جزبز سی ہو کر پہلو بدلنے لگی تھی کیونکہ گھر کے حالات جانتی تھی۔ اور سجاد بھائی سر کھجا کر بولے۔

''بزنس کے لیے ظاہر ہے پیسہ۔''

''کتنا؟ پانچ لاکھ، دس لاکھ، وہ آپ مجھ سے لے لیں۔'' ازہر کی فوری پیشکش پر سجاد بھائی نے اُسے دیکھا تو وہ یک سر انجان بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بزنس سوچیں، پیسے کی فکر نہیں کریں۔ جتنا چاہیے ہو گا میں دوں گا۔ کیوں شامہ! کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے۔'' اُسے انجان بنتے دیکھ کر اُس نے بڑی خوب صورتی سے اُسے اس معاملے میں گھسیٹ لیا تھا۔

''ہاں، کر تو سکتے ہیں لیکن شاید ابا اور سجاد بھائی بھی نہیں مانیں گے۔'' اُس نے سوچ کر کہا اور سجاد بھائی کو اشارہ بھی کیا۔ تو وہ اُس کی تائید میں بولے۔

''جی۔ یہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔''

''کیوں، کیوں مناسب نہیں لگتا۔ ہم کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ شام! جاؤ میری چیک بک لے آؤ، میں ابھی سائن کر دیتا ہوں۔'' ازہر نے اُسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے طور پر منع کرتی تو یقیناً اُسے بُرا لگتا اور اُس کے سامنے سجاد بھائی سے بھی زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لیے کچھ کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''پہلے سجاد بھائی کو کوئی بزنس تو سوچنے دیں۔''

وہ اُن کا کام ہے، جب بھی سوچیں۔ اور میں آج کا کام کل پر نہیں ٹالتا۔ یوں بھی اس ہفتے میں امریکہ جا رہا ہوں۔ وہاں پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں۔ اُس نے فوراً اُسے اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو اُٹھنے کے ساتھ وہ کچھ اُلجھ کر پوچھنے لگی۔

''آپ امریکہ جا رہے ہیں، کیوں؟''

''بزنس۔'' مختصر جواب کے ساتھ وہ سگار سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اُسے مزید کوئی سوال نہیں کرنا اور وہ سمجھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اُس کی چیک بک لے کر واپس آئی تو وہ سجاد بھائی کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُن کے لیے غیر نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اُن پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ اگر وہ یہ رقم قبول نہیں کریں گے تو اُسے افسوس ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

اُس نے خاموشی سے چیک بک اُسے تھمائی اور ٹرالی اپنے پاس کھینچ کر چائے بنانے لگی۔ جانے اُس نے کتنی رقم کا چیک کاٹا اور بہت اپنائیت بھرے اصرار کے ساتھ سجاد بھائی کو تھمایا تھا۔

''ہوں، کہیں چلنا ہے؟'' سجاد بھائی کے جانے کے بعد اُس نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر کے پوچھا۔ تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آ بیٹھی اور اُس کا بازو تھام کر اشتیاق سے بولی۔

''میں آپ کے ساتھ امریکہ چلوں گی۔''

''امریکہ۔'' اُس نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔ ''لے چلوں گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں بزنس کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ تمہیں میں۔ چلو اگلے مہینے ٹھیک۔''

''ٹھیک اور اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ کے بغیر میں یہاں کیا کروں گی۔ اتنے سارے دن میں اکیلی بہت بور ہوں گی۔''

''کرن کو بلا لینا اپنے پاس۔ ویسے ہفتہ دس دن کی بات ہے۔ میں آ جاؤں گا اور دیکھو، میری غیر موجودگی میں تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں۔'' اُس نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں تنبیہ کی۔ جس پر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

پھر تیسرے دن رات کے دو بجے اُس کی فلائٹ تھی۔ اُس کا خیال تھا وہ اُس کے جانے سے پہلے ہی کرن کو لے آئے گی لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ اور وہ بھی جب جانے لگا تب اُسے یاد آیا تو بار بار تاکید کرتا گیا تھا کہ صبح پہلی فرصت میں فون کر کے سجاد بھائی سے کہنا، کرن کو یہاں چھوڑ جائیں۔ اور صبح تو جب ہونی تھی اس وقت تو اُس کے جانے کے بعد وہ اکیلی تھی۔ تو کچھ دیر کے لیے لاؤنج میں بیٹھ گئی کہ اگر اُسے کوئی خوف محسوس ہوا تو اِسی وقت ڈرائیور کو بھیج کر سجاد بھائی کو بلوا لے گی لیکن کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کے برعکس یہ ادراک خود اُس کے لیے حیران کن تھا کہ وہ ازہر شیرازی کی محبت میں سارے اندیشوں کو کہیں پیچھے چھوڑ آئی ہے اور اب اُس کی کچھ دنوں کی دوری کو بھی شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ ابھی تو وہ گیا تھا اور ابھی سے وہ اُس کے آنے کے دن شمار کرتی ہوئی لاؤنج سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

صبح ناشتے کے بعد اُس نے اماں کے پڑوس میں فون کر کے انہیں بلوایا اور ازہر کے امریکہ جانے کا بتا کر کرن کو بھیجنے کو کہا تو اماں اُلٹا اُس سے اصرار کرنے لگیں۔

''کچھ دنوں کے لیے تم آ جاؤ۔''

''میں گھر اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی اماں! ازہر نے بھی تاکید کی تھی کہ میں نوکروں پر گھر چھوڑ کر نہ جاؤں۔ آپ بس کرن کو بھیج دیں۔ اُسے شوق بھی ہے میرے گھر بہت سارے دن رہنے کا۔'' اُس نے کرن کی بات یاد دلائی۔

''اچھا دیکھو، میں پوچھتی ہوں تمہارے ابا سے۔ انہوں نے اجازت دی تو پھر بھیج دوں گی اُسے سجاد کے ساتھ۔''

اماں نے یقین سے نہیں کہا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ ابا منع نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ اُسی

وقت سے انتظار کرنے لگی۔ اور سارا دن کے انتظار کے بعد شام میں ابا خود کرن کو لے کر آئے تو اس وقت تک وہ کوفت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

''میں ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ آپ نے شاید کرن کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہوگا۔'' اُس نے ابا سے مل کر پہلی بات یہی کی۔ تو وہ اُس کا سر ہلا کر بولے۔

''منع کیوں کروں گا۔ بس صبح یہ کالج چلی گئی۔ دوپہر سے سجاد گھر پر نہیں ہے اور دیکھو، میں خود لے کر آ گیا۔''

''چلیں اس بہانے آپ آ گئے۔ آیئے بیٹھیں۔''

''کتنے دنوں کے لیے گیا ہے ازہر۔'' ابا نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہفتہ دس دن کا کہہ گئے ہیں۔'' وہ کرن کو دیکھ کر مسکرائی۔

''دس دن کرن یہاں رہے گی۔ نہیں بیٹا اُدھر تمہاری اماں بھی تو اکیلی ہیں۔''

''کوئی اکیلی نہیں ہیں اماں۔ آپ ہیں بھائی ہیں اور دس دن کوئی اتنے زیادہ نہیں ہوتے۔ کیوں کرن رہو گی نا؟'' اُس نے کرن کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

''ابا کو پتا۔''

''ابا نے کہہ دیا ہے۔ بس تم یہیں رہو گی۔'' اُس نے خود ہی ابا کی طرف سے ہامی بھر لی۔ پھر کہنے لگی۔ ''آپ تو ابھی آفس سے آئے ہوں گے ابا! کھانا لگواؤں۔''

''نہیں بیٹا! کھانا میں کھا کر آیا ہوں اور ہاں یہ ازہر نے کیا کیا ہے۔ سجاد کو دس لاکھ کا چیک دے دیا۔ میں اُسی روز آنے والا تھا لیکن سجاد نے روک لیا کہ فوراً لوٹانے سے ازہر بُرا مانے گا۔ اب تم بتاؤ کیسے واپس کریں اُسے۔''

ابا نے فکرمندی سے اُسے دیکھا جیسے کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہو۔ اور وہ پہلے سے جانتی تھی کہ ابا اس رقم کو قبول نہیں کریں گے لیکن اب ازہر کی ناراضگی کا خیال تھا، اس لیے رُک کر بولی۔

''واپس کیوں کریں گے ابا! کوئی کاروبار کریں۔''

''نہیں بیٹی! میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔ تم جانتی ہو میں نے کبھی کسی سے ایک پیسہ نہیں لیا اور داماد سے لینا تو اور بھی معیوب لگتا ہے۔''

''آپ نے مانگے تو نہیں تھے نہ سجاد بھائی نے مانگے۔ انہوں نے اپنی خوشی سے دیئے ہیں۔ اب اگر آپ لوٹائیں گے تو انہیں واقعی بُرا لگے گا۔ مجھ کو جتائیں گے کہ آپ نے انہیں غیر سمجھا۔ ایسا کریں ابھی سجاد بھائی کو کوئی کاروبار کرنے دیں جب وہ سیٹ ہو جائیں تو پھر کسی اور بہانے سے لو

دیجیے گا۔''

اُس نے ازہر کی ناراضگی کا احساس دلا کر کہا تو ابا یوں دیکھنے لگے جیسے اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ کیا کریں۔

''میں جانتی ہوں ابا! آپ کے لیے یہ رقم لینا بہت مشکل ہے لیکن میں کیا کروں۔ آپ اسے قرض سمجھ لیں۔''

''قرض سمجھ لوں پھر بھی رقم بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے دو تین لاکھ کافی ہوں گے جو آسانی سے لوٹا بھی سکیں۔'' اُس کی منت پر ابا نے کسی قدر آمادگی کے ساتھ زیادہ رقم پر اعتراض کیا۔

''چلیں آپ دو تین لاکھ سے ہی کاروبار کر لیں۔ باقی فی الحال بینک میں ڈال دیں۔ پھر میں کوئی موقع دیکھ کر ازہر سے بات کروں گی کہ جتنی سجاد بھائی کی ضرورت تھی لے لیا باقی شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔'' اُس کی بات پر ابا خاموش ہو رہے تو اُس نے فوراً موضوع بدل کر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں اور اُن کے جانے تک مسلسل اُن کا دھیان بٹائے رکھا کہ کہیں وہ پھر نہ منع کر دیں۔

''آپی! میں تمہارا گھر دیکھ لوں۔'' ابا کے جاتے ہی کرن نے اپنے اشتیاق کو زبان دی۔

''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں پھر تم اپنا شوق پورا کرنا۔'' اُس نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔ پھر کرن کے ساتھ ڈائننگ روم کا رُخ کیا تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کھٹکے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے فوراً کرن کو دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ پھر ابھی وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دروازے کے قریب بھاری جوتوں کی آواز پر چونک کر بولی۔

''کون؟'' اُدھر سے کوئی جواب نہیں آیا بلکہ ایک دم خاموشی چھا گئی تو کچھ انتظار کے بعد وہ بیڈ سے اُتر کر دروازے کے پاس آئی اور ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی اُس کی چھٹی حس نے کسی خطرے کا الارم بجایا تھا جس سے اُس کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ بمشکل خود کو سنبھال کر اُس نے بہت آہستگی سے کارپٹ پر گھٹنے ٹکائے اور کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگی۔ جہاں جہاں اُس کی نظر گئی کوئی نہیں تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ کوئی ہے کیونکہ جوتوں کی آواز بہت واضح سنائی دی تھی۔ اگر کوئی ملازم ہوتا تو اُس کی کون کا جواب ضرور دیتا اور اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر دیکھتی۔ کتنی دیر تک وہیں بیٹھی کبھی کی ہول سے جھانکتی، کبھی دروازے سے کان لگا کر کوئی آواز سننے

کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اُٹھنے سے پہلے آخری بار اُس نے کی ہول سے آنکھ لگائی تھی کہ بس ایک لحظہ کو جو چہرہ سامنے آیا وہ اُس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اُس کے سامنے آنے کے انتظار میں صبح ہو گئی تھی لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ جانے کون تھا اور کس مقصد سے آیا تھا۔ وہ بہرحال پریشان ہو گئی تھی۔

جب کرن اُٹھ گئی تب اُس نے پہلے خود کمرے سے نکل کر ہر طرف کا جائزہ لیا۔ ملازم اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ اُس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور کرن کو اس خیال سے نہیں بتایا کہ وہ اس سے زیادہ پریشان ہو جائے گی۔

''ایسا ہے کرن کہ رات میں ٹھیک سے سو نہیں سکی اور اب مجھے نیند آ رہی ہے۔'' ناشتے کے بعد وہ کرن سے کہنے لگی۔ ''تم چاہو تو کوئی مووی دیکھ لو کیونکہ میں اب سونے جا رہی ہوں۔''

''مووی نہیں اگر اجازت دو تو میں لائبریری میں چلی جاؤں۔'' کرن کی دلچسپی کتابوں میں تھی۔

''ہاں ہاں شوق سے۔'' اُس نے کہا پھر اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ فون کی بیل پر ملازم سے پہلے ہی بھاگ کر ریسیور اُٹھا لیا کیونکہ اُسے ازہر شیرازی کا خیال آیا تھا۔

''ہیلو!'' اُس کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔

''آپ مسز شیرازی؟'' دوسری طرف جانے کون تھا۔

''جی آپ کون؟'' اُس نے سنبھل کر پوچھا۔

''آپ کا خیر خواہ۔'' بڑے گمبھیر لہجے میں جواب آیا۔

''کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟'' وہ اپنی تمام تر توجہ اِدھر مرکوز رکھ کر بولی۔ کچھ ٹھٹک بھی گئی تھی۔

''کسی سے نہیں۔ بس آپ سے معذرت کرنی تھی کہ رات میری اتنی احتیاط کے باوجود آپ کی نیند خراب ہوئی۔ آئی ایم سو سوری۔'' اُس کا لہجہ ہنوز تھا۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر آواز دبا کر پوچھنے لگی۔

''کون ہیں آپ اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''ان باتوں کا جواب وقت آنے پر دوں گا۔ او کے۔'' اُدھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا تو اُس کی پریشانی میں اُلجھن بھی شامل ہو گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ کتنی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی لیکن یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ جو خود کو اُس کا خیر خواہ بتا رہا تھا وہ کس مقصد سے آیا تھا اور

کس راستے سے کہ دونوں اطراف گیٹ پر موجود چوکیداروں کو خبر نہیں ہو سکی تھی۔

رات میں ازہر شیرازی کا فون آیا تو اُس نے دانستہ اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ گو کہ اُس سے چھپانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا بس یہ خیال کہ اتنی دُور بیٹھ کر وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی یہی کہتی رہی۔ ''سب ٹھیک ہے کوئی پرابلم نہیں۔''

''آپی! ازہر بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔'' وہ اپنی جگہ پر لیٹی تو کرن اُس کی طرف کروٹ لے کر بولی۔

''تمہیں کیسے پتا۔''

''لو پانچ دن سے دیکھ رہی ہوں۔ روزانہ فون کرتے ہیں۔ وہ بھی امریکہ سے جہاں جا کر لوگ پچھلوں کو بھول جاتے ہیں۔ تم واقعی بہت خوش قسمت ہو۔''

''وہ تو ہوں۔'' وہ اترائی۔ پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ ''کبھی کبھی میں خود حیران ہو جاتی ہوں کہ مجھ میں ایسی کیا بات ہے جو ازہر کہتے ہیں انہیں ہمیشہ سے میری تلاش تھی۔ جب کہ میں بہت زیادہ حسین و جمیل ہوں نہ دولت مند تھی۔''

''خیر اٹریکشن تو تم میں بہت ہے وہ جو حسینوں جمیلوں میں بھی نہیں ہوتا۔ تمہاری آنکھیں اور خصوصاً تمہارے ہونٹوں کی تراش بہت خوب صورت ہے۔'' کرن کی تعریف پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

''ازہر بھی یہی کہتے ہیں۔''

''اچھا اور کیا کہتے ہیں؟'' کرن نے شوخی سے کہا۔ تو وہ قدرے جھینپ گئی تھی۔

پھر تین دن اور یونہی گزر گئے۔

آٹھویں روز ازہر شیرازی کی آمد پر اُس نے بے اختیار اُس کی طرف پیش رفت کی تھی، یوں جیسے وہ مدتوں بعد لوٹا ہو۔ اور اپنے لیے اُس کی بے اختیاری پر وہ بہت مطمئن سا ہو کر مسکرایا۔

''میری ساری تھکن تم نے پل میں سمیٹ لی۔''

''اس کا مطلب ہے میں سیدھی جنت میں جاؤں گی۔'' اُس نے کھلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جس عورت کو دیکھ کر اُس کا شوہر خوش ہو جائے اور ساری تھکن بھول جائے . . جنت میں جائے گی۔'' وہ اُس کے ہاتھ سے کوٹ لے کر پلٹی۔ تو وہ ایک دم اُس کا بازو

پوچھنے لگا۔

''یہ گھر جنت سے کم ہے کیا؟ اگر کوئی کمی ہے تو بتاؤ، میں.........''

''نہیں کوئی کمی نہیں ہے۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''اچھا وہ کرن کہاں ہے؟ یہیں ہے، یا چلی گئی؟'' وہ اُس کا بازو چھوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''یہیں ہے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ اُس نے آج صبح سے جانے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ آپ کچھ دیر آرام کر لیں پھر اُسے چھوڑ آئیں گے۔'' وہ اُس کا کوٹ ہینگر کرتی ہوئی بولی۔

''میں آرام کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ بس اچھی سی چائے پلواؤ، پھر چلتے ہیں۔''

وہ صوفے پر بیٹھا اور سامنے ٹیبل پر ٹانگیں سیدھی کیں۔ پھر زانو پر رکھ کر بریف کیس کھولتا ہوا پوچھنے لگا۔ ''میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا۔''

''نہیں۔'' اُسے جواب کے ساتھ ہی اُس کا رات واقعہ یاد آیا لیکن وہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ ابھی فوراً بتانا مناسب نہیں ہے۔ رات میں اطمینان سے بتائے گی اور رات میں اُسے لگا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اُسے روک رہی ہے۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

اُس کی شادی کو آٹھ مہینے ہو گئے تھے اور اب وہ خاصی سوشل ہو گئی تھی۔ ابتدائی عرصے میں جو کہیں آنے جانے کے لیے ازہر شیرازی نے اُسے اپنا پابند رکھا تھا تو اب وہ بات بھی نہیں تھی۔ اپنے حلقے میں ہونے والی اکثر پارٹیز میں اُس نے اُسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ جب کہ وہ خود شاذ و نادر ہی کوئی پارٹی اٹینڈ کرتا تھا۔ اکثر تو اُس کی مصروفیات آڑے آتی تھیں اور کبھی فارغ ہوتا تب بھی منع کر دیتا۔ البتہ اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا اور اُس کی محبت میں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ جیسا کہ اُس نے کہا تھا کہ مجھے صرف اپنے حوالے سے دیکھو اور وہاں گرفت کرو جہاں میری محبت میں ذرا سی بھی کمی پاؤ۔ تو اب تک ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا تھا جہاں وہ گرفت کرتی اور بہت زیادہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے اُسے اچانک اپنی سونی گود کا احساس ہونے لگا تھا اور اس معاملے میں بھی قسمت بڑی جلدی اُس پر مہربان ہو گئی کہ سونے پن کا احساس شدید ہونے سے پہلے ہی اُسے ماں بننے کی نوید مل گئی تھی۔

''یقیناً میری کوئی بات، کوئی عمل اللہ کو پسند آیا ہے جو مجھے میری خواہشوں سے بڑھ کر نواز رہا ہے۔''

. . خوش تھی . . ت مگن۔ اُس کے پاس اور کوئی موضوع ہی نہیں رہا تھا۔ سارا وقت آنے

والے بچے کی باتیں کرتی رہتی۔

اُس وقت از ہر شیرازی کے بازو پر سر رکھے وہ یہی روزانہ والی باتیں دہرا رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی سے وہ نہ صرف خاموش ہوگئی بلکہ اُس کے بازو سے سر ہٹا کر انجان سی بن گئی تھی۔

''ہوں۔'' اُس نے موبائل کان سے لگا کر ہوں کی آواز نکالی اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دوسری طرف کی بات سن کر بس ایک لفظ بولا تھا۔ ''خیبر میل۔'' پھر موبائل رکھ کر اُس کی طرف کروٹ لے کر بولا۔

''ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم؟''

''خیبر میل۔'' اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ پھر ایک دم چونک کر بولی۔ ''میں بچے کا نام سوچنے لگی تھی۔''

''پھر کیا سوچا!''

''اب پتا نہیں بیٹا ہوگا کہ بیٹی۔ خیر میں ایسا نام سوچوں گی جو دونوں کا رکھا جا سکے۔ جیسے رفعت، شاہین، نسیم اور۔''

''اوں ہوں۔ ایسے ان رومینٹک نام سوچ کر میرے رومینٹک موڈ کو خراب مت کرو۔'' وہ ٹوک کر بولا اور اُسے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''صبح وہ اپنے معمول کے مطابق گیارہ بجے سو کر اُٹھی تو خلاف معمول اُسے سویا دیکھ کر اچنبھے کے ساتھ کچھ تشویش سی ہوئی۔ فوراً اُس کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ تو وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر بولا۔

''نو پرابلم، بس آج چھٹی کا موڈ ہے۔''

''چلیں، آپ آرام کریں۔'' وہ مطمئن ہو کر بیڈ سے اُتر آئی۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر اس سے ناشتے کا پوچھا تو اُس نے وہ بھی منع کر دیا۔

''بس ایک کپ چائے بھجوا دو اور اخبار بھی اور تم ناشتے میں جوس ضرور لینا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتی کمرے سے نکل کر آئی۔ تو ایک ملازم انتظار میں کھڑا تھا اُسے دیکھتے ہی لپک کر اُس کی طرف آیا۔

''میڈم! مجھے چھٹی چاہیے۔''

''کیوں؟'' اُس نے رُکے بغیر پوچھا۔

''وہ ٹرین کا حادثہ ہو گیا ہے۔ میں نے رات اپنے بال بچوں کو اُس پر سوار کرایا تھا۔'' ملازم اُس کے پیچھے چلتا ہوا بتا رہا تھا۔ اُس نے ایک دم رُک کر اُسے دیکھا۔

''ٹرین کا حادثہ، کب؟ تمہیں کس نے بتایا؟''

''جی ڈرائیور نے اخبار دیکھ کر بتایا ہے۔'' ملازم کی بے بسی اور بے چارگی انتہا کو چھو رہی تھی۔ کس قدر مجبور تھا وہ کہ حادثے کا سن کر بھی فوراً نہیں جا سکتا تھا۔ آج از ہر بھی تو ابھی تک سو رہا تھا ورنہ اُس سے چھٹی لے کر چلا جاتا۔ وہ اُسے ایک منٹ رُکنے کا کہہ کر دوبارہ اپنے کمرے میں گئی اور اُسے دینے کے لیے پیسے لے کر فوراً واپس بھی آ گئی تھی۔

''کہاں ہوا ہے یہ حادثہ؟'' اُس نے روپے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی حیدرآباد سے کچھ آگے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' وہ اُسے اجازت دے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی لیکن ناشتہ کرنے کو بالکل دل نہیں چاہا۔ زبردستی ایک گلاس جوس پیا۔ پھر خانساماں کو از ہر کے لیے چائے کا کہہ کر لاؤنج میں آئی اور اخبار ہاتھ میں لیتے ہی اُس کی شہ سرخی سے اُس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے تھے۔

''خیبر میل میں بم دھماکہ، قیامت صغریٰ کا منظر۔''

''خیبر میل، خیبر میل۔'' اُس کے ہونٹ جیسے ورد کرنے لگے تھے۔ پھر ایسے ہی گم صم سی اپنے کمرے میں آئی اور ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کے اجلے نکھرے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

''شام!'' اُسے غالباً اپنے چہرے پر اُس کی نظریں محسوس ہوئی تھیں۔ ذرا سی آنکھیں کھولیں پھر فوراً اُٹھ بیٹھا۔ ''کیا بات ہے۔ تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔ یہاں میرے پاس آؤ۔''

اُس کے ساکت وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے۔'' وہ اُس کے پاس آ گیا اور کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھانے لگا تو اُس کے ہاتھ سے اخبار نکل کر بکھر گیا۔ جسے اُسے بٹھانے کے بعد ہی اُس نے اُٹھایا۔ اور دیکھے بغیر رول کر کے ایک طرف رکھنے لگا تھا کہ وہ ایسے ہی گم صم انداز میں بولی۔

''قیامت بیتی ہوگی۔'' پھر ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی تو وہ پریشان ہو گیا۔

''شام! شام پلیز، مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

''اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ خیبر میل میں بم دھماکہ۔''

''کب؟ کہاں۔'' اُس نے فوراً اخبار پھیلا لیا۔ ''اوہ گاڈ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ رات میں نے اپنا مال اس میں بک کرایا تھا۔''

''مال۔'' وہ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر تاسف سے بولی۔ ''آپ نے مال بک کرایا تھا اور لال دین کے بیوی، بچے اس میں تھے اور اور کتنے لوگ۔ اُف کتنا ہولناک منظر ہوگا۔''

"ریلیکس شامہ۔ یہ حادثے تو اب معمول بن گئے ہیں۔تم مت سوچو۔ اُٹھو وہاں جا کر لیٹو۔ میں تمہارے لیے گلوکوز منگواتا ہوں۔"

وہ اُسے بیڈ پر لٹا کر کمرے سے نکل گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر خود کو سرزنش کرنے لگی کہ اُسے ازہر پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اتنی محبت کرنے والا ایسے گھناؤنے جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ معاً موبائل کی گھنٹی سے وہ اُچھل پڑی اور بس ایک پل کو سوچا۔ پھر موبائل تکیے کے اندر گھسیٹ کر سختی سے ہونٹ بھینچ کر اسی کے انداز میں ہوں کی آواز نکالی تھی۔

"خیبر میل مشن کامیاب رہا۔ اپنے آدمیوں سے کہو، سندھ کا بارڈر کراس کر جائیں۔ ہمارا اگلا ٹارگٹ۔"

ازہر کی آواز پر اُس نے فوراً موبائل بند کر کے دوبارہ اُسی جگہ دھکیل دیا اور آنکھیں بند کر لیں جب کہ دل اوّل شب کی طرح سہم کر رہ گیا تھا۔

"شام!" اُس نے کمرے میں آتے ہی اُسے پکارا۔ پھر قریب آ کر اُس کے چہرے سے تکیہ ہٹاتا ہوا بولا۔

"اس طرح مت سوؤ۔ خانساماں بتا رہا ہے تم نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ چلو اُٹھو پہلے کچھ کھا لو۔ تمہیں زیادہ دیر خالی پیٹ نہیں رہنا چاہیے۔"

"میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز مجھے سونے دیں۔" اُسے اچانک اُس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ دل چاہا اپنے کندھے پر دھرا اُس کا ہاتھ جھٹک دے لیکن اُس کے اندر یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں بہت کم تر اور کمزور ہے۔ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بلکہ ایسی کوئی کوشش خود اُس کے لیے زندگی تنگ کر دے گی۔

"تمہارے دل کی ایسی تیسی چلو اُٹھو۔" اُس نے زبردستی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ پھر ٹرالی قریب کھینچ کر کہنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی حساس ہو۔ آئندہ سے تمہارا اخبار پڑھنا بند بلکہ میں اخبار ہی بند کروا دیتا ہوں۔"

"اخبار بند کروانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات یہ ہو کہ یہ دہشت گردی بند کروا دیں۔" اُس کے اندر آزردگی بڑھ رہی تھی۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔" وہ اُٹھ کر بیڈ کے دوسری طرف گیا۔ پھر موبائل اُٹھا کر صوفے پر جا بیٹھا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ابھی اُس کی چوری پکڑی جائے گی کہ کچھ دیر پہلے وہ اُس کی کال ریسیو کر چکی ہے۔ خود کو بہت انجان ظاہر کرنے کی کوشش کے باوجود اُس کا سارا دھیان

اُسی کی طرف تھا۔ جو نمبر ملا کر اپنے کوڈ ورڈ بول رہا تھا پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد موبائل بند کر کے اُس سے بولا۔

"میرے لیے بھی چائے بنا دینا۔" اُس نے سینے میں اٹکی سانس دھیرے دھیرے باہر نکالی تھی۔

اور پھر وہ جو خوب صورت خوابوں میں کھو کر اُس کے گھناؤنے روپ سے نظریں چرانے میں خود کو حق بجانب بھی سمجھتی رہی تھی۔ اس ہولناک حادثے نے اُسے پھر سے پہلے مقام پر دھکیل دیا تھا اور خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے وہ گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہ کر بس یہی سوچتی رہتی کہ اُسے اُس کی گھناؤنی سرگرمیوں سے کیسے روکے۔ جن کے انجام کا خیال ہی اُسے لرزا دیتا تھا۔

"ازہر!" بڑے دنوں بعد وہ اُسے خود سے مخاطب کر رہی تھی۔ "آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کو صرف اپنے حوالے سے دیکھوں اور آپ کی بات مان کر میں نے خود کو زندگی کی خوب صورتیوں میں گم کر دیا لیکن اب یہ خوب صورتیاں مجھے ڈسنے لگی ہیں۔ میں سو نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر پل میری سماعتوں میں ٹرین کی وسل کے ساتھ انسانی چیخیں گونجتی رہتی ہیں۔ آنکھیں بند کرتی ہوں تو وہ سارا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

"ایسا صرف اس لیے ہے کہ تم نے اُس واقعے کو خود پر طاری کر لیا ہے۔ باہر نکلو، گھومو پھرو۔ اپنا دھیان بٹاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اُس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں۔ اس طرح سب ٹھیک نہیں ہو گا۔ بلکہ خود فریبی میں مبتلا ہو کر کسی دن میں آپ کو کھو دوں گی اور میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔"

"ارے مجھے کھونے کا خیال کیوں آیا تمہیں۔" وہ ذرا سا ہنسا۔ شاید اپنے چونکنے کو چھپایا تھا۔

"میری بات کو اس طرح نہیں اڑائیں ازہر! آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپا نہیں اور مزید میں انجان نہیں بن سکتی۔ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اپنے قدم واپس موڑ لیں ورنہ میں............"

آخری دو لفظ بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکلے تھے اور اُس کی پیشانی پر گہری لکیر کھنچ گئی۔

"میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"بے وقوف!" اُس نے اُس کی کلائی تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا اور دونوں بازوؤں کے حلقے میں لینا چاہتا تھا کہ وہ جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔

‘‘آپ کو میری قسم اگر مجھ سے محبت کرتے ہیں تو آپ کو یہ راستہ چھوڑنا ہوگا۔ پلیز میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں اس دلدل سے نکل آئیں۔ میں ایسی زندگی نہیں جیوں گی۔ جس میں ہمارے لیے بے گناہ معصوم لوگوں کی آہیں، سسکیاں اور بددعائیں ہوں اور ہر پل چھن جانے اور رسوائی کا خوف الگ۔’’

وہ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے پُرسوچ انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آخری بات پر قدرے ناگواری سے بولا۔

‘‘تم نے زبردستی خود پر خوف سوار کرلیا ہے اور اس سے چھٹکارے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اسی طرح مجھے اپنے حوالے سے دیکھو اور خوش رہو۔’’

‘‘نہیں۔ میں اب اس طرح خوش نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ مجھے اپنی اور زیادہ آپ کی سلامتی خطرے میں نظر آرہی ہے۔’’ وہ اُس سے تنفر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اس کے برعکس جیسے وہ اُس کے لیے بہت اہم ہے اور وہ اُس کے خدشے سے زور سے ہنسا۔

‘‘تم واقعی بے وقوف ہو۔ چلو سو جاؤ۔’’

‘‘مجھے نیند نہیں آتی۔’’ وہ اپنی عاجزی اور آنسوؤں کے رائیگاں جانے پر مایوسی سے بولی تھی۔

‘‘دیکھو! تم جو چاہتی ہو وہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ میں جس گینگ میں شامل ہوں اُسے چھوڑ دینے، یا اُس سے غداری دونوں کی سزا موت ہے اور ان کے ہاتھوں مرنے سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں اور پولیس بھی مجھ سے کوئی وی آئی پی کا سلوک نہیں کرے گی۔ اگر مجھے پھانسی پر نہ لٹکایا تب بھی ساری زندگی کے لیے کال کوٹھڑی میں ضرور ڈال دے گی۔ اب بتاؤ۔ تم میرے لیے کون سی سزا تجویز کرتی ہو۔’’ اُس نے بھیانک پہلو دکھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ تو وہ سہمی ہوئی دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلانے لگی۔

‘‘پھر کیوں ضد کر رہی ہو۔ مت سوچا کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میری سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور تم پر تو میں کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تمہیں کوئی خوف، کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم شہر کے معزز ترین آدمی کی بیوی ہو۔ سمجھیں تم۔’’ آخر میں وہ مسکرایا۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود اثبات میں سر نہیں ہلا سکی تھی۔

اُس کے لیے اب ازہر شیرازی کے جرائم سے سمجھوتا کرنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ اب وہ انسانی جانوں سے کھیلنے لگا تھا۔ اور وہ سمجھ گئی تھی کہ اپنی محبت کے واسطے دے کر بھی اُسے نہیں روک سکتی۔ اور

اُسے چھوڑ دینا بھی آسان نہیں تھا کہ وہ کوئی عام سا شخص نہیں تھا جو اُس کے کنارہ کشی اختیار کرلینے پر اُسے چین سے رہنے دیتا۔ ابھی بھی اُسے لگا جیسے وہ اُس کی طرف سے بہت محتاط ہوگیا ہے۔ گو کہ ظاہر نہیں کرتا تھا لیکن وہ محسوس کر رہی تھی اور اپنی طرف سے اُس کی کوشش ہوتی کہ اُس کے سامنے نارمل رہے لیکن ذہنی انتشار نے اُسے بے حد نڈھال کردیا تھا۔

‘‘سنو، میں تین دن کے لیے ہانگ کانگ جا رہا ہوں۔’’ ازہر شیرازی نے اپنا سیف کھولتے ہوئے اُس کو مطلع کیا تو وہ یونہی گردن موڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ جب وہ سیف بند کرکے پلٹا تو اُسے دیکھتے پا کر پوچھنے لگا۔

‘‘تم چلوگی؟’’ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

‘‘چلی چلو، بہل جاؤ گی۔’’

‘‘نہیں ازہر! میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ شاید ڈلیوری تک میرا یہی حال رہے گا۔ اس کے بعد آپ جہاں کہیں گے چلوں گی۔’’ اُس کے عذر میں شبے کی گنجائش نہیں تھی۔

‘‘پکی بات۔ پھر یہ تو نہیں کہو گی کہ ابھی بچہ چھوٹا ہے۔ بڑا ہو جائے گا تب چلوں گی۔’’ وہ اُس کا عذر مان کر بولا۔ تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

‘‘نہیں پھر میں کوئی بہانا نہیں کروں گی اور ابھی بھی میں بہانا نہیں کر رہی۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کتنی ڈل ہوگئی ہوں میں۔’’

‘‘اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتیں۔’’

‘‘آپ جو اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے میں لاپروا ہوگئی ہوں۔’’ اُس نے غیر جانب داری سے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔

‘‘لیکن میری غیر موجودگی میں تمہیں اپنا خیال خود رکھنا ہے۔ او کے۔’’ اُس نے قریب آکر ہمیشہ کی طرح اُس کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی۔ پھر اپنا بریف کیس اُٹھا کر کمرے سے نکل گیا تو وہ کتنی دیر تک سن سی بیٹھی رہ گئی۔ ملازم نے آکر ابا کے آنے کی اطلاع دی۔ تب وہ چونکی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکل کر آئی تھی۔

‘‘اکیلے آئے ہیں ابا! اماں کو ابھی لے آتے۔’’ وہ ابا کے سینے سے لگتی ہوئی بولی۔

‘‘تمہاری اماں کہہ رہی تھیں۔ تمہیں لے آؤں، چلوگی۔’’ ابا نے اُس کا سر چوم کر پوچھا۔

‘‘ابھی تو نہیں چل سکتی کیونکہ ازہر ابھی باہر گئے ہیں۔’’ وہ اُن کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھی۔

‘‘باہر کہاں؟’’

"ہانگ کانگ۔ آپ بتائیے، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟" وہ مختصر جواب کے ساتھ موضوع بدل گئی۔ "اور سجاد بھائی نے کوئی کاروبار شروع کیا؟"

"نہیں بیٹا! میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔" ابا جیب میں سے لفافہ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے۔ "یہ تم اپنے پیسے لے لو۔ وہی چیک ہے جو ازہر نے دیا تھا۔"

"کیوں ابا؟"

"بس بیٹا! پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں مانتا۔ خدانخواستہ مجھے ازہر کی نیت پر، یا کمائی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ ماشاء اللہ اچھا محنتی لڑکا ہے۔ اخلاق کا بھی اچھا ہے۔ یقیناً اُس نے نیک نیتی سے ہماری مدد کرنی چاہی ہو گی لیکن میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔ سجاد کو بھی میں نے سمجھا لیا ہے۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن محتاج نہیں۔ محنت کر سکتے ہیں پھر کیوں کسی کی مدد قبول کریں۔ میری طرف سے تم ازہر سے معذرت بھی کر لینا اور شکریہ بھی کہہ دینا۔ وہ ناراض تو نہیں ہو گا نا۔"

دھیرے دھیرے بولتے ہوئے ابا نے اُس کا سر تھپک کر پوچھا۔ تو بے اختیار اُس کے ہونٹوں سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہو۔" ابا نے اُس کی آہ کو شدت سے محسوس کیا اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تو اُس کا دل چاہا ازہر کی حقیقت بتا کر اُن سے پوچھے کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن پھر وہی خیال کہ ازہر شیرازی کے مقابلے میں اُس کی طرح ابا بھی کمزور اور مجبور ہیں۔ صرف پریشان ہی ہوں گے اور وہ کیوں انہیں پریشان کرے۔

"میں ٹھیک ہوں ابا۔" وہ اُن کے سینے سے سر اُٹھا کر مسکرائی۔

"اچھا دیکھو، یہ چیک سنبھال کر رکھنا اور یاد سے ازہر کو دے دینا۔ کب تک آئے گا وہ؟"

"تین دن کا کہہ گئے ہیں۔ آپ اماں سے کہہ دیجیے گا ازہر آ جائیں تو میں آؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ اب میں چلوں۔" ابا اُٹھنے لگے تو اُس نے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"نہیں ابا! کھانا کھا کر جایئے گا۔"

"ارے نہیں بیٹا! دیر ہو جائے گی۔ ویسے بھی میں کھانا صرف تمہاری اماں کے ہاتھ کا کھاتا ہوں۔"

ابا سہولت سے منع کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو وہ اُن کے ساتھ چھوٹے برآمدے تک آئی۔ پھر کتنی دیر یونہی برآمدے میں ٹہلتی رہی۔ دل بوجھل ہو رہا تھا اور ذہن میں کوئی اچھی سوچ نہیں تھی۔

ایسے ہی بوجھل دل بوجھل ذہن کے ساتھ اُس نے لاؤنج میں آ کر ابا کا واپس کیا ہوا لفافہ

اُٹھایا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر پرس کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ ازہر کی سیف کے ساتھ لٹکتی چابی دیکھ کر اُس کا دل یک بارگی بڑی زور سے دھڑکا۔ کیونکہ اپنی ذاتی اشیاء کے معاملے میں وہ حد درجہ محتاط تھا۔ جانے آج کیسے بھول گیا تھا۔ اور گو کہ وہ موجود نہیں تھا اس کے باوجود سیف کی طرف بڑھنے کی اُس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کتنی دیر تک گھبرا گھبرا کر وہ کبھی سیف کو دیکھتی اور کبھی دروازے کی طرف کہ کہیں وہ آ تو نہیں رہا اور بمشکل خود کو اُس کے نہ آنے کا یقین دلا کر اُس نے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے لاک کیا۔ اس کے بعد سیف کھولا تھا۔ روپے پیسے، سونا ان سب کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی اور بہت احتیاط سے جتنی بھی فائلیں تھیں سب نکال لیں۔ پھر آرام سے بیڈ پر بیٹھ کر ایک ایک فائل دیکھنے لگی لیکن چند ایگریمنٹس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکی اور جو سمجھ میں آئے وہ بھی کسی مصنوعات کی ایکسپورٹ کے تھے۔ بے حد مایوس ہو کر ساری فائلیں اسی ترتیب سے وہ واپس سیف میں رکھ رہی تھی کہ اندر موجود ایک بٹن پر ہاتھ لگنے سے پچھلی طرف ایک کھڑکی سی کھل گئی اُس نے فوراً ہاتھ ڈال کر اُس کے اندر سے فائل نکال لی اور وہیں گھٹنے ٹیک کر دیکھنے لگی۔

شاید یہ سب بھی اُس کی سمجھ میں نہ آتا اگر جو اُس کے جرائم سے وہ بالکل ہی ناواقف ہوتی۔ پھر اُس روز وہ اپنے گینگ کا ذکر بھی کر چکا تھا اور اس میں شامل کچھ لوگوں کے نام دیکھ کر وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔

"تمہیں کوئی خوف، کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم شہر کے معزز ترین آدمی کی بیوی ہو۔"

ازہر شیرازی کی بازگشت نے اُسے چونکایا تھا۔ اُس نے پھر سے وہ نام دیکھنے شروع کیے جو معززین میں شمار ہوتے تھے اور اس میں ایک ازہر شیرازی کے مقابل کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی، کہاں اتنے لوگ۔"

"قطعی ناممکن۔" اُس نے مایوس ہو کر سوچا، پھر صفحے پلٹنے لگی۔ ایک جگہ خیبر میل لکھا دیکھ کر رُک گئی۔ گو کہ یہ حادثہ گزر چکا تھا لیکن کیونکہ اُس کے علم میں تھا، اس لیے اُس نے پوری تفصیل سے دیکھا کہ اس گھناؤنے جرم میں اور کون کون شامل تھا۔ اس کے بعد کے صفحے پر آنے والی تاریخوں میں ایسا ہی ایک اور پلان درج تھا جس کے تصور نے اُس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ اُس نے فائل بند کر کے اسی جگہ رکھی اور بٹن تلاش کر کے اس حصے کو بند کیا پھر سیف بند کر کے اپنی جگہ پر آئی کیونکہ نئے حادثے کے تصور نے نہ صرف اُسے سہما دیا تھا بلکہ اُس پر لرزہ بھی طاری ہو گیا تھا۔ تکیے میں منہ چھپایا تو ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان، سب دہائیاں دے رہے تھے۔ وہ

بے بسی سے ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو، میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں بہت کمزور ہوں۔ مجبور اور بے بس۔"

"نہیں، ہم تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ ہمارے بچوں کو یتیم کرنے کے جرم میں تم اپنے شوہر کے ساتھ برابر کی شریک ہو، کیونکہ تم بے خبر نہیں ہو۔ سب جانتی ہو۔"

"اُف نہیں۔" وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔

"کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟" کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آوازیں تھیں کہ سماعتوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں میں بال جکڑ کر کتنی دیر وہ اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دیتی رہی۔ پھر ایک دم سے فیصلہ کر کے اُٹھی تھی۔ کمرے سے نکل کر دبے پاؤں لابی میں آئی اور ڈائریکٹری اُٹھا کر ایک نمبر تلاش کیا جسے ڈائل کرتے ہوئے نہ صرف اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں بلکہ پیروں تلے سے زمین بھی کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ انتظار کے چند لمحوں ہی میں وہ پوری پسینے میں نہا گئی جب کہ حلق خشک ہو گیا تھا۔

"ہیلو پولیس اسٹیشن۔" اُس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی اور دوسری طرف سے جانے تصدیق ہوئی تھی، یا تردید۔ اس سے پہلے ہی ایک مضبوط ہاتھ نے بڑے آرام سے اُس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔

"کون؟" وہ حواس باختہ سی پلٹی اور ازہر شیرازی کو دیکھ کر اُس کی رُوح فنا ہو گئی۔

"کیا اوقات تھی تمہاری۔ ہزار دو ہزار کی نوکری کے لیے خواری ہوتی پھر رہی تھیں۔ میں نے فرش سے اُٹھا کر عرش پر لا بٹھایا تمہیں اور تم۔"

کس قدر سفاک ظالم نظر آ رہا تھا وہ جیسے ابھی اُس کے چیتھڑے اُڑا دے گا۔

"مم۔ میں۔" وہ صفائی پیش کرنے لگی تھی کہ اُس کے زور دار تھپڑ سے دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرتے ہی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

جب اُسے ہوش آیا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ کتنی دیر چھت پر نظریں جمائے وہ بس یہی سوچتی رہی کہ اُسے کیا ہوا ہے۔ دھیرے دھیرے جہاں ذہن بیدار ہوا وہاں نظروں نے زاویہ بدلتے ہی ازہر شیرازی کو دیکھا۔ وہ بڑے آرام دہ انداز میں صوفے پر بیٹھا سگار کا دھواں اُڑاتا ہوا غالباً اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر بھی فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس نہیں آیا بلکہ اطمینان سے سگار بجھانے کے بعد اُس کے پیروں کی طرف آ کھڑا ہوا اور براہ راست اُس کے چہرے پر نظریں جما کر

کہنے لگا۔

"میں نے صرف دو باتیں سیکھی ہیں۔ وفاداری کے بدلے وفاداری اور غداری کی سزا موت۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ورنہ رات ہی تمہیں شوٹ کر دیتا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے ائیرپورٹ پر ہی یاد آ گیا تھا کہ میں سیف کی چابی اُس کے ساتھ چھوڑ آیا ہوں اور میں اسی وقت لوٹ آیا تھا۔ پھر کمرے کا دروازہ لاک دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ تم اپنے تجسس کو دبا نہیں سکیں۔ گو کہ میرے پاس ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی اور چاہتا تو دستک دے کر دروازہ کھلوا سکتا تھا لیکن میں تمہارا ردِّعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ بخدا یہ تو میں نے گمان بھی نہیں کیا کہ تم میرے خلاف اسٹینڈ بھی لے سکتی ہو اور یہ تمہاری غداری کا واضح ثبوت ہے۔ ہوں۔"

آخر میں وہ پُرسوچ انداز میں ہوں کی آواز نکال کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اسی انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس آ بیٹھا اور شہادت کی اُنگلی اُس کی ٹھوڑی پر جما کر اُس کا چہرہ اپنی طرف موڑتا ہوا بولا۔

"اُس روز جب تم نے کہا تھا کہ تم مجھے کھونا نہیں چاہتیں۔ تب بھی تم ان سب باتوں سے واقف تھیں اور تمہارے اندر ان ساری باتوں سے زیادہ مجھے کھونے کا خوف تھا جس سے میں تمہاری محبت کا یقین کر کے اطمینان سے ہو گیا تھا اور میرا یقین غلط نہیں تھا۔ تمہیں مجھ سے محبت تھی نا۔"

اُس کی آنکھیں یک بارگی پانیوں سے بھر گئیں اور قطرہ قطرہ کناروں سے چھلکنے لگا تھا جسے دیکھ کر وہ زہر خند سے بولا۔

"نہیں، اب میں تمہارا اعتبار کر کے اپنے لیے کال کوٹھڑی نہیں خرید سکتا۔ یہ کال کوٹھڑی اب تمہارا نصیب ہے۔ آج سے تمہارے لیے سارے راستے بند ہو گئے۔ تم کہیں جاؤ گی نہ کوئی تمہارے پاس آئے گا۔ البتہ اس گھر میں تم آزاد ہو۔ یہ رعایت میں اس لیے دے رہا ہوں کہ میں ابھی بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ زندہ انسانوں کی طرح اور میرے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تم پھر کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا جس سے میں سچ مچ تمہیں کال کوٹھڑی میں ڈال کر بھول جاؤں۔ یہ میری تمہیں آخری وارننگ ہے۔ انڈرسٹینڈ۔"

اُس کے سخت تنبیہی لہجے پر اُسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تکیے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ تو وہ فوراً تکیہ کھینچتا ہوا بولا۔

"تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا۔ زندہ انسانوں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں میں تمہیں۔ فوراً

اُٹھ جاؤ اور پانچ منٹ میں منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ روم میں آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ جس تیزی سے کمرے سے نکلا وہ بھی اُسی تیزی سے اُٹھی اور پانچ منٹ سے پہلے ہی اُس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے نا۔ ان دنوں تمہیں ایکسٹرا ڈائیٹ کی ضرورت ہے۔''

اُس کے بیٹھتے ہی وہ جوس کا گلاس اُس کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ اندر ہی اندر حیران ہوتی رہی۔ اتنی جلدی کیسے بدل جاتا ہے۔

''سر! اے ایس پی احمد کمال آئے ہیں۔'' ملازم نے آ کر اطلاع دی تو اُس کے حلق میں جوس اٹک گیا۔ گلاس ایک طرف کر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔

''بٹھاؤ انہیں۔'' وہ ملازم سے کہہ کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا اور آہستہ سے اُس کی پیٹھ سہلا کر پوچھنے لگا۔ ''اچھا نہیں لگ رہا۔''

''مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی اور حقیقتاً اُس سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔

''چلو میرے ہاتھ سے پیو، اچھا لگے گا۔'' اُس نے گلاس لے کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا تو وہ مجبوراً گھونٹ گھونٹ پینے لگی اور بہت محتاط نظروں سے اُس کے چہرے پر اے ایس پی کی آمد کا کوئی تاثر ڈھونڈنے کے ساتھ اندر ہی اندر اُلجھنے بھی لگی کہ وہ تو اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی تھی پھر۔

''گویا تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلانا پلانا بھی میری ڈیوٹی میں شامل ہو گیا۔ نو پرابلم۔''

وہ خالی گلاس ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر ڈائننگ روم سے نکل کر سیدھا ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں انتظار میں بیٹھے اے ایس پی کو دیکھ کر وہ واقعی گھبرا گئی اور بے اختیار اُس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت یوں مضبوط کی جیسے اُسے کہیں نہیں جانے دے گی۔

''السلام علیکم۔'' اے ایس پی کے سلام کا جواب اشارے سے دے کر وہ اُسے اپنے ساتھ بٹھاتا ہوا پوچھنے لگا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

''پہلے تو معذرت چاہوں گا کہ بغیر اپائنٹمنٹ لیے چلا آیا۔ ویسے میں پچھلے ایک گھنٹے سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن آپ کا ٹیلی فون شاید خراب ہے۔''

اے ایس پی کے عاجزانہ انداز پر اُس نے پہلی بار براہ راست اُسے دیکھا تو اُس کے ذہن میں جھماکا ہوا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے اور پھر فوراً یاد آیا۔ اُس رات جب ازہر یہاں نہیں تھا۔

''ہوں، ٹیلی فون اکثر خراب رہتا ہے۔ آئندہ ملنا ہو تو مجھے آفس میں فون کر لینا۔'' ازہر خاصی

بے نیازی دکھا رہا تھا۔

''شکریہ سر۔ میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ میری پروموشن رُکی ہوئی ہے۔ آپ اگر آئی جی صاحب کو ایک فون کر دیں تو............''

''ہوں۔'' وہ کچھ دیر پُرسوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگا۔ ''کل تین بجے مجھے آفس میں فون کر کے یاد دلا دینا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔''

''تھینک یو سر! تھینک یو ویری مچ۔'' ایس پی ممنونیت کا اظہار کرتا ہوا کھڑا ہوا تو اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی روشن آنکھوں میں جانے کیسی چمک تھی۔ وہ فوراً نظروں کا زاویہ بدل گئی اور اندر ہی اندر کڑھنے لگی تھی کہ وہ کسے مدد کو پکار رہی تھی۔ ایسے ہی کسی شخص کو جو محافظ ہو کر بھی لٹیرے کے سامنے سر اُٹھا کر بات نہیں کر سکتا۔

''تم کیا سوچنے لگیں؟'' اُس کے جانے کے بعد ازہر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بُری طرح چونکی۔

''آہاں، کچھ نہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ اگر یہ ایس پی تمہارے بلانے پر آیا ہوتا تو تم اُسے میرے بارے میں کیا بتاتیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے پولیس اسٹیشن فون نہیں کیا تھا۔ مجھے صرف بیس تاریخ کو ہونے والی دہشت گردی کی اطلاع دینی تھی تاکہ وہ اُسے روک سکیں۔ آپ کو تو شاید میں کبھی بھی بے نقاب نہیں کر سکوں گی۔'' وہ سر جھکا کر دُکھ سے بولی۔

''اگر تمہیں موقع ملے تب بھی نہیں؟'' وہ بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔

''تب بھی نہیں۔''

''کیوں؟''

''آپ یقین نہیں کریں گے لیکن سچ یہی ہے کہ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ اس کے ساتھ کھونے کے خوف سے بھی چھٹکارا پانا چاہتی ہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ............''

اُس نے آس بھری نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر اُس کا کندھا تھپک کر بولا۔

''جاؤ تم آرام کرو۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔'' وہ سمجھ گئی۔ اس سلسلے میں وہ مزید کوئی بات نہیں سنے گا۔ اس لیے مایوس سی ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے تک گئی تھی کہ اچانک پلٹ کر بولی۔

''وہ کل ابا آئے تھے۔ وہ چیک دے گئے ہیں جو آپ نے سجاد بھائی کو دیا تھا۔''

''کیوں۔'' اُس نے غالباً اسے اپنی توہین سمجھا، جب ہی ناگواری سے دیکھا۔ تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر بولی۔

''کہہ رہے تھے، انہیں مناسب نہیں لگا۔ یعنی آپ سے پیسے لینا۔''

''میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ غریب آدمی چاہتا کیا ہے۔ دو تو لیتا نہیں اور نہ دو تو روتا ہے۔ بہرحال اس گھر میں اتنے ملازم ہیں تم وہ چیک اپنی مرضی سے جسے چاہو دے دو کیونکہ میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔''

اُس کے تنفر اور تفاخر پر وہ ہونٹ بھینچ کر کمرے سے نکل گئی۔

پھر کتنے دن گزر گئے گو کہ ازہر نے اُس روز کے بعد سے اُس کے اسٹینڈ لینے کو دہرایا تھا نہ جتایا تھا بلکہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہی محبت، ویسے ہی اُس کا خیال رکھنا۔ البتہ اس پر سے پابندی نہیں ہٹائی تھی۔ یعنی وہ اماں، ابا تک سے نہیں مل سکتی تھی۔ ٹیلی فون تو اُسی روز اُس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ڈس کینکٹ کروا دیا تھا جس پر وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ گھبرانے لگی۔ اتنا بڑا گھر بھی اُسے کال کوٹھڑی لگنے لگا تھا کیونکہ مقید ہونے کا احساس باقی تمام احساسات پر حاوی ہو گیا تھا۔ کاش اُس روز وہ ابا کو ہی ساری حقیقت بتا دیتی تو مایوسیوں میں ایک مبہم سی آس کا سہارا ہوتا، اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک مہینے سے بھی کچھ دن اُوپر ہو گئے تھے۔ اس دوران ازہر دوبارہ ملک سے باہر گیا تھا لیکن اُسے کچھ فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ وہ ابا کے گھر اپنی خیریت تک کا پیغام بھجوانے سے قاصر تھی اور اُدھر سے پتا نہیں اس عرصے میں کوئی آیا ہی نہیں تھا، یا باہر ہی سے لوٹا دیا گیا تھا۔ ایک بار اُس نے ملازم سے پوچھا تو اس کا جواب تھا۔

''معاف کیجیے گا بیگم صاحبہ! ہمیں آپ کی کسی بات کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے۔''

اور اس جواب کے بعد اُس کے اندر اگر کسی ملازم کو اعتماد میں لینے کا خیال آیا بھی تو اُس نے ذرا جھٹک دیا تھا۔ پھر اُس نے کوشش کی کہ خود کو مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے لیکن اس میں بھی اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ تو اُس روز بہت سوچ کر اُس سے کہنے لگی۔

''ازہر! میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کو اگر کوئی خدشہ ہے تو آپ خود۔''

''نہیں۔'' اُس نے پوری بات ہی نہیں سنی۔ ''مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ بڑی بڑی حیثیتوں

والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور تمہارے گھر والوں کی تو سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔''

''پھر آپ نے مجھے قید کیوں کر رکھا ہے؟'' وہ اندر ہی اندر تلملا گئی تھی لیکن فخریہ لہجہ نہیں چھپا سکی۔ جسے محسوس کر کے بھی وہ آرام سے بولا۔

''یہ تمہاری غداری کی سزا ہے جس میں، میں نے پہلے ہی رعایت کر دی ہے۔ مزید کسی رعایت کی گنجائش نہیں۔''

''آپ اپنے گینگ کے اُصول مجھ پر کیوں آزما رہے ہیں۔ میں آپ کے گینگ میں شامل نہیں ہوں۔''

''بدقسمتی سے تم شامل ہو۔ حالانکہ میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میری زندگی کی شریک کو میرے بزنس کی ذرا سی بھی سن گن ملے لیکن اوّلین شب ہی تم پر میری حقیقت آشکار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد تم لاکھ انکار کرو، میرے ہر فعل میں میری شریک سمجھی جاؤ گی۔''

''نہیں نہیں ازہر! آپ بے شک اپنے سارے اُصول مجھ پر آزما لیں لیکن مجھے اپنے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی قتل نہیں کیا۔ صرف جاننے کی بنیاد پر آپ مجھے قاتل نہیں کہہ سکتے۔''

وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی تھی۔

''اوکم آن شامہ!'' اُس نے اُسے قریب کرنے کے لیے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن وہ اُس کا ہاتھ جھٹک کر بیڈ سے اُتر گئی۔

''مت چھوئیں مجھے۔ مت محبت جتائیں۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ تو کچھ دیر خاموشی سے دیکھنے کے بعد وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آ کر بولا۔

''ریلیکس شام، پلیز ریلیکس۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ تم صرف میری زندگی کی شریک ہو اور بس۔ باقی کسی معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔''

''میرا آپ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، مجھے آزاد کر دیں۔'' وہ اچانک اُس سے بہت متنفر ہو گئی تھی۔

''آزاد کر دوں تمہیں؟'' وہ اُسے کندھوں سے تھام کر بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ ''کیا کہا تم نے۔ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔''

''نہیں۔ مجھے وحشت ہونے لگی ہے اور خود اپنے آپ سے بھی نفرت۔ اگر آپ مجھے آزاد نہیں کریں گے تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔''

’’شٹ اپ شامہ! بند کرو یہ ڈائیلاگ بازی اور شکر کرو، میں نے تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں دی۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، پہننے اوڑھنے میں آزاد ہو تم۔ ایک صرف پَر ہی کاٹے ہیں تمہارے۔‘‘ وہ سرد لہجے میں کہتا ہوا اُسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ تو وہ بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اوّل روز سے وہ اُس کے مقابلے میں خود کو کم تر اور کمزور سمجھتی رہی تھی اور یہ خیال اُس کے اندر جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ابھی بھی اُس کا کچھ بگاڑنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ بس اُس کی دنیا سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن وہ اب کہاں اُس پر اعتبار کر سکتا تھا۔ اُسے خود سے حد درجہ متنفر دیکھ کر بھی وہ اُسے آزادی کا پروانہ نہیں تھما سکتا تھا۔ اُس کے نزدیک ایسی حماقت کا مطلب خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا۔ بے شک اُس کے مقابلے میں وہ بہت کمزور تھی لیکن جذباتی ہو کر کوئی بھی قدم اُٹھا سکتی تھی۔ اس لیے اُس کے پَر کاٹنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور اس سونے کے پنجرے میں مقید ہو کر کتنے دن تو اُس نے بس رونے میں گزار دیئے تھے۔ اماں ابا، بہن بھائی یاد آتے پھر یہ خیال کہ اب وہ انہیں کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اُس کے آنسو اور روانی سے بہنے لگتے اور آنسو بھی کب تک ساتھ دیتے، بالآخر خشک ہو گئے۔

’’تھینکس گاڈ! تمہارے اندر کا سمندر خشک ہوا۔‘‘ وہ جو بہت دنوں سے اُسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُس روز اُس کی خشک آنکھیں دیکھ کر کہنے لگا۔ ’’تم نے آنسوؤں سے پکی دوستی کر لی تھی لیکن دیکھ لو وہ بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئے اور اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس قفس میں ایک میں ہی ہوں جو آخری سانسوں تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔‘‘

’’میری آخری سانسوں تک۔‘‘ وہ یوں بولی جیسے بس گنتی کی سانسیں رہ گئی ہوں۔

’’نہ، نہ۔ مایوسی اچھی چیز نہیں ہے شام! لمبی عمر جینا ہے تمہیں۔ خوش رہا کرو تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔‘‘

وہ لگاوٹ کا اظہار کر کے شاید اُسے بہلانا چاہتا تھا لیکن وہ منہ موڑ کر اُس کے پاس سے ہٹ کر گلاس وال کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ سورج کی الوداعی کرنیں اُونچے پیڑوں کے سروں کو چوم رہی تھیں اور درختوں سے ذرا اُوپر ایک چیل پَر پھیلائے مسلسل ایک ہی دائرے میں گھوم رہی تھی، شاید کسی پیڑ پر اُس کا گھونسلا تھا وہ اُسے دیکھ رہی تھی کہ نظروں کے سامنے چھوٹا سا آسٹریلوی طوطا آ گیا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ ہو گئی جو اُڑتا ہوا لان چیئر پر آ بیٹھا تھا۔ پتا نہیں تھک گیا تھا، یا چیل سے خوفزدہ تھا۔

’’واؤ، طوطا!‘‘ عقب سے ازہر کی آواز پر وہ چونکی ضرور لیکن اُس کی طرف گردن نہیں موڑی۔

اور چند لمحوں بعد وہ اُسے طوطے کی طرف بڑھتا نظر آیا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پھر اِدھر اُس نے جھپٹ کر طوطے کو پکڑا، اُدھر اُس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی کیونکہ وہ اس پرندے کے پَر کٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

’’شام!‘‘ کافی دیر بعد وہ طوطے کو پنجرے میں ڈال کر لے آیا۔ ’’دیکھو کتنا خوب صورت طوطا ہے۔ اِسے یہاں لٹکا دوں؟‘‘

وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ دیکھتی رہی۔ تو اُس نے ایک کھڑکی کھول کر پنجرے کو وہاں لٹکایا۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا۔

’’اس پر بھروسا نہیں کرنا، یہ کبھی وفادار نہیں ہوتا۔‘‘ وہ ابھی بھی کچھ نہیں بولی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پنجرے کے پاس آ کر طوطے کو دیکھنے لگی۔ وہ ننھا سا پرندہ مقید ہو کر آزردہ لگ رہا تھا، یا شاید اُسے محسوس ہوا۔

’’اچھا سنو۔‘‘ ازہر نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ’’میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم کھانا اپنے وقت پر کھا لینا۔ او کے۔‘‘

اُس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا۔ اور اُس کے جانے کے بعد طوطے کو دیکھ کر بولی۔

’’تو میاں مٹھو! تم بھی قید ہو گئے۔ تم نے کسی کے ساتھ غداری کی تھی۔ ہاں؟‘‘

’’نہیں نہیں۔‘‘ طوطا اِدھر سے اُدھر پنجرے کی دیواروں سے ٹکرانے لگا اور کوئی راستہ نہ پا کر مایوسی سے بیٹھ گیا تو اُسے اس پر بے طرح رحم آیا۔ پنجرہ گھما کر اُس کا دروازہ اپنی طرف کیا اور اس میں پھنسی سلائی نکالنے کی سعی کرتے ہوئے اُس کا ذہن کہیں پیچھے بھٹک گیا تھا۔

’’دادی! پرندے اُڑتے کیسے ہیں۔‘‘

’’اللہ نے انہیں پَر دیئے پھر اُڑنا سیکھا تو وہ اُڑتے ہیں۔‘‘

’’اور جو پنجرے میں بند ہوتے ہیں انہیں اُڑنا نہیں آتا۔‘‘

’’آتا ہے لیکن اپنی غفلت کی وجہ سے پنجرے میں بند ہو جاتے ہیں۔‘‘

’’غفلت؟‘‘ وہ کہاں سمجھ سکتی تھی۔

’’ہاں بیٹا! جو پرندے اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں وہ قید کر لیے جاتے ہیں۔ اُن کی آزادی چھن جاتی ہے۔‘‘

دادی نے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اُسے سمجھنے میں کتنی دیر لگی تھی۔ پنجرے کا دروازہ کھولنے کی سعی ترک کر کے اُس نے مایوس بیٹھے طوطے کو دیکھا اور گہری

سانس کھینچ کر بولی۔

"ابھی نہیں میاں مٹھو! پہلے ہم اپنی غفلت کی سزا کاٹیں گے پھر آزاد ہوں گے۔" اُس نے پنجرہ چھوڑ کر واش روم کا رُخ کیا اور وضو کر کے نکلی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

وہ جب تک خودفریبی میں مبتلا تھی تو یہ سوچ کر خوش تھی کہ اللہ کو اُس کی کوئی بات، کوئی عمل پسند آیا ہے جو اُسے اُس کی خواہشوں سے بڑھ کر نواز رہا ہے لیکن اب خودفریبی سے نکل کر وہ اپنی طویل غفلت سے تائب ہو کر جب اللہ سے رُجوع کر رہی تھی تو اُسے لگا جیسے اُس کا کوئی عمل پسندیدگی کی سند حاصل کر کے اُسے یہاں کسی خاص مقصد سے لایا تھا۔ جب ہی تو اوّلین شب ہی اُس پر ساری حقیقت آشکار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد آسائشوں کی چکاچوند بھی زیادہ عرصہ تک اُسے نہیں بہلا سکی تھی۔ بہرحال اب اگر وہ مطمئن نہیں تھی تو ہر وقت کڑھتی بھی نہیں رہتی تھی۔ اس کے برعکس اپنے ذہن کو پُرسکون رکھ کر حالات کو سمجھنے اور پھر اُن سے نمٹنے کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ جب کہ ازہر پر یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اُس نے ان ہی حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ اور وہ خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہے۔ اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب تھی جب ہی تو اُس روز وہ کچھ مہربان ہو گیا تھا۔

"چلو تمہیں شاپنگ کرا دوں اور کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔" اُسے بالکل یقین نہیں آیا کہ جو کچھ اُس نے سنا، وہ سچ ہے، یا اُس کی سماعتوں کا فریب۔

"باہر...... میں۔"

"کیوں کیا پہلے میں تمہیں اپنے ساتھ باہر نہیں لے جاتا رہا۔ جاؤ جلدی سے تیار ہو کر آؤ اور یہ ملانیوں والا اتنا بڑا دوپٹہ مت اوڑھ لینا۔" وہ اس وقت عصر کی نماز سے فارغ ہوئی تھی پورا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ وہ اُسے کھینچ کر بولا۔ تو اُس نے اپنی حیرت اور بے یقینی کے باعث مزید کچھ نہیں کہا اور عجلت بھی نہیں دکھائی۔ خاصے نارمل انداز میں اپنے کمرے کا رُخ کیا تھا۔

اُس کے اندر اب شاپنگ کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن اُس کا موڈ خراب ہونے کے ڈر سے پہلے کی طرح ہر اُس چیز میں دلچسپی ظاہر کرتی رہی جو وہ اُس کے لیے پسند کر رہا تھا۔ اور اس دوران کئی بار اُس کا دل چاہا اُس سے کہے کچھ دیر کے لیے اماں کے گھر چلے۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دباتی رہی کیونکہ یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر اُس نے صاف منع کر دیا تو پھر کبھی اس طرح بھی مہربان نہیں ہو گا۔ جب کہ اب ایک آس سی بندھ گئی تھی کہ آج یہاں لے آیا ہے تو کسی دن خود سے اماں کے گھر بھی لے جائے گا۔

"ہاں تو آج کیا تاریخ ہے؟" شاپنگ کے بعد فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے سے ریزرو ٹیبل پر رکھی موم بتی جلاتے ہوئے ازہر نے اُس سے پوچھا۔ تو اُس کا دل چاہا کہے کہ اُسے اب دن یاد رہتے ہیں نہ تاریخیں۔ لیکن اتفاق سے اس کے موم بتی جلانے پر اچانک اُسے یاد آ گیا تھا۔

"آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔"

"ارے! تمہیں یاد ہے۔" وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر اُسے دیکھنے لگا۔

"کیوں مجھے یاد کیوں نہیں ہو گی؟"

"وہ۔ اصل میں...... خیر چھوڑو۔" وہ غالباً اُس کی سردمہری اور خود سے گریز جتانا چاہتا تھا لیکن خود ہی موضوع بدل گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں اس بار تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں اور تمہاری ڈیلیوری وہیں ہو تا کہ بچہ وہی کی نیشنلٹی لے کر پیدا ہو۔"

"لیکن ابھی تو بہت وقت ہے۔" وہ صاف منع نہیں کر سکی۔ تو مہینوں کا حساب بتا کر پوچھنے لگی۔

"چار پانچ مہینے، کیا آپ کو اتنے عرصے کے لیے جانا ہے!"

"نہیں۔ میں تو وہی ہفتہ دس دن میں لوٹ آؤں گا۔" اُس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"پھر نہیں ازہر! میں اکیلی کہیں نہیں رہوں گی۔ جہاں بھی جاؤں گی آپ کے ساتھ اور ابھی بھی آپ کے ساتھ ہی آؤں گی۔"

"یہاں بھی تو میرے بغیر رہتی ہو۔"

"یہ تو اپنا ملک ہے، اپنا گھر ہے۔ پھر ہفتہ دس دن میں آپ واپس بھی آ جاتے ہیں۔" اُس کے حتمی انداز پر وہ کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"چلو پھر میں چار مہینے بعد تمہیں لے جاؤں گا۔ تم خود کو اس بات کے لیے تیار رکھنا کہ۔" ویٹر کے مخاطب کرنے سے وہ بات ادھوری چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر دیکھنے کے بعد کچھ عجلت میں اُس سے بولا۔

"ایک منٹ، میں ابھی آتا ہوں۔" اُس نے خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر جلتی ہوئی موم بتی پر نظریں جمائیں تو اُسے لگا جیسے یہ اُس کی شادی کی پہلی ہی نہیں آخری سالگرہ بھی ہے۔ اور یہ خاصا تکلیف دہ احساس تھا۔

"کاش ازہر شیرازی! تم ایسے نہ ہوتے۔" اُس نے دُکھ سے سوچا اور پھونک مار کر موم بتی بجھا دی۔ تب ہی عقب سے کسی نے پوچھا۔

''آپ اکیلی ہیں۔'' اُس نے چونک کر دیکھا، وہ ایس پی احمد کمال تھا اور جواب دینے کے بجائے اُس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

''کیوں؟''

''آپ تو بُرا مان گئیں۔ میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ سوری۔'' وہ آگے بڑھ گیا تو وہ سر جھٹک کر دوسری سمت دیکھنے لگی تھی کہ اس پل ازہر آ گیا۔

''سوری یار! تم بور تو نہیں ہوئیں؟'' اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ احمد کمال اُس کی آواز سن کر واپس پلٹ رہا تھا۔

''السلام علیکم سر۔'' اُس کی ایسی خوشامد پر ہی وہ مایوس اور بددل ہوگئی تھی۔

''کیسے ہو احمد کمال! اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ازہر کا انداز بے حد سرسری تھا۔

''ٹھیک ہوں سر! یہاں میری ڈیوٹی ہے۔ وہ کینیڈا سے ایک وفد آیا ہوا ہے۔''

''اچھا اچھا اور تمہاری پرموشن ہوگئی تھی؟''

''یس سر! آپ کی مہربانی سے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو۔''

''وردی پہن کر بھی اُلو کا پٹھا بنا ہوا ہے۔'' وہ مسلسل تپ رہی تھی۔

''او کے سر! میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' اُس نے شاید ازہر کے بلانے پر کہا تھا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ تو وہ کھانے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''چلیں شروع کریں ازہر! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

اور کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی جب تک وہ وہاں بیٹھی اُسے لگا جیسے احمد کمال کہیں آس پاس موجود ہے اور مسلسل اُسے دیکھ رہا ہے۔ پتا نہیں یہ اُس کا وہم تھا، یا واقعی وہ موجود تھا۔ وہ اگر اندر سے خائف نہ ہوتی تو ضرور کھوجتی۔ البتہ اُلجھ ضرور گئی تھی۔ گھر آ کر بھی بار بار اُس کا خیال آ رہا تھا۔ تب وہ وضو کر کے عشاء کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

ان دنوں اُس کی ساری دعائیں ازہر کے لیے ہوتی تھیں کہ اللہ اُسے بُرے کاموں سے نکال کر اچھا انسان بنا دے۔ کیونکہ بہرحال وہ اُس کا شوہر تھا اور اُس کے ہونے والے بچے کا باپ۔ لیکن اس کے جرائم کی فہرست اتنی طویل تھی کہ خود اُسے معافی سے پہلے طویل پل صراط سے گزرنا تھا۔ یہ وہ بھی جانتی تھی پھر بھی نماز کے بعد جب ہاتھ پھیلاتی یہی دعا مانگتی کہ وہ اچھا انسان بن جائے۔ اس وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی جگہ پر آ کر لیٹی تو وہ قدرے معنی خیز انداز میں پوچھنے لگا۔

''میرے لیے بھی کچھ مانگتی ہو یا............؟''

''میری ساری دعائیں آپ کے لیے ہوتی ہیں۔'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''واقعی کیا مانگتی ہو میرے لیے؟'' اُس کا انداز ایسا تھا جیسے میرے پاس تو سب کچھ ہے۔

''یہی کہ آپ بُرے کاموں کو چھوڑ کر اچھے انسان بن جائیں۔'' اُس نے سادگی سے بتایا۔ تو وہ زور سے ہنسا اور دیر تک ہنسنے کے بعد کہنے لگا۔

''بُرے کاموں کو چھوڑ کر اچھا انسان بن جاؤں۔ تم نے تو ایک ہی جملے میں بات کہہ کر کتنی آسانی سے دو الگ راستوں کو ساتھ ملا دیا۔ اتنا بھی نہیں جانتیں کہ اچھائی سے بُرائی کی طرف جانے میں ایک پل لگتا ہے جب کہ بُرائی سے اچھائی تک کا سفر بے حد کٹھن ہے۔ تم اگر مجھے یہ گارنٹی دو کہ میری باقی زندگی آرام سے گزرے گی تو میں اسی وقت وعدہ کر لوں گا کہ آئندہ کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ دے سکتی ہو گارنٹی؟'' وہ نظریں چرا گئی۔

''نہیں دے سکتیں۔ پھر کیوں ایسی دعائیں مانگتی ہو جو اگر قبول ہوگئیں تب بھی میرے لیے سخت آزمائش بن جائیں گی۔'' وہ اچانک تلخ ہوگیا تھا۔

''یہاں کی آزمائشیں آپ کو سخت لگ رہی ہیں اور جو اللہ کے ہاں۔''

''بس کرو، میں یہ سب نہیں سننا چاہتا۔'' اُس نے فوراً ٹوک دیا۔ ''مجھ پر تمہاری کوئی بات اثر نہیں کرے گی، کیونکہ میں دنیا کا چلن دیکھ رہا ہوں۔ یہاں اُسی شخص کی جان و آبرو محفوظ ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ خواہ کسی بھی طریقے سے کمایا گیا ہو، بس پیسہ ہو۔ جائز ناجائز کے چکر میں پڑنے والے خود گھن چکر بنے رہتے ہیں۔''

''لیکن اُن کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ لاکھ پریشان سہی اندر سے مطمئن رہتے ہیں۔'' وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''تم سے کس نے کہا کہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے، یا میں اندر سے غیر مطمئن ہوں۔''

''چوری اور سینہ زوری۔'' وہ سمجھ گئی۔ اُس پر کوئی بات اثر نہیں کرے گی۔ اس لیے خاموش ہو رہی۔ تو وہ اُس کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر بولا۔

''چلو یہ تو معلوم ہوگیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے جب ہی تو میرے لیے پریشان رہتی ہو لیکن میں تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا؟'' وہ قصداً ذرا سا مسکرائی اور اُس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

پھر تیسرے دن جب وہ امریکہ جانے کی تیاری کر رہا تھا تب اُس کا بہت دل چاہا کہ اُسے وہ

اماں کے گھر چھوڑ دے، یا اُس کی تنہائی کے خیال سے پہلے کی طرح کرن کو بلانے کو کہے لیکن وہ اس طرف آ ہی نہیں رہا تھا۔ بس وہی باتیں اپنا خیال رکھنا۔ کھانا وقت پر کھانا اور میڈیسن بھی ضرور لینا وغیرہ وغیرہ۔ تب وہ اُکتا کر بولی۔

''کھانا، دوائیں۔ میرے اکیلے پن کا کوئی احساس نہیں؟''

''کیوں نہیں۔ تمہارا خیال کر کے ہی تو ہفتہ دس دن میں لوٹ آتا ہوں۔ ورنہ جب تم نہیں تھیں تو سال میں چھ مہینے میں باہر ہی رہتا تھا۔''

''پھر بھی میں بہت بور ہو جاتی ہوں۔ کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔'' اُس نے بڑی آس سے دیکھا لیکن اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

''سوری، تمہارا یہ مسئلہ میں حل نہیں کر سکتا۔ البتہ کوشش کروں گا، جلدی لوٹ آؤں۔ او کے۔''
وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے جب ہی جتا دیا اُسے اکیلے ہی رہنا ہے۔

اور یہ سزا تو وہ کب سے بھگت رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد کتنی دیر تک سوچتی رہی کہ اُس کا کیا ہوگا۔ کب تک بے بسی کی زندگی جیے گی۔ آخر وہ اُس کا اعتبار کیوں نہیں کر لیتا کہ وہ دوبارہ کبھی اسٹینڈ نہیں لے سکتی۔ لے بھی تو اُسے کیا فرق پڑتا ہے۔ محافظ تو وہی ہیں جو اُس کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں۔ پھر وہ کس سے خائف ہے۔ ایسے ہی پراگندہ ذہن کے ساتھ اُس نے رات کا کھانا زہر مار کیا۔ پھر اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ ملازم لال دین سامنے آ کر بولا۔

''بیگم صاحبہ، میری بچی ابھی تک ہسپتال میں ہے۔ میں غریب آدمی ہوں، شاید اس لیے ڈاکٹر توجہ نہیں دے رہے۔''

''کیا ہوا ہے تمہاری بچی کو؟'' اُسے فوری یاد نہیں آیا تھا۔

''وہ جی ٹرین کے حادثے میں زخمی ہوئی تھی۔'' لال دین کے بتانے پر یاد آتے ہی وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ہاں، وہ خیبر میل میں تمہارے گھر والے تھے نا باقی سب ٹھیک ہیں؟''

''نہیں جی، سب ختم ہو گئے بس ایک بچی۔''

لال دین رونے لگا تو وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ تسلی کا نہیں کہہ سکی اور مجرمانہ احساس میں گھر کر اُسے وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے اپنے کمرے میں آئی اور پرس کھول کر پیسے نکالنے لگی تھی کہ وہ لفافہ ہاتھ آ گیا جس میں ازہر کا دیا ہوا چیک ابا واپس کر گئے تھے جس پر وہ تنفر اور تفاخر سے بولا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی ملازم کو دے دے کیونکہ وہ دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔ اس کے بعد پھر

اُس نے اُس کے بارے میں پوچھا تک نہیں تھا اور اُسے بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اب ہاتھ آیا تو لگا جیسے وہ لال دین کے لیے ہی تھا۔ گو کہ اس سے وہ اپنے بال بچوں کو واپس نہیں لا سکتا تھا لیکن ازہر شیرازی کے گناہوں میں شاید تھوڑی سی کمی ہو جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لفافہ لے کر لال دین کے پاس آئی اور اُسے تھما کر بولی۔

''اسے صبح ہی کیش کرا لینا اور اپنی بچی کو کسی اچھے ہسپتال میں داخل کراؤ۔''

''شکریہ بیگم صاحب! اللہ آپ کو خوش رکھے۔'' لال دین دعائیں دے رہا تھا۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔ اگر اس شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس کے بیوی بچوں کا قاتل اس کا شوہر ہے تو دعاؤں کے بجائے اس کے ہونٹوں سے بددعاؤں اور کوسنوں کی جھڑی لگ جائے گی۔ وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تو اس کے اندر پھر وہی چیخ و پکار تھی۔ کتنی دیر تک اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی پھر وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو دل کا غبار قطرہ قطرہ آنکھوں سے ٹپکنے لگا تھا۔

نماز ختم کر کے بھی وہ جانماز سے نہیں اُٹھی۔ جیسے یہ واحد پناہ گاہ تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اُس نے اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی تھی اور بہت دھیرے دھیرے دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اُسے کچھ احساس نہیں تھا۔ کتنی بار نیند کا جھونکا آیا لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ہر سو نصف شب کے بعد کا سناٹا پھیل چکا تھا۔ جب اُسے اپنے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی تو گھٹنوں سے سر اُٹھا کر اُس نے دروازے کی سمت گردن موڑ کر پوچھا۔

''کون۔'' جواب میں پھر ویسی ہی دستک اُبھری۔ تو مجبوراً اُسے اُٹھنا پڑا اور دروازے کے قریب جا کر پھر پوچھا کون تو سرگوشی میں جواب آیا۔

''آپ کا خیر خواہ۔''

''احمد کمال۔'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ کچھ ٹھٹکی۔ پھر خاصے جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُس نے فوراً اندر داخل ہو کر اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اپنے پیچھے احتیاط سے دروازہ بند کرنے کے بعد کہنے لگا۔

''آپ کو سکون سے میری بات سننی ہے۔ شور مچا کر صرف اپنے لیے مصیبت کھڑی کریں گی۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

''شٹ اپ، کیوں آئے ہو تم؟'' وہ اپنے ہونٹوں سے اُس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''آپ کی مدد کرنے اور آپ کی مدد سے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' اُس نے کہا تو گو کہ وہ ٹھٹک گئی تھی لیکن اتنی جلدی اُس پر اعتماد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ازہر شیرازی کے سامنے اُسے ہاتھ باندھے

دیکھ چکی تھی اور پہلا خیال یہی آیا کہ ازہر ہی نے اُسے اُس کی نگرانی پر مامور کیا ہوگا اور اُس کے ذریعے سے شاید اُس کے آئندہ کے ارادے جاننا چاہتا ہوگا۔ جب ہی ناگواری سے بولی۔

''تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''اگر ضرورت نہیں تھی تو پولیس اسٹیشن فون کیوں کیا تھا۔'' اُس کے اتنے یقین سے کہنے پر وہ قدرے سٹپٹا گئی۔

''کب۔''

''چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہی وقت تھا اور میں کیونکہ اس سے پہلے بھی آپ سے فون پر بات کر چکا تھا اس لیے آپ کی آواز پہچان گیا۔ اور اگر آپ کو یاد ہو تو اگلی صبح ہی میں یہاں آیا تھا۔''

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم اپنی پروموشن کے سلسلے میں ازہر شیرازی کے پاس آئے تھے۔'' اس کے طنز پر وہ ذرا سا مسکرایا۔

''وہ محض ایک بہانہ تھا مسز شیرازی! ورنہ مجھے آپ کی خیریت مطلوب تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ چیخ گئی۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں لیکن مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں، یا پھر ازہر شیرازی سے حد درجہ خائف ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُس شخص کے ہاتھوں میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا۔ بس آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔''

''میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔''

''پھر مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ ازہر شیرازی کے جرائم میں آپ برابر کی شریک ہیں اور بہت جلد اُس کے ساتھ آپ کو بھی۔''

وہ جانے کیوں خاموش ہو گیا جب کہ وہ اندر ہی اندر خائف ہو گئی تھی لیکن بولی کچھ نہیں۔ اور قدرے توقف سے وہ کہنے لگا۔

''آپ ازہر شیرازی کو ایک سال سے جانتی ہیں اور میں اس سے بھی پہلے سے۔ تقریباً دو ڈھائی سال پہلے مجھے اُس کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا اور اُس وقت سے آج تک اسے اُس کی خوش قسمتی اور میری بد قسمتی کہہ لیں کہ اُس کے کسی جرم کا کوئی ٹھوس ثبوت میرے ہاتھ نہیں آ سکا اور محض شک کی بنا پر اُس سے تفتیش بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ بظاہر اُس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ ہو سکتا ہے آپ اُس کے بارے میں زیادہ کچھ نہ جانتی ہوں لیکن بالکل بے خبر بھی نہیں ہو سکتیں اور یہ تو میں یقین سے کہوں گا کہ جب آپ نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا اُس وقت آپ کے علم میں کوئی ایسی ہی

بات آئی ہوگی جس نے آپ کو اپنے شوہر کے خلاف اسٹینڈ لینے پر مجبور کیا۔ لیکن میری طرح آپ کی بھی بد قسمتی کہ عین وقت پر ازہر شیرازی آپ کے سر پر پہنچ گیا اور اگلی صبح میں یہی دیکھنے آیا تھا کہ اُس نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ میرا خیال ہے اُس نے آپ پر سارے راستے بند کر دیئے ہیں کیونکہ اس کے بعد میں نے آپ کو کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا اور آپ کے گھر کا ٹیلی فون بھی اُسی روز سے بند پڑا ہے جس کا مطلب ہے آپ کو کسی سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

وہ غالباً اُس کی خاموشی توڑنے کے لیے آخر میں سوالیہ نشان بنا تھا۔ لیکن بے سود کہ وہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی بس ذرا سی پلکیں اُٹھا کر اُسے دیکھا پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔ تو کچھ دیر رُک کر وہ سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں۔ آپ پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہیں۔ اپنے شوہر کے جرائم چھپا کر آپ اُس کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کریں گی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ اپنے طور پر اُسے اچھا انسان بنا دیں گی تو یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ وہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ چلیں یہ بتا دیں اب تک آپ نے کتنی کوشش کی اور اُس پر کتنا اثر ہوا؟''

اُس نے پھر سوال اُٹھایا۔ تو وہ ہونٹ بھینچ کر جیسے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس پر وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے۔ آپ صرف بیوی بن کر سوچ رہی ہیں۔ لیکن یاد رکھیں اُس سے وفاداری قابلِ تحسین نہیں ہوگی۔ بلکہ صرف رُسوائی ہاتھ آئے گی ایسی رُسوائی جو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر والوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی کیونکہ یہ طے ہے کہ ازہر شیرازی بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اگر آپ کو اُس کی زندگی عزیز ہے تو ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔''

''کیسا تعاون؟ مجھ سے زیادہ تو تم اُس کے بارے میں جانتے ہو۔'' وہ اُس کی باتوں سے عاجز آ کر بولی تھی۔ ''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ وہ مجرم ہے۔ اُس کے جرائم کی تفصیل مجھے نہیں معلوم اور معلوم ہو بھی جائے تو میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ تمہیں ٹھوس ثبوت چاہیے ہوگا جو میرے لیے حاصل کرنا ناممکن ہے۔''

''کیوں ناممکن ہے۔'' وہ اُسے تعاون پر آمادہ دیکھ کر نرمی سے بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہ اپنے سارے معاملات میرے ساتھ ڈسکس کرتا ہے؟ نہیں۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔ تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''میں جانتا ہوں آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ باہر کس مقصد سے جاتا ہے اور نہ کبھی آپ نے یہ غور کیا ہوگا کہ جن دنوں وہ باہر ہوتا ہے اس عرصے میں یہاں کوئی...... خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں جب آپ نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا اُس وقت آپ کے علم میں کیا بات آئی تھی۔''

''اُس وقت۔'' اُسے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی اُس نے کچھ وقت لگایا کیونکہ اندر توڑ پھوڑ شروع ہوگئی تھی اور وہ بغور اُسے دیکھ رہا تھا لیکن ٹوکا نہیں۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی کہنے لگی۔

''وہ بم بلاسٹ کا واقعہ تھا جس کا پلان قبل از وقت میرے علم میں آ گیا اور میں نے پولیس کو مطلع کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس حادثے کو روک سکیں۔''

''کیسے؟ کیسے معلوم ہوا تھا آپ کو؟'' وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گیا۔

''وہ ازہر موبائل پر بات کر رہے تھے۔ بس میں نے سن لیں۔'' اُس نے غلط بیانی سے کام لیا۔

''ہوں!'' اُس نے ہوں کی صورت سانس باہر نکالی۔ پھر کہنے لگا۔ ''میں آپ سے ایسا ہی تعاون چاہتا ہوں۔ اگر اُس روز آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتیں تو ہم ازہر شیرازی کے آدمیوں کے لیے پہلے سے وہاں جال بچھا دیتے۔ بہر حال آئندہ آپ..........''

''نہیں، آئندہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' وہ فوراً کہہ کر ہونٹ بھینچ گئی۔ تو وہ سمجھ کر بولا۔

''سوری، آپ تو خود یہاں قید ہیں لیکن اپنی آزادی کے لیے کچھ تو کرنا پڑے گا آپ کو، یا اس قفس میں خوش ہیں۔'' اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو پوچھنے لگا۔

''گھر میں کتنے ملازم ہیں؟''

''چار تو ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ باقی میں نے کبھی غور نہیں کیا۔''

''ان میں سے کسی کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے؟'' وہ اب خالص پیشہ ورانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

''نہیں، سب ازہر کے وفادار ہیں۔''

''ہوں۔ پھر تو آپ واقعی کچھ نہیں کر سکتیں۔'' وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ تو وہ پوچھنے لگی۔

''تم یہاں آئے کیسے؟ دونوں طرف تو چوکیدار موجود ہیں۔'' اُس نے پلٹ کر دیکھا اور ذرا سا مسکرانے پر اکتفا کیا۔ تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔

''اب تم جا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''لیکن میں اس قفس سے رہائی میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ چاہیں تو ابھی میرے ساتھ

چلیں۔'' وہ پردہ چھوڑ کر اُس کی طرف آتا ہوا بولا۔ تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''لگتا ہے آپ صیاد سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی ہیں۔ بہر حال یہ میرا کارڈ رکھ لیں، شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔'' اُس نے جیب سے کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ پھر کہنے لگا۔

''آپ نے خود کو بہت کمزور اور بے بس سمجھ لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ازہر شیرازی جیسے لوگ بظاہر کتنے مضبوط سہی، اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ آپ اُس سے خائف ہوں اُسے آپ سے خائف ہونا چاہیے۔ اس کے لیے آپ کو تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔ او کے۔''

آخر میں وہ ذرا سا مسکرایا۔ پھر اپنا کارڈ اُس کے سامنے تکیے پر ڈال کر کمرے سے نکل گیا تو وہ چونک کر کھڑی ہوئی اور دروازے تک جا کر دیکھنے لگی کہ وہ کس راستے سے جاتا ہے لیکن راہ داری میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ تب دروازہ بند کر کے اُس نے پہلے اُس کا کارڈ اپنے پرس کے اندرونی خانے میں چھپایا پھر اپنی جگہ پر لیٹی تو اُسے لگا جیسے اتنی دیر سے وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ دل بھی یوں دھڑک رہا تھا جیسے خواب سے بیداری کے بعد دھڑکتا ہے۔ دھیرے دھیرے دھڑکنیں معمول پر آئیں اور ذہن نے کچھ دیر پہلے کی حقیقت کو قبول کر لیا۔ تب وہ اُس کی ایک ایک بات سوچنے لگی تھی۔

''اپنے شوہر کے جرائم چھپا کر آپ اُس کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کریں گی۔''

''مجھے افسوس ہے۔ آپ صرف بیوی بن کر سوچ رہی ہیں لیکن یاد رکھیں اُس سے وفاداری قابل تحسین نہیں ہوگی، بلکہ ایسی رُسوائی ہاتھ آئے گی جو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر والوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی۔''

وہ صبح شام اُس کی سماعتوں پر دستک دے رہا تھا اور اُس کی بے حسی دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی تھی۔ جس روز ازہر آیا وہ اُسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔

''کس جنم کا بدلہ لے رہے ہیں آپ مجھ سے۔ اگر مارنا ہی ہے تو ایک بار میرا گلا گھونٹ دیں۔ میں اس طرح گھٹ گھٹ کر نہیں مرنا چاہتی؟''

''تمہاری اپنی غلطی ہے جو ایک بات کو خود پر سوار کر کے بیٹھ گئی ہو۔ دھیان بٹانا ہی نہیں چاہتیں۔ ٹی وی آن کرو، دنیا بھر کے چینل موجود ہیں۔'' وہ اُس کے چلانے کے جواب میں آرام سے بولا۔ ''ہر وقت جلنے کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی صحت خراب کر رہی ہو۔''

''یہ دنیا بھر کے چینل مجھے نہیں بہلاتے۔ جب آپ مجھے زندہ انسانوں کی طرح دیکھنا چاہتے

ہیں تو میں بھی زندہ انسانوں میں رہنا چاہتی ہوں جن کے ساتھ میں اپنے دُکھ سکھ شیئر کرسکوں۔'' وہ رو پڑی۔

''کون سے دُکھ سکھ شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ کرو۔''

''آپ کے ساتھ۔ آپ سنیں گے، مجھے تنہائی میں کون سے دُکھ رُلاتے ہیں۔'' وہ طنزآمیز تلخی سے بولی۔

''کیوں نہیں ضرور سنوں گا۔ لیکن پہلے میں شاور لے لوں۔'' وہ مسکراتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ گویا اُس کی بات اُڑا گیا تھا۔ جس سے وہ نہ صرف بُری طرح سلگ گئی بلکہ تہیہ کرکے بیٹھ گئی کہ وہ شاور لے کر نکلے گا تو پھر بات کرے گی۔ اُسے ذہنی کوفت میں مبتلا کرکے وہ کیوں اتنے اطمینان سے رہتا ہے۔ وہ اُسے بھی اطمینان سے نہیں رہنے دے گی۔

''آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میری آمد پر تمہارے ہونٹ مسکراہٹ بکھیرنے کے بجائے شکوہ کر رہے ہیں۔'' وہ واش روم سے نکلا تو حسب عادت اُنگلیوں سے گیلے بال سنوارتا ہوا بولا۔

''اس لیے کہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ نے جو سزا میرے لیے تجویز کی اسے یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔'' وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر رُوٹھے لہجے میں کہنے لگی۔ ''میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی اب آپ کو میرا اعتبار کر لینا چاہیے کیونکہ اس تمام عرصے میں، میں نے دوبارہ اُس غلطی کو نہیں دہرایا۔''

''اس لیے کہ تمہیں موقع نہیں ملا۔'' گویا وہ کسی طرح اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جس پر وہ بھی اُس کے شبے کو مزید ہوا دے گئی۔

''یہ محض آپ کا خیال ہے۔ ورنہ آپ کی غیرموجودگی میں میں چاہتی تو یہاں سے جا بھی سکتی تھی۔''

''نہیں نہیں شامہ! کبھی ایسی غلطی نہیں کرنا۔ میرے آدمی تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس کے بعد تم تصور نہیں کرسکتیں کہ..........'' موبائل کی گھنٹی سے اُس کی بات اُدھوری رہ گئی۔

لیکن وہ نہ صرف سمجھ گئی بلکہ اُسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہونے لگی تھی کہ وہ اس شخص کے سیاہ کارناموں پر کس حساب سے پردہ ڈالتی رہی ہے جس کے نزدیک اُس کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اگر ابھی وہ اُس کے جرائم کے خلاف بغاوت کا اعلان کردے تو وہ ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اُسے گولی سے اُڑا دے گا۔ ایسے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے نہ اُن کا کوئی عزیز ہوتا ہے۔ یہ صرف اپنے اُصولوں پر چلتے ہیں۔ وفاداری کے بدلے وفاداری اور غداری کی سزا موت۔

''اور ازہر شیرازی! میں تم سے غداری ضرور کروں گی۔'' اُس نے بہت متنفر ہوکر سوچا۔ پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تو وہ فوراً موبائل بند کرکے اُس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ بے ساختہ مسکرائی۔ جس پر وہ خجل سا ہوکر بولا۔

''میرا مطلب ہے، چائے نہیں پلواؤ گی۔''

''چائے کا ہی کہنے جا رہی ہوں۔'' وہ یونہی مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ جانے کس سوچ میں گم تھا۔ اُس نے بس ایک نظر اُسے دیکھا پھر اُس کے سامنے بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوکر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پنجرے میں اُنگلی ڈال کر خاموش بیٹھے طوطے کو چھیڑنے لگی۔ گاہے گاہے کن اکھیوں سے اُسے بھی دیکھ لیتی جس کا انداز ہنوز تھا۔ جانے اُس کا اپنا کوئی مسئلہ تھا، یا واقعی اُس سے خائف ہوگیا تھا۔ اُس کے چہرے پر اگر کوئی تاثر اُبھرتا تو شاید وہ کچھ اندازہ لگا لیتی اور یہی اُس کا کمال تھا کہ وہ اپنی کیفیات ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

ملازم چائے لے کر آیا تو وہ بغیر چونکے اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ٹرے سامنے ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُسے مخاطب کرکے پوچھنے لگا۔

''دلاور خان! میری غیرموجودگی میں یہاں کون آیا تھا۔'' اتنا اچانک اور غیرمتوقع سوال تھا کہ جہاں ملازم بوکھلایا، وہاں وہ اپنی جگہ سن ہوگئی تھی۔

''سنا نہیں تم نے۔ میں نے کیا پوچھا ہے اور مجھے اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے۔'' اُس کے ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں بلا کا رُعب تھا۔ دلاور خان ہاتھ باندھ کر اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا۔

''کوئی نہیں صاحب! کوئی نہیں آیا۔ آپ بیگم صاحب سے..........''

''شٹ اپ دلاور خان۔'' اس بار وہ زور سے دھاڑا۔ ''نگرانی پر تم لوگ مامور ہو اور پوچھوں میں بیگم صاحبہ سے۔ جاؤ سب سے معلوم کرکے مجھے پوری رپورٹ دو۔'' دلاور خان فوراً اُٹھ کر چلا گیا تو اس نے پہلے ٹیبل اپنی طرف کھینچی پھر اُسے دیکھ کر بولا۔

''آؤ شام! چائے پئیں۔'' اور اس میں کہاں اتنی سکت تھی کہ ایک قدم بھی چل سکتی۔ یونہی گم صم اُسے دیکھے گئی۔ جب کہ اُس کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے تھے اور اندر توہین کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر وہ براہ راست اُس سے پوچھتا تو یہ اُس کا حق تھا۔ لیکن اُس کے سامنے ملازم سے پوچھ کر اُس کی عزت دو کوڑی کی کرکے رکھ دی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو، آؤ نا۔" وہ ٹرے میں کپ سیدھے کرنے کے بعد دوبارہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ تو وہ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی ٹیبل کے دوسری طرف بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم کہ تم یہاں سے جا سکتی ہو۔" وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا۔ اور اُس کا ضبط جواب دے گیا۔

"ہاں جا سکتی ہوں۔ اگر اب تک یہاں موجود ہوں تو اپنی مرضی سے اور جب چاہوں گی چلی جاؤں گی۔ آپ جتنے مرضی پہرے بٹھا لیں۔"

"میں نے تم پر کوئی پہرا نہیں بٹھایا۔"

"اچھا۔" وہ طنزیہ ہنسی۔ "آپ کی تو وہی بات ہے چت بھی میری پٹ بھی میری۔ بہرحال مجھ سے آپ اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کریں۔ جو کچھ پوچھنا ہو اپنے ملازموں سے پوچھیں وہیں آپ کو صحیح رپورٹ دیں گے۔"

"اور تم؟"

"مجھے جب کسی بات کا پتا ہی نہیں تو کیا بتاؤں گی۔ آپ کی غیر موجودگی میں تو میں صرف کھانے کے اوقات میں کمرے سے نکلتی ہوں اور بس۔" اُس نے اپنے طور پر بات ختم کر دی اور چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میں تمہاری ہر بات کا یقین کر رہا ہوں شام! لیکن اس وقت تمہارا رویہ اور تمہاری باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تمہیں کسی نے اُکسایا ہے اور ملازموں میں تو اتنی جرأت ہو نہیں سکتی پھر یقیناً باہر کا ہی کوئی آدمی..........."

"آپ کے خیال میں میرے پاس ذہن نہیں ہے۔ میں سوچ نہیں سکتی، یا پاگل بے حس سمجھ لیا ہے آپ نے مجھے، جو مجھ پر کوئی بات اثر نہیں کرے گی۔"

وہ اُس کے درست اندازے پر اندر ہی اندر خائف ضرور ہو گئی تھی لیکن بظاہر بہت ہمت سے بولی۔

"آپ کا خیال غلط ہے ازہر! اس پنجرے میں بند طوطے کو دیکھیں، وہ بھی اپنی آزادی کے خواب دیکھتا ہو گا اور میں تو پھر انسان ہوں۔"

"اپنی آزادی تم نے خود کھوئی ہے۔ اس کے لیے مجھے الزام مت دو۔"

"ہاں! یہ بات میں نے بہت دیر میں سمجھی کہ آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے مقید کیوں ہو جاتے ہیں۔" وہ اچانک آزردگی میں گھر کر جیسے اپنے آپ سے بولی تھی۔

عشا کی نماز کے بعد وہ کلام پاک لے کر بیٹھ گئی۔ آخری پارہ رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا اس وقت ختم کر لے پھر صبح دوبارہ شروع کرے گی۔

"سنو!" وہ اسی وقت کمرے میں داخل ہوا اور اُسے متوجہ کر کے بولا۔ "صبح اگر تم جلدی اُٹھ جاؤ تو مجھے اُٹھا دینا۔"

"کتنے بجے؟"

"چھ بجے مجھے نکلنا ہے اگر اس سے پہلے۔"

"میں فجر کی نماز کے لیے اُٹھوں گی تو آپ کو بھی اُٹھا دوں گی۔" اُس نے کہہ کر کلام پاک کھول لیا۔

"میں احتیاطاً الارم بھی لگا رہا ہوں۔ تم اگر بھول جاؤ تو اُس کی آواز سے یاد آ جائے گا کہ مجھے اُٹھانا ہے۔" وہ اپنے آپ بولتا ہوا الارم لگا کر لیٹ گیا، تو وہ احساس کر کے پوچھنے لگی۔

"اگر آپ لائٹ آف کرنا چاہیں تو میں دوسرے کمرے میں چلی جاؤں۔"

"نو۔ نو پرابلم۔" اُس نے تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ پھر بھی وہ بار بار اُسے دیکھتی رہی کہ کہیں وہ ڈسٹرب تو نہیں ہو رہا۔ لیکن وہ آرام سے سو گیا تھا۔ تب اُس نے بھی آرام سے آخری پارہ پڑھ کر کلام پاک ختم ہونے کی دعا پڑھی تو اس وقت گھڑی کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں۔ اُس نے کلام پاک جزدان میں لپیٹ کر رکھا پھر حسب معمول طوطے کو شب بخیر کہا۔ اس کے بعد ٹیوب لائٹ آف کر کے مدھم روشنی کا بلب جلا دیا۔

اور ابھی اُسے لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ موبائل کی گھنٹی سے وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانے کیا جادو تھا اس گھنٹی میں جو اُسے گہری نیند سے بھی اُٹھا دیتا تھا۔ ورنہ گھڑی کا الارم گھنٹہ بھر بھی اُس کے سر پر بجتا رہے، اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال یہ جادوئی گھنٹی اُسے دہلا دیتی تھی۔ ابھی بھی اُس نے سانس روک لیا تھا لیکن سماعتوں کے در بند نہیں کر سکتی تھی۔

"چھ بجے پہنچ جانا۔" وہ اپنے مخصوص کوڈ ورڈز کے بعد کہہ رہا تھا۔

"ساڑھے چھ پونے سات کے درمیان تمہیں تمام میٹریل مل جائے گا۔"

"دس تاریخ مین صدر، تین بجے شام۔ او کے۔"

وہ موبائل بند کر کے لیٹ گیا۔ اس کے کتنی دیر بعد بھی اُس نے پلکوں کی جھریوں میں سے اُسے دیکھا اور جب اُس کے سونے کا یقین ہو گیا تب سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہتی تھی کہ اچانک دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے سینے سے باہر نکل جانا چاہتا ہو اور پھر ہر طرف شور مچ

گیا۔ وہی چیخ و پکار تھی۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان سب دہائیاں دے رہے تھے اور پھر اُسے لگا جیسے سب نے مل کر اُسے بیچ چوراہے پر گھسیٹ لیا ہو۔

''تم بے خبر نہیں تھیں، سب جانتی تھیں۔ ہمارے بچوں کو یتیم کرنے کے جرم میں تم اپنے شوہر کے ساتھ برابر کی شریک ہو۔ ہم تمہیں معاف نہیں کریں گے۔''

''میرے خدا، میں کیا کروں۔'' اپنی بے بسی پر اُس کے آنسو چھلک گئے۔ تب ہی کوئی دھیرے سے بولا تھا۔

''آپ نے خود کو بہت کمزور اور بے بس سمجھ لیا ہے۔''

''آپ کو تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔ او کے۔''

''کیسے؟ کیسے؟'' بقیہ تمام رات اُس کی یہی سوچنے میں کٹ گئی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُس نے بستر چھوڑ دیا اور پہلے وضو کر کے اپنے چہرے سے رت جگے کے نشان دھوئے۔ پھر اُسے اُٹھا کر فوراً نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ اس وقت اُس سے بات کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا اور اچھا ہوا وہ بھی عجلت میں تھا۔ اُس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا البتہ جاتے جاتے ناشتے تک واپس آنے کا کہتا گیا تھا۔ اُس نے آرام سے نماز ختم کی پھر جانماز رکھتے ہوئے اُس کی نظریں کیلنڈر پر جا ٹھہریں۔ آج سات تاریخ تھی اور درمیان میں بس دو دن تھے۔

''بیڈ لک۔'' وہ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ ''قسمت ہمیشہ ازہر شیرازی ہی کا ساتھ کیوں دیتی ہے جب کہ وہ غلط کام کر رہا ہے اور ہم۔''

''یہ میرا کارڈ رکھ لیں، شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔''

اُس کے متحرک قدم رُک گئے جب کہ ذہن اچانک متحرک ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس کے پورے وجود میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ پہلے پرس میں سے احمد کمال کا کارڈ نکال کر اُس کے نمبرز یاد کیے۔ پھر کارڈ کو ٹھکانے لگا کر دوبارہ جانماز بچھائی اور اُس پر اوندھی لیٹ کر ازہر شیرازی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ناشتے کے وقت تک آنے کا کہہ کر گیا تھا اور اسی حساب سے ساڑھے سات بجے کے قریب اُس کی آمد کا تعین کر کے وہ بُری طرح کراہنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسے اس حالت میں لیٹا دیکھ کر واقعی پریشان ہو گیا۔

''شام! کیا ہوا ہے۔'' اُسے بازوؤں میں اُٹھا کر سیدھا کیا۔ تو وہ رُک رُک کر بولی۔

''مجھے چکر۔ میں اوندھی گر گئی۔ میرا پیٹ اُف میں مر جاؤں گی۔''

''نہیں نہیں شام! میں ابھی ڈاکٹر۔''

''ازہر، میرا بچہ۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا جان۔'' وہ اُسے بازوؤں میں لے کر تقریباً بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا تھا اور پھر گاڑی بھی اسپیڈ سے بھگائی۔

''ایک جان کی اتنی فکر اور وہ اتنی جانیں۔'' اُس کی آنکھوں کے اندر پانی جمع ہونے لگا۔ کاش اس شخص کے ساتھ اُس کی ذاتی دشمنی ہوتی تو وہ اس وقت اُس کی ساری خطائیں معاف کر دیتی۔

''ڈاکٹر! مجھے ہر قیمت پر اپنی مسز اور بچے کی زندگی چاہیے۔'' ایمرجنسی پر موجود ڈاکٹر سے اُس نے یوں کہا جیسے اُس کے اختیار میں ہو۔

''آپ پلیز، انہیں یہاں لٹائیں اور آپ باہر جا کر انتظار کریں۔ میں چیک اپ کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ تو وہ اُسے لٹا کر بولا۔

''فکر نہیں کرنا شام! میں یہیں ہوں۔'' اُس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا پھر اُس کے جاتے ہی آہستہ آواز میں ڈاکٹر سے بولی۔

''پلیز ڈاکٹر! دروازہ بند کر دیں۔'' یہ ایک عام سی بات تھی۔ اس لیے ڈاکٹر نے کوئی توجہ نہیں دی اور جا کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر اُس کے قریب آ کر پوچھنے لگی۔

''ہاں بی بی! کیا تکلیف ہے آپ کو؟''

''کوئی خاص تکلیف نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! بس یہ ہے کہ کمزوری بہت محسوس ہوتی ہے اور شاید اس وجہ سے چکر بھی آتے ہیں۔ میں میڈیسن نہیں لے سکتی۔ میرا مطلب ہے ٹیبلٹس اور سیرپ وغیرہ سے میں بہت الرجک ہوں البتہ ڈرپ لگوا سکتی ہوں اور اس سے مجھے فائدہ بھی ہوتا ہے۔'' وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرتے ہوئے اُس کی باتیں سنیں۔ پھر کہنے لگی۔

''آپ کے ہسبنڈ تو بہت پریشان تھے جیسے خدانخواستہ۔''

''بس ڈاکٹر صاحب! وہ یونہی پریشان ہو جاتے ہیں اور جلدی اطمینان سے بھی نہیں ہوں گے۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بچہ بھی ٹھیک ہے اور کمزوری کے لیے میں ڈرپ اور انجکشن لکھ دیتی ہوں۔ چاہیں تو گھر پر لگوا لیں۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہیں اور ابھی آپ میرے ہسبنڈ سے منگوا لیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر نرس کو پکارا۔ پھر پرچہ لکھ کر اُسے تھما کر بولی۔

''باہر ان کے ہسبنڈ ہوں گے اُن سے کہو یہ ابھی لے آئیں۔''

نرس چلی گئی اور ڈاکٹر وہیں الماری کھول کر اس میں کوئی میڈیسن دیکھنے لگی تو وہ پلکیں موند کر اپنا اگلا اقدام سوچنے میں لگ گئی۔ یہاں تک تو وہ آ گئی تھی اور ڈرپ لگنے کے بعد اگر ازہر اُس کے پاس جم کر بیٹھ گیا تب تو بہت مشکل ہو گی۔ جب کہ اُسے یہیں سے احمد کمال کو فون کرنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ازہر کو کسی طرح گھر بھیجنے میں کامیاب ہو جائے۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ ایک فون کرنے کے لیے اُسے کیا کچھ کرنا پڑا تھا اور اگر آج وہ کامیاب نہ ہوئی تو پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔

''تم سو تو نہیں گئیں؟'' ڈاکٹر کی آواز پر اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ تو نرس نے اسٹینڈ قریب رکھ کر اُس پر ڈرپ لگائی پھر اس میں انجکشن ڈالنے لگی۔ وہ خاموشی سے تمام کارروائی دیکھتی رہی۔ جب ڈاکٹر اُس کے ہاتھ کی پشت پر ڈرپ کی سوئی کو ٹیپ سے کور کر کے فارغ ہوئی۔ تب وہ اُس سے پوچھنے لگی۔

''میرے ہسبینڈ یہیں موجود ہیں، یا باہر چلے گئے۔''

''یہیں ہیں۔ میں انہیں بھیجتی ہوں۔'' ڈاکٹر کہتی ہوئی چلی گئی اور چند لمحوں بعد ہی وہ آیا تو ابھی تک خاصا متوحش تھا۔

''ٹھیک تو ہو نا شام۔''

''ہاں اب کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ اچھا ہوا آپ وقت پر آ گئے تھے ازہر، ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔'' اُس نے خود پر نقاہت طاری کر کے کہا۔

''ڈاکٹر بتا رہی ہے۔ تم بہت کمزور ہو کیا خیال ہے۔ ہفتے بھر کے لیے تمہیں یہیں نہ چھوڑ دوں۔ اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔''

''اُف نہیں۔ مریضوں میں رہ کر تو میں اور مریض ہو جاؤں گی۔ بس یہ دو تین گھنٹے کافی ہیں۔ ڈرپ ختم ہوتے ہی گھر چلوں گی اور ہاں آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ ایسا کریں آپ گھر چلے جائیں۔ ناشتا کریں اور کچھ دیر آرام بھی کر لیں۔'' اُس نے بہت سنبھل کر کہا۔ تو وہ جیسے جانا بھی چاہتا ہو اور نہیں بھی۔

''دو تین گھنٹے کی تو بات ہے یار! ساتھ چلیں گے۔''

''دو تین گھنٹے بہت ہوتے ہیں ازہر! آپ بور ہو جائیں گے کیونکہ میں اب سو رہی ہوں۔''

''ہاں تم سوؤ۔ مجھے اگر جانا ہوا تو چلا جاؤں گا۔'' اُس نے کہا۔ تو وہ مزید اصرار کا ارادہ ترک کر کے پلکیں موند گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی لیکن وہ سو نہیں سکتی تھی۔ مسلسل

اپنے ذہن کو مصروف رکھ کر دل ہی دل میں اُس کے جانے کی دعائیں مانگتی رہی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اُٹھ کر گیا تھا۔ پتا نہیں گھر، یا ہسپتال ہی میں کہیں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد نرس اُس کی ڈرپ چیک کرنے آئی تو اُس نے فوراً پوچھا۔

''میرے ہسبینڈ کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے، آپ سے کچھ کہہ کر گئے ہیں۔''

''ہاں بی بی! وہ کہہ گئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آئیں گے۔'' نرس نے بتایا تو اس کے دل کی دنیا تہ و بالا ہونے لگی تھی۔

''اچھا سسٹر! مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

''چلیں۔'' نرس نے اسٹینڈ پر سے ڈرپ اُتاری تو وہ فوراً اُٹھ گئی۔ پھر باتھ روم سے فارغ ہو کر اُس نے سسٹر سے کہا کہ اُسے اپنی والدہ سے ضروری بات کرنی ہے لہٰذا وہ اُسے ٹیلی فون کے پاس لے جائے۔ سسٹر نے زیادہ پس و پیش نہیں کی۔ البتہ انداز ایسا تھا جیسے اُسے اور بھی بہت کام ہیں اور وہ بھی کیا کرتی اُس کے پاس یہی وقت تھا۔ احمد کمال کے نمبر ملاتے ہوئے پہلے کی طرح اب بھی اُس کی اُنگلیاں کانپی تھیں اور نہ صرف پیروں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی بلکہ سر سے چادر بھی اُترتی لگ رہی تھی۔

''ہیلو، احمد کمال اسپیکنگ۔'' اُس کی آواز پر وہ اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دے کر بولی۔

''جی، یہ میں ہوں بیگم ازہر شیرازی۔''

''آپ۔'' وہ غالباً حیران ہوا تھا۔

''وہ ایسا ہے احمد کمال کہ!'' وہ عقب میں سسٹر کی موجودگی کے باعث کچھ گھبرا رہی تھی۔

''جی جی۔ کہیے۔ میں سن رہا ہوں۔'' اُدھر سے بے صبری کا مظاہرہ ہوا۔

''دس تاریخ، مین صدر، تین بجے شام۔ میں صرف اتنا جان پائی ہوں باقی جاننا آپ کا کام ہے۔'' وہ آواز دبا کر بولی۔

''اسی دس تاریخ کو۔'' اُس نے فوراً پوچھا۔

''جی اور ایک بات یاد رکھیے۔ میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔''

''بے فکر رہیں۔''

''خدا حافظ۔'' اُس نے فون رکھ کر ہتھیلی سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔ پھر پلٹ کر سسٹر کو دیکھ کر بمشکل مسکرائی۔

''تھینک یو سسٹر۔''

سسٹر اُسے لٹا کر چلی گئی تو اُس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک بھی نہیں سکی۔ آخر وہ اُس کا شوہر تھا اور جانے اُس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

''میں جس گینگ میں شامل ہوں اُس سے غداری کی سزا موت ہے اور اُن کے ہاتھوں مرنے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں اور پولیس بھی مجھ سے کوئی وی آئی پی کا سلوک تو نہیں کرے گی۔ اگر پھانسی پر نہیں لٹکایا تب بھی ساری زندگی کے لیے کال کوٹھڑی میں ضرور ڈال دے گی۔ اب بتاؤ، تم میرے لیے کون سی سزا تجویز کرتی ہو۔''

اُس نے خوفناک پہلو دکھا کر پوچھا تھا تو وہ بہت خوفزدہ ہوگئی تھی اور ابھی بھی خوفزدہ تھی۔ اُس کے لیے ایسی کوئی سزا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن سزا سے بچا بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اُس کا نہیں پوری انسانیت کا مجرم تھا۔ اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا، ہر طرف سناٹا پھیل گیا تھا۔

اُس رات وہ دیر تک اُس سے بے سروپا باتیں کرتی رہی۔ کتنی بار اُس نے ٹوکا لیکن اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ شاید ذہنی طور پر وہ بہت اپ سیٹ تھی اور اگلے دو دن اسی حالت میں اُس کے اردگرد منڈلاتی رہی۔

''تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے شام۔'' آخر اُس نے ٹوک دیا۔ ''یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو اور جو بھی بات ہے کہہ ڈالو۔''

''نہیں، مجھے کوئی بات پریشان نہیں کر رہی۔'' وہ نظریں چرا کر طوطے کے پنجرے کو گول گول چکر دینے لگی۔

''اسے کیوں تنگ کر رہی ہو؟'' وہ اُٹھ کر اُس کے پاس چلا آیا اور پنجرہ روک کر طوطے سے مخاطب ہوا۔

''کیوں میاں مٹھو! کیسے ہو۔''

''بہت خوش۔'' وہ بے اختیار بولی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' اُس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''کیونکہ میں نے اسے جلد آزادی کی نوید سنائی ہے۔''

''اچھا!'' وہ طوطے پر نظریں جمائے کچھ دیر جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر پنجرہ گھما کر دروازہ اُس کی طرف کرتا ہوا بولا۔ ''لو کھولو دروازہ اور آزاد کر دو اسے۔''

''واقعی۔'' اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں ہاں۔'' اُس نے کہا تو وہ قدرے رُک کر دروازے میں پھنسی سلائی نکالنے لگی۔ پھر جیسے

ہی دروازہ کھولا، طوطا پھر سے اُڑ گیا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

''مجھے یقین ہے، اب وہ کبھی غافل نہیں ہوگا۔'' پھر اپنے چہرے پر اُس کی نظریں محسوس کر کے کچھ نروس سی ہو کر بولی۔ ''آپ نے بھی کن باتوں پر لگا دیا ادھر نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

''او کے۔ تم نماز پڑھو۔ میں ذرا باہر کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ زیادہ دُور نہیں بس یہیں قریبی مارکیٹ تک جاؤں گا۔''

''جلدی آیئے گا پھر چائے ساتھ پییں گے۔'' وہ کہتی ہوئی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر نماز کے بعد اُس نے ابھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تھے کہ وہ آ گیا۔ وہ فوراً اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی لیکن جانے کیا بات تھی کہ ساری دعائیں بھی اچانک ذہن سے نکل گئیں۔ کتنی دیر ہتھیلیوں پر نظریں جمائے وہ پریشان بیٹھی رہی پھر یونہی منہ پر ہاتھ پھیر کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانماز لپیٹتے ہوئے اُسے دیکھا تو کچھ ٹھٹک گئی۔ وہ بہت بے چینی سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔

''کیا بات ہے ازہر؟'' اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تو وہ چونک کر رُکا۔

''ہاں کچھ کہا تم نے؟''

''وہ چائے لے آؤں۔''

''ہاں لے آؤ۔'' وہ سگار اور لائٹر اُٹھاتا صوفے پر جا بیٹھا تو وہ اُس کے اچانک اضطراب کے بارے میں قیاس کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی اور ملازم سے چائے کا کہہ کر وہیں لاؤنج میں رُک گئی۔ اُسے کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ شاید احمد کمال نے ازہر کا منصوبہ ناکام بنا دیا ہے اور وہ اسی وجہ سے پریشان ہے۔ اگر واقعی یہی بات تھی تب تو اُسے ازہر سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ دوسری کسی پریشانی کو وہ شیئر کر سکتی تھی۔

''بیگم صاحبہ! چائے کہاں رکھوں۔'' ملازم کے پوچھنے پر اُس نے ذرا سا سر جھٹکا۔ پھر اُس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر کمرے میں آئی تو وہ موبائل پر جانے کس پر چلا رہا تھا۔

''ان دونوں کو فوراً وہاں سے نکالو، یا گولی سے اُڑا دو۔ کچھ بھی کرو۔'' اُس کے ہاتھوں سے ٹرے گرنے لگی تھی کہ فوراً اُس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ پھر سیدھی کھڑی ہوئی اور بے حد خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ اُس کی موجودگی اور خود پر جمی نظریں محسوس کر رہا تھا پھر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ موبائل بند کر کے کچھ دیر سوچا۔ پھر موبائل آن کر کے کہیں اور رابطہ کیا۔

''اس وقت سنگاپور کے لیے کوئی فلائٹ؟''

''کتنے بجے۔''

''او کے!'' اُس نے موبائل رکھ کر اُسے دیکھا تو وہ کوشش کے باوجود نظروں کا زاویہ بھی نہیں بدل سکی۔

''کیا بات ہے، تم کیوں اس طرح گم صم ہو جاتی ہو؟''

''آپ سنگاپور جا رہے ہیں۔'' اُس نے ایسے ہی گم صم انداز میں پوچھا۔

''کوئی نئی بات ہے کیا۔ اکثر جاتا ہوں۔ چلو جلدی سے چائے بناؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' وہ کہتا ہوا اُٹھ کر پہلے ڈریسنگ روم میں گیا پھر اپنا سیف کھول کر کھڑا ہو گیا۔ تو وہ چائے بنانے کے ساتھ کن اکھیوں سے اُسے دیکھتی رہی جب کہ اندر ہی اندر اُلجھتی جا رہی تھی۔

''تم چلو گی۔'' اُس نے سیف بند کر کے اُس سے پوچھا۔ تو وہ چونک کر بولی۔

''کہاں؟''

''تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ چلو یہ بتا دو۔'' وہ جانے طنز کر رہا تھا، یا واقعی مہربان ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی اور کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ تو وہ اُس کے سامنے سے چائے کا کپ اُٹھاتا ہوا بولا۔

''جاؤ، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں جاتے ہوئے تمہیں تمہارے ابا کے گھر چھوڑ دوں گا۔ کچھ دن وہیں رہنا۔'' اُس نے انتہائی بے یقینی سے دیکھا۔ تو وہ اُٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''ہری اپ! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ فوراً اُٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور صرف دس منٹ میں چینج کرنے کے ساتھ ایک بیگ بھی تیار کر کے لے آئی۔ تو وہ اپنا بریف کیس بند کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو'' وہ اسی خاموشی سے اُس کے پیچھے چل پڑی۔

''میرا تو خیال تھا تم اپنے والدین کے پاس جانے کا سن کر خوشی سے اُچھل پڑو گی۔'' راستے میں وہ اُس سے کہنے لگا۔ ''لیکن تم تو یوں لگ رہا ہے جیسے جانا ہی نہیں چاہتیں۔ اگر نہیں جانا چاہتیں تب بھی اپنے چہرے کی افسردگی دُور کرو تا کہ اُن سے مل کر خوشی کا اظہار کر سکو اور دیکھو اپنا خیال رکھنا۔ مجھے اگر سنگاپور سے کہیں اور نہیں جانا پڑا تب تو میں جلدی لوٹ آؤں گا، دوسری صورت میں زیادہ دن بلکہ مہینے لگ سکتے ہیں۔ تم سے بہر حال میں رابطہ رکھوں گا اور یہ کچھ روپے ہیں۔ باقی یہ چیک کیش کرا لینا۔ او کے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے ازہر! لیکن آپ اتنے زیادہ دنوں کے لیے کیوں جا رہے ہیں۔ کیا کوئی؟'' اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ اور وہ سمجھ کر بولا۔

''نہیں نہیں، میرے خلاف کوئی اسٹینڈ نہیں لے سکتا۔'' اس کے ساتھ ہی گاڑی اُس کے دروازے پر روک دی۔

''اندر نہیں چلیں گے۔'' اُس نے گاڑی سے اُتر کر پوچھا۔

''ابھی وقت نہیں ہے پھر تمہیں لینے آؤں گا تو سب سے ملوں گا۔ او کے۔ اپنا خیال رکھنا۔''

وہ خوب صورت مسکراہٹ اُس کی نذر کر کے گاڑی بھگا لے گیا تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس مقام پر کھڑی ہے اور اسے اماں، ابا کے سامنے کس طرح جانا چاہیے۔

''شامہ!'' سجاد بھائی باہر نکلے تھے۔ اُسے کھڑے دیکھ کر حیران ہو کر پکارا تو وہ چونکی۔ پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

''السلام علیکم بھائی!''

''وعلیکم السلام، یہاں کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔'' وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر داخل ہوئے۔ تب وہ بیگ پھینک کر بھاگتی ہوئی جا کر اماں سے لپٹ گئی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسو آپ ہی آپ بہ نکلے اور اماں بھی تو رو رہی تھیں۔

''کہاں چلی گئی تھیں۔ بتا کر نہیں گئی تھیں، تو خط تو لکھ سکتی تھیں۔ کتنے پریشان ہوئے ہم سب۔ کوئی خیر خبر نہیں۔ کہاں ہے ازہر؟ میں پوچھتی ہوں اُس سے۔ تمہیں باہر لے گیا تھا تو کم از کم..........''

''وہ چلے گئے۔'' وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

''ہائیں! اندر نہیں آیا۔''

''انہیں کام تھا۔ پھر آئیں گے۔'' وہ کہہ کر کرن کے گلے لگ گئی۔

''ہائے آپی! دنیا گھوم کر بھی تمہاری صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ پہلے سے بھی کمزور ہو گئی ہو۔''

''بس وہ کچھ بیمار رہی ہوں۔ ابا کہاں ہیں۔ ابھی آفس سے نہیں آئے۔''

''آ گئے ہیں۔ اندر لیٹے ہیں۔ جاؤ مل لو۔'' اماں نے کہا۔ تو وہ کرن کے ساتھ اندر آ گئی۔

''السلام علیکم ابا!''

''ارے شامہ بیٹی!'' ابا اُٹھ کر بیٹھ گئے تو وہ فوراً بڑھ کر اُن کے بازوؤں میں سما گئی۔

پھر سب کی باتوں سے وہ سمجھ گئی کہ ازہر نے اُن سب سے کیا کہلوایا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے اور اُس نے فوری تردید مناسب نہیں سمجھی۔ کیونکہ سب اُس سے مل کر بہت خوش ہو

رہے تھے۔ اس لیے اپنے حالات بتا کر پریشان کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اُس نے سوچا رات میں اطمینان سے پہلے ابا کو بتائے گی لیکن رات میں اماں، کرن اور انور اُسے گھیر کر بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے وہ اتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد آئی تھی۔ جب اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوگئیں تب اماں نے کرن اور انور کو اُٹھایا اور اُسے سونے کا کہہ کر خود بھی اُٹھ گئیں۔

صبح معمول کے مطابق فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ تو اُس نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور آنگن میں جا کر وضو کر رہی تھی کہ ابا اُٹھ کر آ گئے۔

''نماز پڑھو گی بیٹا۔''

''جی ابا۔ آپ کو وضو کرا دوں۔''

''میں مسجد جا رہا ہوں بیٹا! اپنی اماں کو اُٹھا دینا۔'' ابا کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ تو اُس نے وضو کر کے پہلے اماں کو اُٹھایا پھر برآمدے میں جانماز بچھالی تھی۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے پھیلتے اُجالے میں اُڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی اور جانے کیوں ابھی تک اُس کے اندر آزادی کا کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ اس کے برعکس یوں لگ رہا تھا جیسے پنجرے سے نکالتے ہوئے ازہر شیرازی نے اُس کے بال و پَر کاٹ دیئے ہوں۔

''ہائیں! یہ تم اتنی جلدی کیسے اُٹھ گئیں!'' کرن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ تو اُس کے ہونٹوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ پھر اُسے دیکھ کر بولی۔

''تم بھی جلدی اُٹھا کرو اور نماز کی عادت ڈالو۔''

''کوشش کرتی ہوں۔ دعا کرو۔'' کرن مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

پھر اُس نے چاہا کہ ناشتا بنانے میں وہ بھی کرن کی مدد کرے لیکن اماں نے منع کر دیا اور خود بھی اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔ کرن نے وہیں لا کر دسترخوان بچھا دیا۔

''اماں! اب سجاد بھائی کی شادی بھی تو کریں؟'' ناشتے کے دوران اُس نے سجاد بھائی کو دیکھ کر کہا۔

''تمہارا انتظار تھا۔ ایک دو لڑکیاں دیکھی ہیں۔ اب تم بھی دیکھ لو تو بات چلائیں گے۔''

''آج ہی چلیں گے اماں!'' کرن فوراً بولی۔

''نہیں آج نہیں۔ میرا مطلب ہے، ابھی تو میں یہیں ہوں۔ اطمینان سے چلیں گے۔'' وہ کچھ پریشان سی ہوگئی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد ابا اور سجاد بھائی آفس چلے گئے۔ انور کالج جب کہ کرن نے آج اُس کے لیے چھٹی کر لی تھی اور ابا کے جاتے ہی جانے کہاں کہاں کی باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ بظاہر سن رہی تھی لیکن اُس کا ذہن اپنی ہی سوچوں میں اُلجھا تھا کہ اُس نے احمد کمال کو مطلع کر دیا تھا، اس کے بعد اُس نے پتا نہیں کیا کیا۔ آج دس تاریخ تھی اور ازہر شیرازی کا سنگاپور جانا بھی اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا یعنی واردات کے روز ملک سے باہر ہونے کا ثبوت۔

''سنو، مجھے ایک فون کرنا ہے اور کچھ میڈیسن بھی لینی ہیں۔ چلو یہیں میڈیکل اسٹور پر چلتے ہیں۔'' اُس نے اچانک کسی خیال کے تحت کرن سے کہا اور فوراً کھڑی بھی ہوگئی۔

''لیکن ابھی تو اماں بازار جائیں گی، سودا وغیرہ لینے۔'' کرن نے کہا۔ تو اماں سنتی ہوئی آ گئیں۔

''کیوں تمہیں کہیں جانا ہے؟''

''مجھے دوا لینی ہے امی! بس ابھی آ جائیں گے۔'' کرن سے پہلے وہ بول پڑی۔ ''یہیں اسٹور تک تو جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے، پہلے تم ہو آؤ۔'' اماں نے کہا۔ تو وہ جلدی سے اندر جا کر اپنا پرس اُٹھا لائی۔

میڈیکل اسٹور قریب ہی تھا۔ ٹیلی فون کی سہولت بھی موجود تھی۔ وہ دکان دار کو کچھ دواؤں کے نام بتا کر احمد کمال کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''اے ایس پی احمد کمال اسپیکنگ۔'' تیسری بیل کے بعد ریسیور اُٹھنے کے ساتھ اُس کی آواز سنائی دی تو جانے کیوں وہ کچھ گھبرا سی گئی اور بس اس قدر کہہ سکی۔

''جی میں۔''

''کیسی ہیں آپ اور کہاں ہیں۔'' اُس نے فوراً پہچان کر احوال کے ساتھ پوچھا۔ لیکن وہ دونوں سوال نظر انداز کر گئی۔

''وہ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ نے کیا کیا۔ آئی مین آج دس تاریخ ہے۔''

''لگتا ہے آپ نے اخبار نہیں دیکھا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ دو مجرم ہم نے کل موقع پر ہی گرفتار کر لیے تھے اور بڑے مجرم کو اُس وقت گرفتار کیا جب وہ ملک سے فرار ہو رہا تھا۔''

احمد کمال نے اچانک اُسے زلزلوں کی زد میں دھکیل دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے پہلے گول گول دائرے بنے پھر اندھیرا چھانے لگا تھا۔

''ہیلو، ہیلو مسز ازہر! کیا آپ پہلے سے اس بات کے لیے تیار نہیں تھیں، یا آپ خود کو کسی مشکل میں محسوس کر رہی ہیں۔ دیکھیں! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا اور یقین کریں آپ کا خیال کر کے ہی میں نے پریس میں ازہر شیرازی کا نام نہیں دیا اُسے بڑا مجرم کہا ہے۔''

وہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا اور اُس کی کوئی حس کام نہیں کر رہی تھی۔ جیسے ہمیشہ سے اندھی، بہری، گونگی ہو۔

''بس بھی کرو۔ دکان دار بار بار گھڑی دیکھ رہا ہے۔'' کرن کی آواز بھی اُسے سنائی نہیں دی اور چند لمحوں بعد کرن نے اُس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر رکھا اور اُس کے پرس سے پیسے نکال کر دکان دار کو تھمائے۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اندر سے باہر آئی اور اُس کی خالی خالی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں۔ یا اللہ۔ تم تو لگتا ہے یہیں ڈھے جاؤ گی۔ چلو جلدی چلو۔'' کرن پھر اُس کا ہاتھ تھام کر چل پڑی اور گھر میں داخل ہوتے ہی چیخ کر بولی۔

''اماں! جلدی آئیں۔ آپی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔''

اور جانے کرن کی چیخ نے اُس کے احساسات کو جھنجھوڑا تھا، یا کیا تھا وہ یک لخت اُس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی اور برآمدے میں تخت پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اماں اور کرن پریشان ہونے کے ساتھ اُسے چپ کرانے کی ہر تدبیر کر چکیں لیکن اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اُس کے آنسو تھمے نہ سسکیاں اور نہ کچھ بتانے پر آمادہ ہوئی۔

''مجھے کچھ پتا نہیں اماں! وہاں اسٹور پر کسی کو فون کر رہی تھیں اور پتا نہیں کیا سنا جو گم صم ہو گئیں۔'' اماں کے استفسار پر کرن نے انہیں بتایا۔ پھر اُس کا کندھا جھنجھوڑ کر بولی۔ ''خدا کے لیے آپی! کوئی بُری خبر ہے تو ہمیں بھی سناؤ تا کہ ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر روئیں۔''

''کوئی بُری خبر نہیں ہے بس میرا دل چاہ رہا ہے رونے کو۔'' اُس نے کہہ کر بازوؤں میں منہ چھپا لیا تو کچھ دیر رُک کر اماں اور کرن اُس کے پاس سے ہٹ گئیں۔ سمجھ گئی تھیں کہ غبار نکلنے کے بعد خود ہی بتائے گی لیکن آنسو تھمنے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ یہ چھپنے والی بات نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کا شوہر کتنا بڑا دہشت گرد تھا اور اب اُسے یہ بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے شروع ہی میں کیوں نہیں اماں اور ابا کو اس کی ساری حقیقت بتا دی۔

دوپہر میں اماں کے بہت اصرار پر اُس نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ پھر اخبار لے کر بیٹھ گئی اور

ابھی اُس کی نظریں مطلوبہ سرخی تلاش کر رہی تھیں کہ کرن اماں کو بتانے لگی۔

''اماں! اللہ نے بڑا کرم کیا ورنہ آج بڑی تباہی مچنے والی تھی۔ پورے دس ہزار لوگوں کے مرنے کا سامان کر رہے تھے دہشت گرد۔ لیکن کسی نے بروقت پولیس کو خبر کر دی اور یہ بھی شکر ہے کہ پولیس نے بروقت اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ ورنہ اپنے ہاں کی پولیس بھی۔'' کرن ساری تفصیل بیان کر رہی تھی اور اُس کی نظریں اخبار پر بھٹکتی رہ گئیں۔

''اللہ غارت کرے ایسے لوگوں کو۔ پیسے کے لیے گھروں کے گھر اُجاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ذرا خدا کا خوف نہیں ہے۔''

اماں شروع ہو گئی تھیں۔ اُس نے اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی۔ اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ مجرم نہیں تھی اور اب اُسے لگ رہا تھا کہ ازہر شیرازی کے جرائم کی پردہ پوشی کے باعث جو ایک مجرمانہ احساس اُسے گھیرے رکھتا تھا، وہ اس سے بھی نکل آئی تھی۔ اور یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اُس کا کوئی عمل پسندیدگی کی سند حاصل کر کے اُسے جس مقصد سے ازہر شیرازی کی زندگی میں لے گیا تھا وہ یہی تھا کہ اُس کی وجہ سے آج کتنی عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہونے سے بچ گئے تھے۔

''اور ازہر شیرازی! میں تم سے غداری ضرور کروں گی۔'' اُس نے خود سے عہد کیا تھا اور اس عہد کو نبھا کر اب اُس کے اندر کوئی ملال نہیں تھا۔

''شامہ بیٹی!'' اماں نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تشویش سے پکارا۔ تو اُس نے فوراً گھٹنوں سے سر اُٹھایا اور مسکرا کر بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اماں۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔''

''کیسے پریشان نہیں ہوں، اتنا روئی ہو تم اور اب چپ چاپ بیٹھی ہو۔ بتاؤ بیٹی کیا بات ہے ازہر تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟''

''ازہر! ارے اماں یاد آیا ازہر نے ایک کام کہا تھا۔ مجھے ابھی جانا ہو گا۔'' وہ قدرے عجلت کا مظاہرہ کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جانا ہے۔ تمہاری طبیعت۔''

''کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو۔ کرن! ذرا اپنی چادر دینا۔'' وہ یوں ظاہر کرنے لگی جیسے ازہر کا کام نہیں ہوا تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔

''اکیلی جاؤ گی۔''

''پہلے اکیلی نہیں آتی جاتی تھی۔'' اُس نے سرسری انداز میں کہا اور کرن سے چادر لے کر اُوڑھی

پھر اپنا پرس اُٹھاتی ہوئی بولی۔ ''فکر نہیں کیجیے گا اماں! ہوسکتا ہے مجھے دیر ہو جائے ازہر کے پاس۔ میرا مطلب ہے اُن کے آفس جا رہی ہوں۔''

وہ اماں اور کرن کو حیران چھوڑ کر باہر نکل کر آئی تو پہلے اسٹور پر رُک کر احمد کمال کو فون کیا۔ اس کے بعد وہیں سے رکشہ میں بیٹھ گئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ احمد کمال کے کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے دیکھ کر وہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا لیکن فوراً کچھ بول نہیں سکا۔ غالباً اُس کی سرخ آنکھوں سے اپنے آپ میں کٹ گیا تھا۔ اُسے بیٹھنے کا بھی اشارہ کیا۔ اور جب وہ بیٹھ گئی تب اپنی کرسی سنبھالتا ہوا پوچھنے لگا۔

''کیوں ملنا چاہتی ہیں آپ ازہر سے۔ آئی مین کس حیثیت سے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کے لاک اپ میں بند ہوتے ہی کیا میرا اُس سے نکاحی رشتہ ٹوٹ گیا؟'' اُس نے قصداً کچھ تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا۔ تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک منٹ۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گیا۔ پھر کچھ دیر بعد واپس آ کر اُسے چلنے کو کہا تو وہ خاموشی سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل پڑی۔ راہ داری کے اختتام پر ایک کمرے میں داخل ہو کر وہ رُک گیا اور اُسے دوسرے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ لیکن دروازے سے داخل ہوتے ہی اُس کے قدم رُک گئے تھے۔

''تم۔'' ازہر شیرازی کو اُسے دیکھ کر غالباً حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟ اور کیوں آئی ہو؟''

''یہ کہنے کہ بُرائی سے اچھائی تک کا سفر بہت کٹھن سہی لیکن اختتام بہت خوب صورت ہوتا ہے۔'' وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہارا مطلب ہے تمہاری دعائیں مستجاب ہوئیں اور اب اس حوالے سے تم مجھے درس دینے آئی ہو۔''

''نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ابھی میری دعائیں مستجاب کہاں ہوئی ہیں۔ جب ہوں گی تب شاید درس دینے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔'' وہ بہت ضبط سے بولی۔

''بہرحال، تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ایک دو دن کی تو بات ہے پھر میں آ جاؤں گا۔''

ا س کے لاپروائی سے کہنے پر وہ بلاارادہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ تو وہ طنز آمیز تلخی سے بولا۔

''کیوں تم کیا چاہتی ہو کہ میں ساری زندگی کے لیے بند ہو جاؤں۔ ایسا نہیں ہوسکتا شامہ بیگم!

میری رسائی بہت اُوپر تک ہے۔ پھر میں نے کیا کیا ہے۔ کوئی ثبوت ہے کسی کے پاس؟ نہیں تم بھی اگر میرے خلاف گواہی دو گی تو ساتھ ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔''

''بس کرو ازہر! مت دھونس جماؤ مجھ پر۔ میں اب تمہاری یرغمال نہیں ہوں۔'' وہ اچانک پھٹ پڑی۔ ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہاری رسائی کہاں تک ہے اور تم یہاں کتنے دن رہتے ہو۔ میں تمہیں اپنا فیصلہ سنانے آئی ہوں کہ جب تک تم اپنے گزشتہ تمام جرائم کا کفارہ ادا کر کے آئندہ کے لیے تائب نہ ہو جاؤ میرے پاس آنے کا سوچنا بھی مت۔ میں جب تک خود کو کمزور اور بے بس سمجھتی رہی تمہاری قید میں سسکتی رہی لیکن آئندہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں یہ زعم ہے کہ تمہارے آدمی مجھے پاتال میں سے ڈھونڈ نکالیں گے تو یہ بھی سن لو کہ میں کہیں چھپ نہیں رہی، میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہوں گی اور دیکھوں گی میری مرضی کے بغیر کون مجھے وہاں سے لے جاتا ہے۔''

''تم۔'' وہ انتہائی بے یقین تھا۔

''ہاں میں، نفرت کرتی ہوں تم سے...... تمہارے گھناؤنے جرائم سے۔ تم انسانی جانوں سے کھیلنے والے دہشت گرد ہو۔ میں اپنے بچے پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ سمجھے تم۔''

وہ کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو اُس نے جھپٹنے کے انداز میں اُس کی کلائی تھامی پھر اُس کے مقابل کھڑا ہو کر بولا۔

''ایک بار پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔''

''نفرت ہے، نفرت ہے، شدید نفرت۔'' اُس کے لہجے ہی سے نہیں آنکھوں سے بھی نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ ''اب تم یہی کہو گے نا کہ یہ نفرت مجھے بہت مہنگی پڑے گی تو ازہر شیرازی! میں خود کو تمہارے ہر وار کے لیے تیار رکھوں گی۔ بس، یا اور بھی کچھ سننا چاہتے ہو۔''

اُس نے بہت آہستہ سے نفی میں سر ہلایا پھر اُس کی کلائی چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ احمد کمال راہ داری میں ٹہل رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی حوالدار کو کچھ اشارہ کر کے اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں، گو کہ آپ کے ساتھ۔''

''پلیز احمد کمال! مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بیک وقت متضاد کیفیات میں گھری تھی۔

''چلیں۔ میں نے آپ کے لیے چائے۔''

''جی نہیں شکریہ۔'' وہ دوبارہ اُسے ٹوک گئی اور وہیں سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔

رات میں اُس نے اماں، ابا اور سجاد بھائی کے سامنے اپنے تمام حالات کھول کر رکھ دیئے تو کتنی دیر سب ششدہ بیٹھے رہ گئے تھے۔ پھر سجاد بھائی نے بولنے میں پہلی کی۔

''کچھ بھی تھا۔ تمہیں اس کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ اب تو سمجھو، ہم میں سے کسی کی خیر نہیں۔ وہ دو چار دن میں باہر آئے گا تو اس گھر کا نام ونشان ہی مٹا دے گا۔ تم ایس پی کی باتوں میں آ گئیں اور یہاں کا نہیں سوچا۔''

''سوچا تھا اور بہت سوچنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ دس ہزار قیمتی جانوں کو بچانے کے لیے اس گھر کے چھ افراد کی قربانی۔'' اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ پھر گلا صاف کر کے بولی۔ ''ویسے آپ بے فکر رہیں۔ اُسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس ساری کارروائی میں میرا بھی کوئی ہاتھ ہے اور آج جب میں اُس سے ملنے گئی تو اُس نے ایسا کوئی شبہ بھی ظاہر نہیں کیا۔''

''پھر بھی تمہیں۔''

''نہیں سجاد!'' ابا نے سجاد بھائی کو ٹوک دیا۔ ''میری بیٹی نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اگر یہ اپنا اور ہم لوگوں کا سوچتی تو یہ انتہائی خود غرضی ہوتی۔ باقی آگے اللہ مالک ہے۔''

اور اُس کے دل پر اگر کوئی تھوڑا بہت بوجھ تھا تو ابا کی باتوں سے وہ بھی سرک گیا تھا۔

پھر اگلے دو دن صرف وہی نہیں گھر کا ہر فرد ذرا ذرا سی آہٹ پر چونکتا رہا تھا۔ باہر کوئی گاڑی گزرتی تو اماں کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا جاتا۔ کرن پریشان ہو کر اُسے دیکھتی اور وہ نظریں چرا جاتی۔ غالباً سب کے اندر خوف تھا۔ جیسے وہ کلاشنکوف لے کر آئے گا اور سب کو لائن سے کھڑا کر کے اُڑا دے گا۔ عجیب وحشت اور دہشت سی پھیلی ہوئی تھی۔ تیسرے دن صبح کی نماز کے بعد وہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی حسب سابق دھیرے دھیرے پھیلتے اُجالے میں اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی کہ ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے خلاف عادت اُسے پکارا تھا۔

''جی ابا!'' اُس نے چونک کر دیکھا اور اُٹھنے لگی تھی کہ ابا بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس کے پاس آئے اور اخبار اُسے تھما کر بولے۔

''لو اخبار دیکھو۔''

''کوئی خاص خبر؟'' جانے کیوں اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

''ازہر نے خود سے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اب تو سمجھو وہ۔'' ابا پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ اُس نے صرف پہلی بات سنی تھی۔ اُس کے بعد سماعتوں میں اُس کی آواز گونجنے لگی تھی۔

''پولیس بھی مجھ سے کوئی وی آئی پی کا سلوک تو نہیں کرے گی، اگر پھانسی پر نہیں لٹکایا تب بھی ساری زندگی کے لیے کال کوٹھڑی میں ضرور ڈال دے گی۔''

''ایک بار پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔''

''نفرت ہے، نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ اب تم یہی کہو گے نا کہ یہ نفرت مجھے بہت مہنگی پڑے گی تو ازہر شیرازی میں خود کو تمہارے ہر وار کے لیے تیار رکھوں گی۔''

''خوب وار کرتے ہو تم کہ میں رو سکتی ہوں نہ خوش ہو سکتی ہوں۔'' پورا دن چڑھتے ہی وہ ایک بار پھر اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

''کیوں، خوش کیوں نہیں ہو سکتیں۔ یہی تو چاہتی تھیں تم۔'' ازہر شیرازی کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ ''پھر تم آزردہ کیوں ہو رہی ہو؟ اب تو واقعی میں تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تم آزاد بھی ہو گئی ہو۔''

''آزاد۔'' وہ دُکھ سے ذرا سا ہنسی اور کتنی دیر نفی میں سر ہلانے کے بعد ایسے ہی دُکھ سے کہنے لگی۔ ''پچاس سال پہلے یہ ملک آزاد ہوا تھا تو دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اس کا نام آ گیا لیکن یہاں کوئی بھی آزاد نہیں ہے۔ مٹھی بھر لوگوں نے پوری قوم کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ ہم سب یرغمالی ہیں اور احتجاج تک کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ ہم سب غافل ہیں اور جو غافل ہوتا ہے وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ یہ بات مجھے میری دادی نے بتائی تھی۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ اُس وقت اُن کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور جانتے ہو میں کب سمجھی۔''

وہ حیران ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا اور اسی عالم میں نفی میں سر ہلا دیا۔

''اُس روز جب تم نے طوطا پکڑا تھا۔ دادی کہتی تھیں جو پرندے اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں وہ قید کر لیے جاتے ہیں اور اپنی غفلت کی سزا کاٹنے کے بعد ہی دوبارہ انہیں آزاد فضاؤں میں اُڑنا نصیب ہوتا ہے۔ اُس وقت تم مجھے اپنے گھر میں مقید کر چکے تھے اور طوطے کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ میری اپنی غفلت کی سزا ہے۔ اس کے بعد تم نے دیکھا ہی کہ میں کس طرح غفلت کے اندھیروں سے نکلنے لگی تھی۔ پھر طوطے کی طرح پنجرے سے بھی نکل آئی۔ لیکن میرے اندر آزادی کا احساس پھر بھی نہیں ہے کیونکہ میں ہر شخص کو آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ پنجرے میں بند سہمے ہوئے پرندے مجھے کبھی اچھے نہیں لگے۔''

''بس کرو۔'' ازہر نے دھیرے سے اُس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''اتنے دُکھ مت پالو۔ زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا جب کہ اپنے بچے کے لیے تمہیں صرف ماں ہی نہیں باپ بھی بننا ہے۔''

''نہیں، میں صرف ماں بنوں گی۔'' اُس کی آنکھیں یک بارگی پانیوں سے بھر گئیں۔ ''اور اپنے

بچے کے ساتھ اُس کے باپ کا انتظار کروں گی۔ جس کے لیے میں نے ہمیشہ اچھا سوچا، اچھا چاہا اور میری ساری دعائیں بھی اُس کے لیے تھیں جو آج قبولیت کی سند حاصل کر کے اُس کے لیے آزمائش ضرور بن گئی ہیں لیکن میں جانتی ہوں اس طویل کٹھن سفر کا اختتام بہت خوب صورت ہوگا۔"

ازہر شیرازی بہت خاموشی سے اُسے دیکھے گیا جو اُس روز نفرت کا اظہار کر کے اُس سے اپنے جرائم کا اعتراف کروا گئی تھی اور اب محبت کا احساس دے کر اپنی پلکوں پر انتظار کے دیپ یوں جلا رہی تھی کہ طویل کٹھن سفر کے بعد اختتام پر اُسے بھی منزل بہت خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔